چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
نومبر 2012

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کتاب مارکیٹ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

☆ اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ہدایت کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، اور اگر میت کی وارث صرف لڑکیاں ہی ہوں یعنی دو یا دو سے زیادہ تو کل ترکے میں ان کی دو تہائی دیا جائے اور اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصہ نصف۔ اور میت کے والدین کا یعنی دونوں میں سے ہر ایک کا ترکے میں چھٹا حصہ، بشرطیکہ میت کے اولاد ہو۔ اور اگر اولاد نہ ہو اور صرف والدین ہی اسکے وارث ہوں تو ایک تہائی ماں کا حصہ اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ۔ یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جبکہ وصیت جو میت نے کی ہو، پوری کردی جائے اور قرض جو اس پر ہو، ادا کردیا جائے تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے والدین اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کردیئے ہیں اور اللہ یقیناً سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو، اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا، اگر وہ بے اولاد نہ ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکے کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جبکہ وصیت جو انہوں نے کی ہو، پوری کردی جائے، اور قرض جو انہوں نے چھوڑا ہو، ادا کردیا جائے۔ اور وہ تمہارے ترکے میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی، اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا، بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو، وہ پوری کردی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو، وہ ادا کردیا جائے۔ اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل میراث کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے، جبکہ وصیت جو کی گئی ہو، پوری کردی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو، ادا کردیا جائے بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا اور نہایت علم والا ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 11 سے 12)

☆ اے پیغمبر لوگ تم سے کلالہ کے بارے میں حکم دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ اللہ کلالہ کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی ایسا مرد مر جائے جس کے اولاد نہ ہو اور نہ ماں باپ اور اس کے بہن ہو تو اس کو بھائی کے ترکے میں سے آدھا حصہ ملے گا اور اگر بہن مر جائے اور اس کے اولاد نہ ہو تو اس کے تمام مال کا وارث بھائی ہوگا اور اگر مرنے والے بھائی کی دو بہنیں ہوں تو دونوں کو بھائی کے ترکے میں سے دو تہائی اور اگر بھائی اور بہن یعنی مرد اور عورتیں ملے جلے وارث ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے یہ احکام اللہ تم سے اس لئے بیان فرماتا ہے کہ بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 176)

☆ تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ جانے والا ہو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کر جائے۔ اللہ سے ڈرنے والوں پر یہ ایک حق ہے جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے تو اس کے بدلے کا گناہ انہیں لوگوں پر ہے جو اس کو بدلیں اور بے شک اللہ سنتا جانتا ہے اگر کسی کو وصیت کرنے کی طرف سے کسی وارث کی طرف داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو اگر وہ وصیت کو بدل کر وارثوں میں صلح کرادے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بے شک بخشنے والا اور رحم والا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 180 سے 181)

☆ اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے حق میں وصیت کر جائیں کہ ان کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔ ہاں اگر وہ خود گھر سے چلی جائیں اور اپنے حق میں پسندیدہ کام یعنی نکاح کریں تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 240)

☆ مومنوں! جب تم میں سے کسی کی موت آموجود ہو تو شہادت کا نصاب یہ ہے کہ وصیت کے وقت تم مسلمانوں میں سے دو مرد عادل یعنی صاحب اعتبار گواہ ہوں یا اگر مسلمان نہ ملیں اور تم سفر کر رہے ہو اور اس وقت تم پر موت کی مصیبت واقع ہو تو کسی دوسرے مذہب کے دو شخصوں کو گواہ کرلو اگر تم کو ان گواہوں کی نسبت کچھ شک ہو تو ان کو عصر کی نماز کے بعد کھڑا کرو اور دونوں اللہ کی قسمیں کھائیں کہ ہم شہادت کا کچھ عوض نہیں لیں گے۔ گو ہمارا رشتہ دار ہی ہو۔ اور نہ ہم اللہ کی شہادت کو چھپائیں گے اگر ایسا کریں گے تو گنہگار ہوں گے پھر اگر معلوم ہو جائے کہ ان دونوں نے جھوٹ بول کر گناہ حاصل کیا ہے تو جن لوگوں کا انہوں نے حق مارنا چاہا تھا ان میں سے ان کی جگہ اور دو گواہ کھڑے ہوں جو میت سے قریبی رشتہ قرابت رکھتے ہوں پھر وہ اللہ کی قسمیں کھائیں کہ ہماری شہادت ان کی شہادت سے بہت سچی ہے اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی ایسا کیا ہو تو ہم بے انصاف ہیں اس طریق سے بہت قریب ہے کہ یہ لوگ صحیح صحیح شہادت دیں یا اس بات سے خوف کریں کہ ہماری قسمیں ان کی قسموں کے بعد رد کردی جائیں گی۔ اور اللہ سے ڈرو اور اس کے حکموں کو گوش ہوش سے سنو اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 106 سے 108)

☆ اے محمد ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور ان سے پچھلے نبیوں کی طرف بھیجی تھی۔ (سورۃ نساء 4 آیت 163)

☆ اور ہم نے تم سے پہلے مردوں ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا جن کی طرف ہم وحی بھیجا کرتے تھے اگر تم لوگ نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ (سورۃ نحل 16 آیت 43)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

نوشین خان کراچی سے، السلام علیکم ڈر کا تازہ شمارہ کالج سے گھر جاتے ہوئے بک اسٹال سے خریدا، سرورق اچھا لگا۔ اس بار سالگرہ نمبر تھا اور میری امید کے عین مطابق ڈر ڈائجسٹ کے صفحات تعداد میں بہت زیادہ تھے البتہ قیمت انتہائی مناسب تھی۔ ڈر ڈائجسٹ پر کی گئی محنت اور معیار کی تعریف کرنا ایسا ہے کہ جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ میری طرف سے سب کو سالگرہ مبارک ہو، خاص کر ادارے کو تو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد قبول ہو۔ کہانیوں کا مطالعہ کیا تو سب سے پہلے داری پڑھی۔ اچھی کہانی تھی۔ مگر جذباتی مناظر سے پر تھی۔ اعداد کا رقص اچھی کہانی تھی پڑھ کر مزہ آیا۔ رولو کا سفر کامیابی کے ساتھ جاری وساری ہے اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ سنچری کی طرف اقساط کی پیش قدمی جاری ہے۔ جھوٹی کہانی بہت اچھی مزے دار کہانی تھی۔ عثمان علی اچھا لکھتے ہیں۔ ایم اے راحت کی کہانی پسند آئی۔ دلہن ذرہ بھی اچھی نہیں لگی۔ انتقام اور انجام عبرت اچھی کہانیاں تھیں۔ ادھورا سفر نقل شدہ تحریر ہے۔ اشعار کا ذوق اچھا لگا۔ غزلیں تقریباً اچھی تھیں۔ سب سے آخر میں خطوط کا مطالعہ کیا اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔

☆☆ نوشین صاحبہ: قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف اور تنقید اچھی لگی، امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی اپنی خوشی کا اظہار ضرور کریں گی۔

حمیرا رضوان نوابشاہ سے، امید ہے ڈر کا پورا عملہ بخیریت ہوگا۔ میں حمیرا رضوان، امید ہے پہچان لیا ہوگا، وہی حمیرا جو پچھلے کئی سالوں سے ''حمیرا اعلام حسین کیریو'' کے نام سے ڈر کی محفل میں حاضر ہوتی تھی۔ سوری مصروفیت کی وجہ سے شادی میں آپ کو انفارم کرنا بھول گئی اور اچانک سے ایک سال تک ڈر کی محفل سے غائب رہی۔ مگر پھر آپ کا پیغام ملا سن کر بہت اچھا لگا۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ ڈر مجھے بھول چکا ہے مگر یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ڈر مجھے ابھی تک یاد رکھے ہوئے ہے۔ انشاء اللہ اگلی مرتبہ میرے خط کے ساتھ ایک عدد کہانی بھی ہوگی، تمام رائٹرز اچھا لکھ رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ڈر اسی طرح ترقی کی منازل طے کرے انشاء اللہ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

☆☆ حمیرا صاحبہ: ایک مرتبہ پھر ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، شادی کی خوشیاں اور نیا جیون کا سفر بہت بہت مبارک ہو، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیوں سے نوازے، حسب وعدہ اب کہانی کا شدت سے انتظار ہے، امید ہے آپ اپنا وعدہ......

انوری رمضان پنڈدادنخان سے، ڈر کے پورے اسٹاف اور تمام رائٹر حضرات کو میرا سلام، اور ڈر کی سالگرہ کی بہت بہت مبارکباد، ستمبر کے ڈر میں آپ سب کو میری تحریر بچی پکار بہت پسند آئی ہوگی۔ اس کے علاوہ ''اداس آنکھیں'' ''پراسرار رات'' ''چھپکلی'' مجھے بہت پسند آئی۔ سنہری تابوت اچھی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کہانیاں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ ایم الیاس اپنی کہانی پر نظر ثانی کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اپنی کہانی بچی پکار کے بعد اب نئی کہانی میں مصروف ہوں اور بہت جلد ارسال کردوں گی۔ ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے شب وروز دعا گو ہوں

☆☆ انوری صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، آپ کی نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے، امید ہے مثبت جواب ضرور ارسال کریں گی۔

زاہدہ عطا محمد کراچی سے، السلام علیکم امید کرتی ہوں کہ ڈر کا پورا اسٹاف خیر وعافیت سے ہوگا، سب سے پہلے ڈر کو سالگرہ بہت مبارک ہو، کئی ماہ بعد شرکت کے لئے معذرت چاہتی ہوں۔ سب سے پہلے ''سنہری تابوت'' پڑھی جسے پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ بقیہ کہانیوں میں سے مجھے جو کہانیاں پسند آئیں وہ درج ذیل ہیں۔ داری، بدروح کا انتقام، بھول بھلیاں، دلہن اور باقی کہانیاں بھی اپنی جگہ اچھی تھیں۔ اچھا اب اجازت چاہتی ہوں، اگلے ماہ پھر اپنے خط کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

☆☆ زاہدہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانیوں کی پسند اور خط کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کیجئے، امید ہے آپ آئندہ بھی ڈر کے لئے تھوڑا وقت ضرور نکال لیا کریں گی۔

عاصمہ رمضان پنڈدادنخان سے، السلام علیکم، اکتوبر 2012ء کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر دل خوشی سے جھومنے لگا، ڈر کی تمام کہانیاں بہت زبردست ہوتی ہیں، افشاں رمضان، انوری رمضان، ایس حبیب خان، سجاد حسین تومی، صبا رمضان اور ایم اے راحت کی

کہانیوں نے مجھے ڈر میں کہانی لکھنے پر مجبور کردیا۔ ویل ڈن رائٹر حضرات۔ ڈر کو بہت بہت سالگرہ مبارک، اللہ تعالیٰ ڈر کو اور ترقی دے اور ڈر دی ورلڈ ٹاپ ڈائجسٹ کی لسٹ میں شامل ہوجائے۔ (آمین) ایک درخواست کرنی ہے کہ ڈر میں ایک ایسا سلسلہ بھی شامل کیا جائے جس میں مختصر مختصر چھوٹی کہانیاں اور واقعات شامل ہوں۔ کیوں کہ نئے رائٹرز بڑی کہانی نہیں لکھ سکتے۔ پر وہ چھوٹے چھوٹے واقعات لکھ کر ڈر میں شامل ہوسکتے ہیں۔ اب اجازت چاہوں گی۔ اللہ حافظ۔

☆☆ عاصمہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کی درخواست نوٹ کرلی گئی ہے اور بہت جلد آپ کی خواہش کا احترام کیا جائے گا۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی ڈر کو یاد کرنا بھولیں گی نہیں اور خط ضرور لکھیں گی۔

سنبل ماہین طٰہٰ سرگودھا سے، ڈر کی محفل میں یہ میرا پہلا خط ہے ڈر کو میں نے جون کے مہینے سے پڑھنا شروع کیا جب میں نے ڈر میں ناگ نقش اور رقص موت کہانیاں پڑھیں تو میں ڈر سے بہت متاثر ہوئی اور اب باقاعدگی سے ڈر پڑھنا شروع کردیا ہے۔

☆☆ سنبل صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کو ڈر کی کہانیاں پسند آئیں، اس کے لئے ویری ویری تھینکس، آئندہ ماہ بھی پلیز ڈر کو بھولنا نہیں خط لکھنا۔

شائستہ سحر راولپنڈی سے، السلام علیکم، امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے، بہت زیادہ معذرت چاہتی ہوں خط بہت لیٹ ارسال کررہی ہوں، خط کی ابتدا میں میری طرف سے ادارہ ڈر ڈائجسٹ کے تمام اسٹاف کو ڈر ڈائجسٹ کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ اس موقع پر میری دلی دعا ہے کہ خدا ڈر ڈائجسٹ کو زیادہ سے زیادہ کامیابی اور ترقی سے نوازے (آمین) ڈر ڈائجسٹ میں جتنی عزت اور اپنائیت مجھے ملی ہے اس کے جواب میں میرے شکریہ کے الفاظ بہت معمولی ہیں۔ میں ان دنوں بہت مصروف رہی اور اب B,ed کے ایگزامز بھی 17 اکتوبر سے شروع ہوجائیں گے۔ اپنی نئی کہانی ایگزامز سے فارغ ہوتے ہی بھیجوں گی۔ انشاء اللہ کوشش کروں گی ریگولر لکھوں۔ بہت جلد نئی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ اب اجازت دیں۔

☆☆ شائستہ صاحبہ: ہر رائٹر کا اپنا ایک حلقہ ہوتا ہے لہٰذا اپنے رائٹر کی کہانی شمارے میں نہ دیکھ کر افسردہ ہوجاتے ہیں۔ خیر نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھے نمبروں سے کامیاب کرے اور زندگی کے ہر جائز مقصد میں کامیاب وکامران کرے۔

عروج سرگودھا سے، السلام علیکم! ڈر میں یہ میرا پہلا خط ہے وہ بھی اس لئے کہ ڈر کی کہانیوں نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کردیا۔ انوری رمضان کی کہانی بچی پکار نے دل ودماغ پر بہت اچھا تاثر قائم کیا۔ رائٹر حضرات سے بھی درخواست ہے کہ اس طرح اپنے مذہب کا پرچار کریں اور سبق آموز کہانیاں لکھیں۔ مجھے ایک بات پوچھنی تھی وہ یہ کہ صبا رمضان، افشاں رمضان، انوری رمضان اور سجاد حسین کا کوئی ریلیشن ہے، آپس میں؟

☆☆ عروج صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم: انوری کی بچی پکار واقعی بہت اچھی کہانی تھی، آپ نے جن کا پوچھا ہے رشتہ کے متعلق تو ان کا آپس میں قلبی رشتہ ہے۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

ایس حبیب خان کراچی سے، امید ہے ڈر کی پوری ٹیم اور اس کے چاہنے والے خیریت سے ہوں گے، ستمبر کے شمارے میں ان اقبال عظمی کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ (آمین) ''سالگرہ نمبر'' نہایت شاندار لگا۔ مینجنگ ایڈیٹر صاحب کے قلم سے اٹھائے گئے سوال حرف بہ حرف درست ہیں اور اس کی گونج ہر جگہ میں ہے۔ خطوط کی محفل میں تعریف وتنقید سے بھرپور خطوط پڑھ کر مزہ آیا اس بار سالگرہ نمبر میں تمام رائٹرز نے بھرپور طریقے سے قلم کے جوہر دکھائے۔ ایس امتیاز احمد کی ''زندہ لاشیں'' حسب توقع بہترین تھیں، محمد عثمان علی کی ''جھوٹی کہانی'' اور رضوان قیوم کی ''مافوق الفطرت'' دلچسپ اینڈ لئے اچھی تحریریں تھیں، افشاں رمضان کی ''طوفان'' شاندار تحریر تھی آخر تک تجسس سر پر سوار رہا، شائستہ کی ''خونی کھیل'' دل چھو جانے والی تحریر تھی۔ اور سب سے زیادہ جو تحریر پسند آئی وہ تھی ''داری'' ناصر محمود فرہاد نے کیا خواب اپنے قلم سے جگایا۔ ویلڈن! آخر میں ایک بار پھر ڈر کی سالگرہ مبارک ہو، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو مزید کامیابیاں عطا کرے۔ (آمین)

☆☆ ایس صاحب: ہر ماہ ریگولر رائٹر حضرات کی کہانی کا قارئین بمعہ ادارہ شدت سے انتظار کرتے ہیں۔ امید ہے آپ بغور جائزہ لیں آئندہ پھر آپ کی کہانی کا بہت شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks۔

شگفتہ حسین کراچی سے، امید ہے کہ ڈر کا پورا اسٹاف بخیر و عافیت ہوگا۔ اس ماہ کا ڈر کھولا۔ تو بہت دکھ ہوا، اپنا خط نہ پا کر میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ میر خط کیوں نہیں شائع کیا۔ ضرور بتایئے گا۔ سالگرہ نمبر بہت ہی لاجواب تھا ہر کہانی بہترین تھی۔ کہانیوں میں مافوق الفطرت، جھوٹی کہانی، داری، بھول بھلیاں، اعداد کا رقص، غلطی، زندہ لاشیں، ادھورا سفر، آتما کی خواہش، یہ سب کہانیاں اچھی تھیں۔ اور ہاں ایک بات تو میں بھول ہی گئی ڈر کو بہت بہت سالگرہ مبارک ہو، اب امید کرتی کہ اگلے ماہ کے ڈر میں اپنا خط ضرور دیکھوں گی۔

☆☆ شگفتہ صاحبہ: آپ کا خط موصول نہیں ہوا، اور آپ کو دلی دکھ ہوا اس کے لئے معذرت، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی شرف ملاقات بذریعہ خط کے لئے ویری ویری تھینکس۔

آستر کراچی سے، اکتوبر کا ڈر ڈائجسٹ پڑھا، بہت خوشی ہوئی، ڈر کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، میرا خط لکھنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ ڈر ڈائجسٹ میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور چھوٹے واقعات کا سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ نئے رائٹر بھی اس میں شامل ہوسکیں، ان دنوں میری طبیعت سخت ناساز ہے۔

☆☆ آستر صاحبہ: سب سے پہلے تو ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت یاب کرے، چھوٹی کہانیوں اور واقعات کا سلسلہ بہت جلد شروع ہوجائے گا۔ آپ کی کہانی کا انتظار ہے۔

صدف حسین کراچی سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں ڈر کا پورا اسٹاف خیر خیریت سے ہوگا۔ اس بار کا ٹائٹل مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ لیکن کہانیاں زبردست تھیں۔ سب سے پہلے قسط وار پڑھیں۔ "سنہری تابوت" زبردست ...... بلیک ٹائیگر بالکل بورنگ۔ دوسری کہانیوں میں نمبرون پر "داری" بہت ہی انٹریسٹنگ تھی۔ آخر میں ڈر کے لئے ڈھیروں دعائیں۔

☆☆ صدف صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ آپ کا پیغام ایم الیاس صاحب تک پہنچا دیا گیا ہے۔ امید ہے آئندہ اپنی طرز تحریر پر ضرور نظر ثانی کریں گے۔ لیکن ہاں آئندہ ماہ بھی خط لکھنا بھولئے گا نہیں۔

کائنات بلوچ کراچی سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں ڈر کا پورا اسٹاف خیر و عافیت سے ہوگا، میری طرف سے ڈر کو سالگرہ بہت مبارک ہو۔ کئی ماہ میں نے ڈر کی محفل میں شرکت نہیں کی، اس کے لئے معذرت چاہتی ہوں، لیکن اب تو آ گئی ہوں ناں No Tension سب سے پہلے "قرآن کی باتیں پڑھیں جنہیں پڑھ کر دل و دماغ روشن ہوگیا۔ اب مجھے اجازت دیجئے اگلے ماہ پھر ملیں گے اور ڈر کے پورے اسٹاف کے لئے میری طرف سے لاکھوں کروڑوں دعائیں (آمین)

☆☆ کائنات صاحبہ: معذرت قبول اور نو ٹینشن کیونکہ اب حسب وعدہ ہر ماہ حاضری دیتی رہیں گی، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ خط کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کیجئے۔

فاریہ تبسم ٹھینگ موڑ قصور سے، ڈر کے تمام اسٹاف کو میری طرف سے بہت بہت اور بہت زیادہ سلام ہو، سب کو ڈر کی سالگرہ مبارک ہو۔ سب سے پہلے خطوط پر نظر ڈالی، اپنا مکمل خط بغیر کٹنگ کے دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ خطوط میں کچھ نیا نیا محسوس تھا۔ کہانیوں میں رولو کا بیسٹ تھی۔ ادھورا سفر، بھول بھلیاں اور طوفان بہت منفرد کہانیاں تھیں، سنہری تابوت زیر مطالعہ ہے۔ ٹائیگر بیسٹ آف دی منتھ تھی۔

☆☆ فاریہ صاحبہ: قلبی لگاؤ سے ڈر کی کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، انسان دعاؤں کا ہمیشہ طالب رہتا ہے، آئندہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

افشاں رمضان سرگودھا سے، اکتوبر کا سالگرہ نمبر پڑھ کر دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا، ڈر ڈائجسٹ کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، اب آتے ہیں، اکتوبر کے ڈر کی طرف تمام کہانیاں زبردست تھیں پر "سچی پکار" سچ میں ہمارے رب کی طرف سچی پکار بن گئی امید ہے ہر مسلمان کو اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہونا چاہئے اور مذہب سے قلبی لگاؤ بھی ہونا چاہئے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ کراچی میں ہونے والے حادثے کے لئے ہم کچھ نہیں کرسکے۔ لیکن میں سب سے اپیل کرتی ہوں کہ پلیز! ایک بار درود شریف پڑھ کر ہم لوگ ان انسانوں کے لئے مغفرت کی دعا کریں جو کراچی حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ میں اپنی ایک اور تحریر بھیج رہی ہوں پلیز شائع کردیجئے گا۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ حافظ۔

☆☆ افشاں صاحبہ: آپ کی کہانی طوفان نے بھی لوگوں کے دلوں پر بہت اچھا تاثر چھوڑا ہے، دوسری کہانی حنوط ابھی پڑھی نہیں، مگر امید ہے کہ اچھی ہوگی۔ ہر شمارے میں نرم گرم کہانیاں ہوتی ہیں۔ آئندہ ماہ کے لئے بھی شکریہ۔

عمران قریشی کوئٹہ سے، سلام مسنون، بعد از خیریت سب سے پہلے ڈر ڈائجسٹ کے ادارے، تمام قارئین اور لکھاریوں کو میری جانب سے عید مبارک اور چودہ اگست کی خوشیاں مبارک ہوں، علاوہ ازیں ادارے کو ڈر ڈائجسٹ کی سالگرہ بھی مبارک ہو، سالگرہ نمبر کے لئے تحریر "گمشدہ" ارسال کررہا ہوں۔ پتا نہیں وقت پر پہنچتی ہے یا نہیں۔ بھیجنے میں تاخیر ہوگئی ہے۔ بہرحال امید کرتا ہوں۔ آپ کو پسند آئے گی۔ ادارے نے میری تحریر "ہمزاد" کو نوازا۔ دلی مشکور ہوں۔ اور ایڈیٹر صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگست کے شمارے میں عبدالحمید ساگر صاحب کا خط پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے ملاقات کی درخواست کی۔ لیکن اپنا ایڈریس نہیں بتایا۔ یوں ملاقات تو نہیں ہوسکی۔ اس لئے میری جانب سے انہیں خصوصی طور پر عید مبارک قبول ہو۔ اجازت دیجئے۔

☆☆ عمران صاحب: سب سے اہم بات کہ پلیز! اپنا Cell فوراً ارسال کریں تاکہ آپ کا نمبر عبدالحمید ساگر کو دیا جاسکے۔ کہانی لیٹ موصول ہوئی لہٰذا سالگرہ نمبر کے بجائے اب حاضر خدمت ہے اور دوسری کا شدت سے انتظار۔ Thanks۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم، ماہ رواں کا ڈر ڈائجسٹ ہمارے سامنے ہے، دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے ٹاپ پر جارہے ہیں۔ سالگرہ نمبر کا جواب نہیں۔ اے وحید کی "رولوکا" بڑے خوبصورت انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ایم اے راحت کی "سنہری تابوت" تحیر انگیزی لئے ہوئے پانچویں قسط میں داخل ہوئی ہے۔ ایم الیاس صاحب کی حیرت میں ڈال دینے والی "بلیک ٹائیگر" بہت عمدہ جارہی ہے۔ الیاس صاحب جیسے لوگ ہمارا سرمایہ افتخار ہیں۔ دیگر اسٹوریز کا انتخاب لاجواب رہا۔

☆☆ امتیاز صاحب: شمارے میں کمرے کا آسیب حاضر ہے۔ آپ کی محبت ڈر ڈائجسٹ سے قابل قدر ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند اور خوش و خرم رکھے تاکہ ہر ماہ ڈر ڈائجسٹ میں آپ کے قلبی لگاؤ کا اظہار ہوتا رہے۔

قدیر رانا راولپنڈی سے، آپ کی خیریت کا طالب ہوں، غزل کی اشاعت پر مشکور ہوں، دو غزلیں ارسال کررہا ہوں، کسی بھی آنے والی اشاعت میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں، ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ قدیر صاحب: غزل شامل اشاعت ہے۔ آپ جس خلوص سے ہر ماہ غزل ارسال کرتے ہیں اس کے لئے ادارہ بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہے۔

محمد وارث آصف واں بھچراں میانوالی سے، سب سے پہلے تو میں تمام عہدیداران اور اسٹاف ممبران، ڈر کے ڈسٹری بیوٹرز، پرنٹرز، ہاکرز اور خاص کر اس کے چاہنے والوں کو ڈر ڈائجسٹ کی سالگرہ کی مبارکباد دینا چاہوں گا۔ یقیناً ان تمام افراد کے لئے لفظ "مبارک" بہت ہی معمولی ہے اور ان کی ڈائجسٹ سے محنت و لگن غیر معمولی ...... بہرحال ایک دفعہ پھر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد قبول ہو۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ترقی دے۔ آمین۔ سالگرہ کا خاص نمبر اس بار ستائیس ستمبر کو ملا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے داری کا مطالعہ کیا...... کہانی تو جاندار تھی مگر اس میں جذباتی مناظر زیادہ تھے۔ غلطی بور کہانی تھی، مافوق الفطرت گزارہ ٹائپ تھی۔ اعداد کا رقص بہترین کہانی تھی۔ رولوکا اے ون پلس اور دلچسپ سنسنی خیز، جھوٹی کہانی اک زبردست تحریر رہی۔ آتما کی خواہش بس ٹھیک تھی، زندہ لاشیں پر تجسس اور بھیانک تحریر تھی پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ صبا رمضان اور افشاں رمضان آپ کی تحریروں میں وہ دم نہیں جو کبھی پہلے ہوا کرتا تھا۔ تھوڑی تبدیلی لائیں اور اسی سوچ اور انداز سے تحریر لکھیں۔

☆☆ وارث صاحب: آپ نے اپنے دل کی ساری بات کہہ دی۔ امید ہے رائٹر حضرات ضرور غور فرمائیں گے۔ قلبی لگاؤ سے لکھی گئی آپ کی تحریر کا آئندہ ماہ بھی بہت بہت انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

حبیب الرحمن گوجرہ سے، السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ ادارہ کے تمام افراد اور قارئین، مصنفین خیریت سے ہوں گے۔ اس دفعہ رسالہ تھوڑا لیٹ ملا پھر بھی خط اور اس کے ساتھ غزل کہانی جس کا عنوان کنوئیں کے شیطان اور شعر قوس قزح کے لئے لکھ بھیج رہا ہوں، امید ہے آپ میری کہانی کنوئیں کے شیطان کو ڈر میں ضرور جگہ دیں گے امید ہے ضرور حوصلہ افزائی ملے گی، شکریہ۔ ستمبر کے ڈائجسٹ میں خط اور غزل بھی دیکھی تو امید سی ہوگئی کہ کہانی ضرور چھپے گی۔

☆☆ حبیب الرحمٰن صاحب: گھبرائیں نہیں کنوئیں کا شیطان اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ ہر تحریر الگ الگ کاغذ پر لکھا کریں۔ پھر

شکایت نہیں ہوگی۔امید ہے آئندہ ماہ بھی آپ ضرور خط لکھیں گے۔

بشیر احمد بھٹی فوجی بستی بہاولپور سے،اکتوبر 2012ء کا ڈر سالگرہ نمبر 24 ستمبر کو خریدا،اس دفعہ شمارہ واقعی سالگرہ نمبر ہے۔کافی کہانیاں ہیں اور منفرد انداز میں لکھی گئی ہیں۔آپ نے قیمت بڑھادی ہے۔اب ہر ماہ ڈر کی قیمت 60 روپے رہے گی؟ ساٹھ روپے معقول قیمت ہے۔قارئین پر کوئی زیادہ بوجھ نہیں۔رولوکا قسط نمبر 89 بلیک ٹائیگر کی قسط نمبر 4 تجسس سے بھرپور رہیں۔ مافوق الفطرت،اعداد کا رقص،خاموشی،انجام عبرت،ادھورا سفر،خونی کھیل،آتما کی خواہش،پراسرار سائے،طوفان،زندہ لاشیں، بھول بھلیاں،بدروح کا انتقام،بدروح،یہ تمام کہانیاں اس شمارے کے شایان شان رہیں۔

☆☆ بشیر صاحب:عنقریب اسلامی کہانیوں کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔آپ کا نوازش نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوتی ہے۔امید ہے آئندہ ماہ بھی اس خوشی سے محروم نہ رکھیں گے۔

محمد بشیر احمد پرواز جنڈانوالہ بھکر سے،21 تاریخ سے انتظار کرتے کرتے آخر 28 تاریخ کو ڈر مل گیا سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں اور دل کو سکون ملا،پھر آئے خطوط کی طرف سب دوستوں کی رائے سے آگاہی ہوئی اور اپنا خط نہ دیکھ کر دکھ۔شاعروں کا کلام بھی عمدہ تھا۔کہانیوں کی دنیا میں اے وحید کی رولوکا،ایم اے راحت کی سنہری تابوت چھائی ہوئی تھی۔ناصر محمود کی داری بھی بہت اچھی تھی۔ایم الیاس کی بلیک ٹائیگر بھی سسپنس میں ڈوبی ہوئی تھی۔میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو دن دگنی رات چگنی ترقی دے۔

☆☆ بشیر صاحب:خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ۔ہر تحریر الگ الگ کاغذ پر ارسال کیا کریں۔کیونکہ ہر تحریر الگ الگ حصوں میں کمپوز ہوتی ہے۔پچھلے ماہ آپ کا خط نہیں ملا تھا۔

محمد آصف شهزاد الہ آباد ٹھینگ موڑ سے،السلام علیکم،امید ہے کہ مزاج بخیریت ہوں گے،ڈر کا اکتوبر 20120ء کا شمارہ 23 ستمبر کو بھی شہزاد بکسٹال سے مل گیا تھا۔کہانیوں میں غلطی،اعداد کا رقص،رولوکا،زندہ لاشیں،دلہن،انتقام،انجام عبرت،ادھورا سفر،انوکھی کتھا،غزلوں میں حکیم خان حکیم،ظریف احسن،فائزہ،چوہدری قمر علی جہاں پوری،منیر احمد ساغر،ساجدہ راجا،احسان سحر، غزالہ تبسم،کشور عمران،فریدہ خانم،نوشین خان،اقصیٰ رباب کے کلام اچھے لگے۔داری ابھی نہیں پڑھی،امید ہے کہ اچھی ہوگی،میری غزلوں کو شائع کرنے پر میں آپ کا اور ادارہ ڈر ڈائجسٹ کا ازحد شکر گزار ہوں۔

☆☆ آصف صاحب:خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس،امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی خط بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

راجہ باسط مظہر حامد جھنگی سے،السلام علیکم!امید کرتا ہوں،ڈر ڈائجسٹ کی پوری ٹیم خیر وعافیت سے ہوگی،ادارے کی طرف سے اعزازی شمارہ ماہ اکتوبر کا،2 اکتوبر کو موصول ہوا،اکتوبر 2012ء کا سالگرہ نمبر اپنی مثال آپ تھا۔ہر لفظ ڈر کی چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ تمام کہانیاں بہت دلچسپ تھیں۔خاص طور پر اس بار بلیک ٹائیگر اور سنہری تابوت کی قسط نے نیا رخ لیا ہے۔اس کے علاوہ زندہ لاشیں، انتقام،خونی کھیل،طوفان اور ادھورا سفر کافی پسند آئیں۔اور قوس قزح میں تمام کی تمام شاعری دلچسپ اور دلوں کو چھو لینے والی تھی۔

☆☆ باسط صاحب:آپ کو اعزازی کاپی مل گئی،خوشی کی بات ہے اور اسی خوشی میں کوئی اچھی سی کہانی جلد از جلد ارسال کردیں خط کے ہمراہ۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے،السلام علیکم رسالہ حسب معمول ہاتھوں میں ہے۔آئندہ سال بھی سالگرہ پڑھنے کی اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔آمین...... خطوط میں خالد صاحب کی ذہانت کی قدر کرتے ہیں...... قسط وار کہانیاں دیگر مکمل کہانیاں...... حسب معمول رواں دواں ہیں۔نئے مہمان سونیا رفیق کو ڈر کے بھائی بہن خوش آمدید کہتے ہیں۔1-10-2012 کو ہم پانچ دوست ذاتی سواری پر ایک ماہ کے ٹور پر سندھ کے علاوہ تینوں صوبوں اور آزاد کشمیر وغیرہ روانہ ہورہے ہیں۔دعا کی گزارش ہے کہ خیریت سے واپسی ہو...... ڈر میں شامل ہونے کے لئے پیشگی خطوط لکھے ہیں جو احباب روانہ کردیں گے۔ہم چاہتے ہیں پرانے ڈر کے ساتھی رسالے کو خوبصورت بنانے میں مشورے ارسال کیا کریں اور ہر ماہ رسالے میں نکھار پیدا ہوتا رہے۔ڈر کے قارئینوں اور ادارے کو دعائیں۔

☆☆ شرف الدین صاحب:ہماری دعا ہے کہ آپ تمام دوستوں کا ٹور خوشگوار ثابت ہو۔تحریر شامل اشاعت ہے۔آئندہ ماہ بھی

نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

عثمان غنی پشاور سے،السلام علیکم،ایڈیٹر صاحب،ڈر ڈائجسٹ،سالگرہ نمبر،ماہ اکتوبر کا شمارہ 24 تاریخ کو ملا،پڑھ کر خوشی ہوئی،شعر وشاعری بہت خوبصورت اور زبردست تھی۔سب سے پہلے قرآن کی پاک باتوں سے دل کو منور کیا،اس کے بعد خالد علی، صاحب کیب اتنی تحمل سے سنی،ایس حبیب خان صاحبہ سالگرہ مبارک ہو،امتیاز احمد میرا سلام قبول کریں،اور باقی دوستوں کو مبارک باد،کہانیوں کے بارے میں یہی کہوں گا کہ سالگرہ نمبر کا شمارہ تھا،سب کہانیاں زبردست تھیں اور ساتھیوں نے بہت ہی اچھا لکھا۔قسط وار تحریروں میں بلیک ٹائیگر،سوسورہی۔باقی رولوکا کا جواب ہی نہیں!رولوکا کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ جبکہ سنہری تابوت نے اس قسط کا مزہ دوبالا کردیا۔مکمل تحریروں میں جو میری نظر میں ٹاپ تھری رہیں وہ نمبر ون داری،نمبر ٹو پر زندہ لاشیں اور نمبر تھری پر طوفان،جی باقی ساتھیوں کے لئے یہی عرض،سب کی اسٹوریز دل کو چھو لینے والی تھی۔ڈر کے اس شمارے نے ہمیں بے حد متاثر کیا جبکہ ایک،دو کہانیاں ایسی بھی تھی،جو ذہن پر نقش بن کے رہ گئی۔ان میں ایک انجام عبرت،اور خونی کھیل نمایاں تحریریں ہیں۔جبکہ اس ماہ کا ڈر بہت اعلیٰ،خوبصورت بلکہ ہیرا تھا۔جو ہر لحاظ سے مکمل تھا۔

☆☆ عثمان صاحب:خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ،دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو حوصلہ وہمت سے کام لیتے ہیں،گھبرانا بزدلی ہے،جذبات میں کام بگڑ جاتے ہیں،جوش نہیں بلکہ ہوش سے کام لیں اور توکل اللہ رکھیں،اللہ آپ کی ضرور مدد کرے گا۔امید ہے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ ضرور ارسال کریں گے۔

غلام نبی نوری کھڈیاں خاص سے،سب سے پہلے ڈر کے تمام قارئین کو سلام،رائٹرز حضرات کو اور تمام اسٹاف کو سلگرہ مبارک ہو۔دفتری مصروفیات کی بنا پر میں ڈر کی سالگرہ پر کچھ نہ لکھ سکا اس کے لئے بہت افسردہ ہوں۔بہرحال میں اب ایک کہانی ”عذاب زندگی“ بھیج رہا ہوں امید ہے کہ پسند آئے گی۔اس کے علاوہ ”خون کے قطرے“ اور ”خونی غسل“ زیر قلم ہے امید ہے جلد ہی پوری ہوجائیں گی۔کہانیوں میں رولوکا کی قسط نمبر 89 بہت اچھی تھی،گڈ،سارا قوس قزح بہترین تھا۔سنہری تابوت زبردست تھی۔ بلیک ٹائیگر سپرہٹ تھی،انوکھی کتھا،بھول بھلیاں،طوفان،ادھورا سفر،دلہن،جھوٹی کہانی،آتما کی خواہش اور خاموشی زبردست اور سحر انگیز کہانیاں تھیں۔

☆☆ غلام نبی صاحب:تہہ دل سے خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ،آپ کہانی بصد شوق بھیجیں۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے،السلام علیکم،آپ سب کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں،اپنے محبوب پرچے ڈر ڈائجسٹ کے لئے شہر جانے کا اتفاق ہوا وہاں بک اسٹاپ پہ سالگرہ نمبر دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا سرورق بہت ہی اچھا تھا۔ایسا پرچہ نکالنے پر دلی مبارکباد قبول کریں،16 اکتوبر کے شمارے میں غزل شائع کرنے کا شکریہ اور ساتھ ہی غزل شائع نہ کرنے پر معذرت کی ہم تو شکایت کرنے والے تھے مگر آپ نے خود ہی محسوس کرلیا،سالگرہ نمبر کی ہر تحریر خوب سے خوب تر تھی جن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے،تمام قلمکاروں کو میری جانب سے دلی مبارکباد۔

☆☆ اسلم صاحب:سالگرہ نمبر دیکھ کر آپ کا دل باغ باغ ہوگیا،اور یہاں آپ کے تہہ دل سے لکھا ہوا خط پڑھ کر دل جھوم اٹھا،امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا بھولیں گے نہیں۔

سجاد حسین نومی پنڈدادنخان سے،اکتوبر کا سالگرہ نمبر پڑھ کر دل بہت خوش ہوا،ڈر کو سالگرہ کی مبارکباد قبول ہو،سب سے پہلے تو اپنی غیر حاضری کی وجہ بتانا چاہوں گا۔اصل میں میرے B.com کے پیپر تھے اور پھر رزلٹ۔آپ کو تو پتہ ہوگا کہ رزلٹ کی کتنی ٹینشن ہوتی ہے۔لیکن میری محنت،اللہ کی رحمت اور ماں باپ کی دعاؤں سے بہت ہی اچھے نمبروں سے پاس ہوگیا۔سالگرہ نمبر کی تقریباً تمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں،امتحان سے فارغ ہوچکا ہوں اب باقاعدگی سے اپنی کہانی اور دیگر تحریریں ارسال کروں گا، میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔

☆☆ سجاد صاحب:آپ کو امتحان کی کامیابی پر بہت بہت مبارکباد قبول ہو،آپ پاس ہوگئے اور اس خوشی میں مٹھائی کھلانا بھول گئے،بہرحال ہماری دعائیں ساتھ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی کے ہر جائز کام میں کامیاب وکامران کرے۔امید ہے اگلے ماہ بھی آپ خلوص نامہ بھیجنا بھولیں گے نہیں۔

☆☆☆

ساجدہ راجا۔ ہندواں سرگودھا

اچانک سمندر کی لہریں بپھر گئیں طوفانی ناقابل فراموش خونی لہروں نے جہاز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، جہاز تنکے کی طرح ڈولتا ہوا چکر کھانے لگا کہ پھر اچانک معجزہ رونما ہوا۔

دل ودماغ میں ایمان کی روشنی بکھیرتی ایک اچھوتی......انوکھی......ایمان افروز کہانی

پلاٹو سطح سمندر پر آگے ہی آگے بڑھتا جارہا تھا۔ موسم صاف تھا اور سمندر کی سطح بھی پرسکون تھی۔ جہاز کے تمام مسافر اس وقت جہاز کے ہال میں جمع تھے، سب کے چہروں سے خوشی چھلک رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ سب غموں کے بوجھ سے آزاد ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں اپنے اپنے پسندیدہ مشروب کے گلاس تھامے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یہ ایک ایسا بحری جہاز تھا جس میں تمام سہولیات میسر تھیں امیر لوگ ہی اس میں سفر کرتے تھے۔ کیونکہ اس کے اخراجات اور کرایہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس جہاز میں مسٹر رابرٹ تھامس اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ سفر کررہے تھے۔ ان کی اٹھارہ سالہ بیٹی کرسٹینا کی سالگرہ تھی جس کی خوشی میں مسٹر رابرٹ نے تمام مسافروں کو لنچ کی دعوت دی تھی اور اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام بھی کیا تھا۔

مسٹر رابرٹ بہت زیادہ دولت مند تھے اور ساتھ ہی عیاش طبع بھی۔ لیکن ان کی زندگی کا یہ تاریک پہلو، ان کی بیوی سے پوشیدہ تھا اگر نہ بھی ہوتا تو شاید اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ جولیا ''رابرٹ کی بیوی'' بھی اسی راہ کی مسافر تھی۔ ان دونوں نے اپنی زندگی کے یہ تاریک پہلو ایک دوسرے سے بخوبی چھپائے رکھے تھے۔

جولیا حسین ودلکش عورت تھی۔ بھی وہ اسمارٹ اور سڈول بدن کی تھی اس عمر میں بھی وہ اتنی چاق وچوبند اور دلکش تھی کہ کوئی بھی اسے کرسٹینا کی ماں نہیں سمجھتا تھا۔

اپنے حلقہ احباب میں وہ بہت مقبول تھی اس کی سہیلیاں اس پر رشک کرتی تھیں جتنی وہ عورتوں میں مقبول تھی اس سے کہیں زیادہ وہ مردوں میں مقبول تھی۔ جو مرد بھی اسے دیکھتا اس کے قرب کی تمنا کرتا لیکن وہ ہر کسی کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ جو اس کے دل کو بھاتا وہی اس کے قرب سے لطف اندوز ہوسکتا تھا۔

دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی اس کے بینک اکاؤنٹ میں اتنا روپیہ تھا کہ وہ ساری زندگی آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی تھی اس کے وہی شوق تھے جو اس طرح کے امیر طبقے کی عورتوں کو ہوتا ہے۔ یعنی سوئمنگ، ہوٹلنگ، لانگ ڈرائیو اور موویز دیکھنا۔ شوہر کی طرف سے مکمل آزادی اور توجہ نے اسے اور بھی پرکشش بنادیا تھا۔ اس کے شوہر کو اس پر مکمل بھروسہ تھا اس لئے اس نے کبھی بھی اس کو کسی بات سے نہیں روکا۔

سالگرہ کا کیک کٹ چکا تھا اور تمام مہمان

کھانے پینے میں مشغول تھے کرسٹینا جسے پیار سے کرسٹی کہتے تھے۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے درمیان ہنس بول رہی تھی اس نے نہایت بیش قیمت لباس زیب تن کر رکھا تھا اور خوشی اس کے خوبصورت چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی کرسٹی خود بھی حسین تھی لیکن جولی کی بات ہی کچھ اور تھی۔

ابھی وہ کھانے پینے اور شغل میں مصروف تھے کہ بادلوں کی زوردار گڑگڑاہٹ نے انہیں ایک لمحہ کے لئے چونکا کر رکھ دیا۔

☆......☆......☆

''رومیو، آخر تم کیوں اس موضوع سے اتنا کتراتے ہو؟ اگر میں غلط ہوں تو پھر جو بات میں نے کہی ہے اس کے خلاف کوئی دلیل کیوں نہیں دیتے؟ آخر کچھ نہ کچھ حقیقت تو ہے، ورنہ تم جانتے ہو میں جلد ہی کسی بات پر یقین نہیں کرتی۔''

روزی نے تیکھی نظروں سے رومیو کو دیکھتے ہوئے کہا تو جواباً وہ بولا۔

''کیا اس بات کے علاوہ تمہارے پاس کوئی موضوع نہیں، میں بور ہو رہا ہوں۔'' رومیو نے ایک تھکی ہوئی نظر اپنے پاس بیٹھی بیوی پر ڈالی جو دن بدن عجیب سی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کو ایک بات کا وہم پڑ گیا تھا اور ہر وقت اس کے متعلق سوالات کرتی رہتی تھی اس وقت بھی جب وہ بحری جہاز میں سوار ایک دور دراز کے علاقے میں سیر و تفریح کی غرض سے جا رہے تھے۔ رومیو جو سوچ کر آیا تھا کہ اس سفر کو مکمل انجوائے کرے گا لیکن روزی کی باتوں نے اسے مسلسل پریشان کر رکھا تھا۔

بات کچھ یوں تھی کہ کچھ عرصہ پہلے اسلام کے متعلق کچھ کتابیں اس کے ہاتھ لگی تھیں جسے اس نے اپنے شوہر رومیو کی اجازت سے پڑھنا شروع کیا۔ شروع شروع میں اس نے محض تفریح اور نالج کے لئے پڑھنی شروع کیں لیکن جوں جوں وہ پڑھتی گئی اس کے ذہن میں ایک کھوج سی لگ گئی اس نے کچھ اور کتابیں خریدیں اور انہیں بھی پڑھ ڈالا جوں جوں وہ پڑھتی گئی ایک روشنی سی اس کے دماغ میں بھرنے لگی۔ وہ اللہ کے بارے میں جاننا چاہتی تھی جو ساری کائنات کا خالق ہے یعنی ''اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی ساتھی نہیں، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ کسی نے اسے جنا، وہ ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔''

وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی جہاں مذہب سے لگاؤ سرے سے موجود ہی نہیں تھا، زندگی کھانے پینے اور انجوائے منٹ تک محدود تھی۔

پھر رومیو اس کی زندگی میں داخل ہوا دونوں کی شادی ہو گئی۔ رومیو کا تعلق بھی ایک ایسے ہی گھرانے سے تھا جہاں مذہب کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاتا تھا۔ شروع شروع میں وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور اپنی زندگی بھرپور طریقے سے گزار رہے تھے لیکن جب سے روزی نے اسلامی لٹریچر پڑھنا شروع کیا تھا، وہ اس بات کے پیچھے پڑ گئی تھی اور ہر وقت یہی جاننے کی فکر میں لگی رہتی ''کہ اللہ کون ہے؟''

رومیو اس کے سوالات سے جب بہت تنگ آ گیا تو اس نے پلان بنایا کہ وہ روزی کو بحری سفر کے ذریعے ایسی جگہ لے جائے جہاں وہ سب کچھ بھول جائے۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی رومیو نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک نوجوان موجود تھا۔

''جی فرمایئے۔'' رومیو نے بغور اس کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا تو اس نوجوان نے جو حلیہ سے ملازم معلوم ہوتا تھا، بولا۔

''سر! مسٹر اینڈ مسز رابرٹ نے آج دوپہر لنچ پر آپ دونوں کو بلایا ہے۔''

''لیکن کیوں؟ ہم تو انہیں اچھی طرح جانتے بھی نہیں۔'' رومیو نے حیرت سے پوچھا۔

''بات دراصل یہ ہے۔'' ملازم نے کہنا شروع کیا۔

''مسٹر رابرٹ کی بیٹی ہے کرسٹینا۔ آج اس کی سالگرہ ہے اسی سلسلے میں مسٹر رابرٹ نے جہاز پر موجود تمام لوگوں کو لنچ کی دعوت دی ہے۔''

''اوہ! اچھا...'' رومیو نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

''ضرور...... ہم لازمی اس دعوت میں شرکت کریں گے۔'' ملازم واپس چلا گیا تو وہ دروازہ بند کر کے واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ روزی ان کی باتیں سن چکی تھی اس لئے رومیو نے اسے بتانے کے بجائے اس تقریب کے لئے تیار ہونے کو کہا...... روزی نے اثبات میں سر ہلایا اور تیار ہونے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

جہاز پر موجود سارے لوگ حیران تھے کہ موسم تو بالکل صاف تھا یہ اچانک گہرے بادل کہاں سے آ گئے؟ بادلوں کی گڑگڑاہٹ بڑھتی ہی جا رہی تھی وہ سب بہت زیادہ پریشان ہو گئے۔

اٹلانٹک سمندر میں آنے والے طوفانوں کا بھی انہیں اندازہ تھا۔ خاص کر سردیوں میں تو بہت ہی خطرناک سفر ہوتا ہے۔ پتہ بھی نہیں چلتا اور اچانک برفانی تودے آگے آ جاتے ہیں جس سے جہاز کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

مسٹر رابرٹ نے دو تین ملازموں کو صورتحال جاننے کے لئے جہاز کے عرشے کی طرف دوڑایا اور خود مہمانوں سے باتوں میں مصروف ہو گئے لیکن ان کا دھیان بھی بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں لگا تھا...... سب مہمان کھانے پینے سے ہاتھ روک چکے تھے ان کے دل خوف سے دھڑک رہے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے؟

پر وقار تقریب اچانک ہی پریشانی میں بدل گئی تھی دل و دماغ کو گرماتی ہوئی کرسٹی بھی پریشانی کی وجہ سے اپنی ماں جولی کے پاس آ گئی تھی۔ جولی نے اس کا سر کندھے سے لگایا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ تھپک رہی تھی اتنے میں عرشے پر گئے ہوئے ملازم بدحواسی سے دوڑتے ہوئے آئے اور بتایا کہ ''باہر موسم بہت ہی خطرناک ہے کالے بادلوں نے پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور کسی وقت بھی طوفان آ سکتا ہے۔''

یہ سن کر لوگوں کی رہی سہی ہمت بھی دم توڑنے لگی۔ کرسٹی تو باقاعدہ رونے لگی۔ مسٹر رابرٹ اس کے پاس آئے اور اسے دلاسہ دینے لگے۔

سب مہمان سراسیمہ دکھائی دینے لگے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ عرشہ پر جا کر اپنی آنکھوں سے خراب موسم کا جائزہ لے۔ بادل اتنے زور سے گرجنے لگے جیسے آسمان کا سینہ چیر رہے ہوں۔ وقفے وقفے سے بجلی کے کڑکنے کی آواز انہیں مزید خوفزدہ کر رہی تھی۔

''میں باہر جا کر ذرا خود موسم کا جائزہ لے لوں۔'' یہ کہہ کر مسٹر رابرٹ عرشہ کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ جولی اور کرسٹی نے انہیں منع کیا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر کہ ''مجھے کچھ نہیں ہوگا'' چلے گئے بادلوں کی زوردار گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہی جہاز کو ایک جھٹکا لگا اور اس کے بعد تو یہ شروع ہو گیا۔ جہاز کبھی آگے جھکنے لگتا کبھی پیچھے۔ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں کچھ لوگ تو ایسے چیخنے لگے جیسے انہیں ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔

کرسٹی اور جولی کی حالت بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھی انہیں زیادہ پریشانی رابرٹ کی تھی کیونکہ وہ ابھی واپس نہیں آئے تھے۔ جہاز میں لگنے والے جھٹکوں کی وجہ سے کرسٹی کو ''سی سک نیس'' شروع ہو گئی۔ جولی اسے لے کر کمرے سے ملحقہ واش روم میں چلی گئی۔

seasickness ایسی بیماری ہے جو سمندری سفر کے دوران جب جہاز لہروں کے زور پر اوپر نیچے ہو رہا ہو تو ہوتی ہے۔ اس میں متاثرہ آدمی کو الٹیاں آتی ہیں اور سر چکرانے لگتا ہے۔

کرسٹی کی حالت کے پیش نظر جولی نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند سو چکی تھی ایسا اس لئے بھی تھا کہ اس بیماری کے دوران نیند بہت پرسکون آتی ہے۔

کرسٹی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد جولی جلدی سے باہر آ گئی اسے رابرٹ کی فکر تھی۔ لیکن جب وہ باہر نکلی تو اسے سامنے ہی رابرٹ نظر آ گئے جن کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی تھی۔ جولی نے

اطمینان بھری سانس لی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ٹھٹک گئی۔

رومیو اور روزی ٹھیک وقت پر تیار ہوکر سالگرہ کی تقریب میں پہنچ گئے تھے، روزی نے رومیو کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا، اس نے جو لباس زیب تن کیا ہوا تھا اس نے اس کے جسمانی نشیب و فراز کو خوب اجاگر کیا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے جہاں تقریب پورے اہتمام سے جاری تھی۔ رومیو کو ایسی دعوتیں بہت اٹریکٹ کرتی تھیں اور جب اس کی نظر جولی پر پڑی تو وہ جیسے اردگرد سے بیگانہ ہوگیا۔ جولی نے بھی اس کی نظروں کی تپش محسوس کرلی تھی لیکن اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتی رومیو کی نظریں اس کا پیچھا کرتیں۔

ادھر جب وہ دونوں ہال میں داخل ہوئے تو مسٹر رابرٹ کی نظر روزی پر پڑگئی اور پھر پلٹنا بھول گئی۔ مانا کہ ان کی بیوی بہت خوبصورت تھی لیکن رابرٹ کو جو بات روزی میں نظر آئی وہ کسی اور میں کہاں تھی۔ اس لئے وہ بار بار ان میاں بیوی کے پاس آتے اور انہیں کھانے کے لئے مختلف ڈشز پیش کرتے۔

روزی نے ان کا التفات محسوس کرلیا تھا اور اب اسے بہت الجھن ہورہی تھی اس وجہ سے وہ کسی اور چیز کی طرف دھیان ہی نہیں دے رہی تھی جبھی اس نے رومیو کی نظر بازی پر غور نہیں کیا تھا۔ مسٹر رابرٹ کی نظر جیسے اس کا پوسٹ مارٹم کررہی تھی سر سے پیر تک وہ اسے بغور دیکھ رہے تھے۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ پہلی دفعہ روزی کو اپنے کپڑوں سے الجھن ہونے لگی ورنہ پہلے تو وہ ایسے لباس زیب تن کرتی تھی جنہیں لباس کہنا بھی لباس کی توہین تھی۔

جب سے اس نے اسلام اور اللہ کے بارے میں پڑھنا شروع کیا تھا اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی۔ وہ تو اس تقریب میں آنا ہی نہیں چاہتی تھی لیکن رومیو کے اصرار پر اسے آنا پڑا اس نے لباس بھی اسی کی پسند کا پہنا تھا۔ کیونکہ بقول رومیو ”تمہیں محفل میں جدا نظر آنا ہے۔“ اب وہ سب سے جدا نظر آرہی تھی۔ لیکن اسے مسٹر رابرٹ کی تیز نگاہوں سے وحشت سی ہورہی تھی اس لئے کھانے کے بعد اس نے رومیو کو جہاز کے عرشے پر چلنے کے لیے کہا۔

ابھی وہ جانے کو سوچ ہی رہے تھے کہ بادلوں نے کچھ زیادہ ہی گرجنا شروع کردیا۔ رومیو کا ارادہ تھا کہ اس صورت حال میں عرشے پر نہ جایا جائے کیونکہ بارش کے دوران طوفان کا خطرہ بڑھ سکتا ہے لیکن روزی نے ضد کرکے رومیو کو عرشے پر جانے کے لئے تیار کرلیا۔

مسٹر رابرٹ نے روزی کی طرف دیکھا جو اپنے شوہر کے ساتھ ہال کے دروازے سے باہر نکل کر عرشے کی طرف جارہی تھی۔ مسٹر رابرٹ کو لگا کہ جیسے محفل ایک دم ویران ہوگئی ہو جب نوکر موسم دیکھ کر آئے تو وہ بھی خود موسم دیکھنے کے بہانے اوپر آگئے۔

موسم واقعی بہت خراب ہورہا تھا۔ گھنگھور کالی گھٹائیں برسنے کو بے تاب تھیں۔ ہواؤں کا زور بھی بڑھتا جارہا تھا اور یہ بہت ہی تشویش ناک بات تھی۔ مسٹر رابرٹ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو انہیں عرشے کی ریلنگ تھامے روزی نظر آئی جو دونوں ہاتھوں سے ریلنگ کو پکڑ کر کھڑی تھی اس کی نظریں سمندر کی بپھری ہوئی لہروں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں جبکہ اس کا شوہر اسے کسی بات کے لئے رضامند کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

مسٹر رابرٹ ان کے نزدیک پہنچ چکے تھے انہوں نے بس اتنا ہی سنا کہ رومیو روزی کو نیچے چلنے کے لئے کہہ رہا تھا لیکن وہ جانے پر رضامند نہیں تھی۔ مسٹر رابرٹ نے نزدیک جاکر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے آہستہ سے کھنکھارے......

ان دونوں نے چونک کر رابرٹ کی طرف دیکھا۔ روزی کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری کی جھلک نظر آئی اور دوسرے ہی پل اس نے خود کو نارمل جبکہ رومیو نے مسکرا کر رابرٹ کی طرف دیکھا۔

”وہ دراصل آپ لوگ اچانک تقریب چھوڑ کر اوپر آگئے تو مجھے تشویش ہوئی کہ نہ جانے کیا بات ہوئی جو آپ لوگ یوں اچانک چلے آئے۔ کہیں ہم سے کچھ کوتاہی تو سرزد نہیں ہوگئی؟ یہ کہتے ہوئے رابرٹ نے مسکراتے ہوئے روزی کی طرف دیکھا جیسے اس کی حالت سے لطف اندوز ہورہے ہوں۔ جبکہ رومیو مسکراتے ہوئے وضاحت کرنے لگا۔

”نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل روزی کی طبیعت کچھ گھبرارہی تھی تو اس نے ادھر آنے کا کہا۔“

”دیکھئے۔ موسم بہت خراب ہورہا ہے، یہاں مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ میرے خیال میں ہمیں نیچے چلنا چاہیے۔“ مسٹر رابرٹ کی فکرمندی کے جواب میں رومیو بولا......

”جناب یہی بات تو میں اپنی مسز کو سمجھا رہا ہوں کہ لیکن یہ یہیں رہنے پر بضد ہیں۔“

”دیکھئے مسز رومیو...... مناسب ہوگا کہ آپ نیچے تشریف لے چلیں موسم کے تیور بہت خطرناک ہورہے ہیں اور جہاز کے ڈولنے کی صورت میں اپنا توازن قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔“

رابرٹ کی بات پر روزی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک اونچی لہر کی وجہ سے مسٹر رابرٹ کا توازن بگڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریلنگ سے ہوتے ہوئے سمندر میں گرتے روزی نے جلدی سے ان کا بازو پکڑ لیا اور پیچھے کی طرف کھینچا۔ رومیو بھی جلدی سے آگے آیا اور مسٹر رابرٹ کو سنبھال لیا۔

رابرٹ نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہ تینوں نیچے آگئے۔

☆☆☆

جولی کی ٹھٹکنے کی وجہ رابرٹ کی حالت نہیں بلکہ رومیو تھا...... اس نے ابھی غور سے رومیو کو دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ اتنا خوبصورت اور وجیہہ مرد اس کی زندگی میں ابھی تک نہیں آیا تھا اور جولی کے لئے خوشی کی بات یہ تھی کہ وہ مرد اس سے بہت متاثر تھا اور پوری تقریب کے دوران صرف اسی کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر رومیو کی طرف دیکھتی گئی جواب بھی پرشوق نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اچانک مسٹر رابرٹ کے کھنکھارنے پر اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔

”یہ آپ کو کیا ہوا؟ آپ کی حالت ایسی کیوں ہورہی ہے؟ یہاں سے تو اچھے بھلے گئے تھے؟“

اس کی بات کے جواب میں رومیو نے سارا قصہ جولی کو سنایا کہ کیسے اونچی لہر اٹھنے کی وجہ سے جہاز ڈگمگایا تو مسٹر رابرٹ کا توازن بگڑ گیا۔ انہوں نے جلدی سے انہیں سنبھالا ورنہ وہ سمندر میں بھی گر سکتے تھے۔

یہ بات سن کر جولی نے ان کا شکریہ ادا کیا اور گہری نگاہوں سے ایک بار پھر رومیو کا جائزہ لیا، رومیو نے بھی فوراً اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے ایک پیغام واضح نظر آیا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

روزی اب بھی مسٹر رابرٹ کی طرف دیکھنے سے گریز کررہی تھی کیونکہ رابرٹ کی آنکھوں کی بے باکی اسے بہت کچھ سمجھا رہی تھی، وہ دونوں میاں بیوی عجیب سی صورتحال میں گھر گئے تھے۔ میاں خوش تھا تو بیوی پریشان۔ جبکہ مسٹر اینڈ مسز رابرٹ دونوں ہی خوش تھے......

بادلوں کی زوردار گڑگڑاہٹ سے وہ سب چونک کر حقیقت کی دنیا میں واپس آگئے۔ ان کے چہروں سے پریشانی جھلکنے لگی۔ جبکہ سب مسافروں میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ جہاز کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنا شروع ہوچکے تھے، اور جہاز کبھی بہت اوپر اٹھ جاتا اور کبھی ایک جھٹکے سے نیچے۔ مسافروں کی چیخ و پکار شروع ہوگئی جبکہ جہاز کے کیپٹن کی آواز انہیں بار بار پرسکون رہنے کے لئے تلقین کررہی تھی۔ لیکن اس وقت کسے

ہوش تھا۔ بادلوں کے گرجنے اور بجلی کے کڑکنے کی آواز لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی اور جہاز کے جھٹکوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ جہاز ایسے ڈول رہا تھا جیسے کوئی تنکا ہو، لہروں کی پرشور آواز دلوں کو مزید سہمائے دے رہی تھی۔ روزی رومیوں سے چمٹ گئی اور جولی نے رابرٹ کا ہاتھ پکڑ لیا اتنے میں ان کی بیٹی کرسٹی دوڑتی ہوئی آئی اور ماں کے گلے لگ گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف ہلکورے لے رہا تھا جبکہ اس کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ مسافر خود کو سنبھالنے کے لئے کسی نہ کسی چیز کا سہارا لے رہے تھے جہاز کے دائیں بائیں ڈولنے سے وہ بھی کبھی ادھر اور کبھی ادھر گر رہے تھے۔

جہاز کے ایک شدید جھٹکے کی وجہ سے رومیو اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا، اور نیچے گر گیا۔ روزی اس کے ہاتھوں سے نکل کر مسٹر رابرٹ سے ٹکرائی اور وہ دونوں اوپر نیچے فرش پر گر پڑے۔ جونہی رابرٹ کے اوپر روزی گری تو رابرٹ کے ہاتھوں نے گستاخی کر لی۔ روزی تڑپ کر ان سے علیحدہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت ہی نفرت تھی جبکہ رابرٹ دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”کتنا گھٹیا شخص ہے اس مصیبت میں بھی غلط حرکت سے باز نہیں آیا۔“ روزی نے نفرت سے سوچا۔ رومیو بھی اٹھ کھڑا ہوا اور روزی سے پوچھ رہا تھا کہ ”اسے کوئی چوٹ تو نہیں آئی۔“

اچانک جہاز کے کپتان کی آواز گونجی۔

”معزز مسافروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ خود پر کنٹرول کریں ہم جہاز کو طوفان سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کچھ ہی دیر میں ہم اس طوفان سے نکل جائیں گے۔“

لیکن طوفان اس قدر شدید تھا کہ لوگوں کو یہ بات محض تسلی کے سوا کچھ نہ لگی۔ جہاز کا عملہ بار بار مسافروں کے پاس آ کر انہیں نارمل رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔

طرف قدم بڑھانے شروع کئے اس کا رخ عرشے کی طرف تھا۔

رومیو بدحواس ہو کر اس کے پیچھے دوڑا اور اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کیا۔ روزی اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور ایک جھٹکے سے رومیو سے آ ٹکرائی۔

”کہاں جا رہی ہو تم......؟“

”میں اوپر عرشے پر جا رہی ہوں۔“ روزی نے خود کو اس سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

”تم پاگل ہو گئی ہو کیا......؟ اتنے شدید طوفان میں تم اوپر مرنے کے لیے جا رہی ہو؟“ رومیو نے سختی سے کہا۔

”نہیں رومیو! مجھے اس طوفان کو قریب سے دیکھنا ہے مجھے دیکھنا ہے کہ وہ کون ہے جو اتنے پرسکون سمندر میں اچانک اتنا خطرناک طوفان لا سکتا ہے؟ مجھے محسوس کرنا ہے کہ وہ کون سی ذات ہے جو ابھی تک اس جہاز کو سنبھالے ہوئے ہے؟ رومیو کیا تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا؟“ روزی نے وجد کے عالم میں کہا جبکہ رومیو حیران و پریشان سا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

روزی نے خود کو رومیو سے الگ کیا اور پھر باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے اور رومیو اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اب بھی روزی کو روک لیتا...... سب مسافر حیرت سے اس پاگل عورت کو دیکھ رہے تھے جو پہلے تو ڈر کے مارے کانپ رہی تھی اور اب اچانک اتنے طوفان میں اوپر عرشے پر جا رہی تھی......

جہاز کے ہچکولوں کی وجہ سے روزی کو اپنا توازن قائم رکھنے اور اوپر جانے میں بہت مشکل ہو رہی تھی، وہ ڈگمگاتے قدموں اور ڈولتی ہوئی اوپر پہنچ گئی۔ اس کی آنکھوں نے جو خطرناک منظر دیکھا، اس نے اسے وہیں ساکت کر دیا۔

زندگی میں پہلی بار اس نے اتنا شدید سمندری طوفان دیکھا تھا۔ اس نے دیو قامت سمندری لہروں کو

[illegible]

دیکھا۔ آج اس نے محسوس کیا تھا کہ جو بحری جہاز بندرگاہ پر کسی پانچ منزلہ عمارت کی طرح دکھتے ہیں وہ سمندری طوفان میں کیسے ایک تنکے کی مانند ہو جاتے تھے جنہیں خوفناک سمندری لہریں نگلنے کے لئے بے تاب نظر آتی ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح آگے بڑھی اور ریلنگ کو تھام لیا۔ پہلے کے نسبت اب وہ پرسکون تھی۔ اس نے آسمان کی طرف نظر دوڑائی۔ کالے بادل اور اس میں کڑکتی بجلی اور گرجتے بادلوں نے عجیب وحشت ناک سا منظر بنا دیا تھا۔ پھر اس کی نظر سمندری لہروں کی طرف گئی وہ کبھی سمندر کی طرف دیکھتی اور کبھی آسمان کی طرف۔ اور کبھی اس کی نظر جہاز پر پڑتی جسے سمندر نگلنے کے لئے بے تاب تھا۔ نہ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اسے کسی نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہو اور اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

بارش برسنے لگی سردی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا اور لہروں کے جہاز سے ٹکرانے کی وجہ سے پانی اس پر بھی پڑ رہا تھا جس سے وہ مکمل طور پر بھیگ گئی تھی لیکن اسے سردی کا کوئی احساس نہیں تھا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں کسی ان دیکھی ذات کو محسوس کرنے کے لئے...... نہ جانے اسے کتنی دیر ہوئی تھی آنکھیں بند کئے کہ اچانک بجلی کے کڑکڑانے پر اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ بجلی اتنے زور سے کڑکی تھی کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے پورا آسمان ٹوٹ کر گر پڑا ہو۔ اور ایسا ہوا بھی، اس سے کچھ فاصلے پر آسمانی بجلی گری اور اس جگہ کو آگ لگ گئی۔ اس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور بادلوں کی گرج میں شامل ہو گئی۔

”مسٹر رومیو! آپ کی مسز اس شدید طوفان میں اوپر کیوں گئی ہیں؟“

جب روزی اوپر عرشے پر گئی تھی تو سب اس کی طرف متوجہ تھے۔ رابرٹ نے بھی روزی کو اس شدید طوفان میں اوپر جاتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ متفکر سا [illegible] آئے تھے اور [illegible]

تھے۔

رومیو نے چونک کر رابرٹ کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔

”کچھ نہیں مسٹر رابرٹ...... دراصل اسے طوفان کو قریب سے دیکھنے کا شوق ہے۔ اس لئے وہ میرے روکنے پر بھی اوپر چلی گئی ہے۔“ رومیو نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پایا......

”مسٹر رومیو...... میں آپ کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا اگر وہ نادان ہے تو آپ کو کچھ خیال کرنا چاہیے تھا۔ یہ سمندری طوفان ہے اور بہت شدید طوفان ہے۔ یہ بچوں کا کوئی کھیل نہیں جو وہ یوں شوق سے دیکھنے چلی گئی اور آپ نے بھی اس کی احمقانہ خواہش پر سر جھکا دیا۔ اب دیکھئے ہمیں یہاں خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے اور وہ وہاں عرشے پر۔ خدا کے لئے مسٹر رومیو فوراً اوپر چلیں اور اسے نیچے لے آئیں۔“

رابرٹ نے رومیو کی بے وقوفی پر اسے سرزنش کی اور خود کو ڈائننگ ٹیبل تھام کر بڑی مشکل سے گرنے سے بچایا ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ بجلی اتنے زور سے کڑکی کہ وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھنے پر مجبور ہو گئے انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ آسمانی بجلی یہیں کہیں گری ہے۔ جونہی بجلی کڑکی اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ سنائی دی جو یقیناً روزی کی تھی۔

جیسے ہی رومیو اور رابرٹ نے چیخ سنی وہ فوراً اوپر کی طرف دوڑے۔ اوپر جا کر انہوں نے نہایت دلدوز منظر دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ روزی ایک طرف بے ہوش پڑی تھی جبکہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر آسمانی بجلی گرنے سے آگ لگ گئی تھی۔ لیکن پھر مسلسل ہوتی بارش نے اس آگ کو بجھانا شروع کر دیا اور یہ بہت اطمینان بخش بات تھی ورنہ آگ کے پھیلنے سے بہت نقصان ہو سکتا تھا۔

رومیو اور رابرٹ فوراً آگے بڑھے۔ رومیو نے روزی کو [illegible] مسٹر رابرٹ نے بھی اسے

سہارا دیا اور وہ گرتے پڑتے بڑی مشکل سے نیچے ہال میں آئے...... کچھ دیر بعد ہی طوفان کی شدت میں کمی آنے لگی اور وہ کم ہوتے ہوتے مکمل طور پر ختم ہوگیا...... مسافر جو کچھ دیر پہلے موت کے خوف سے لرزیدہ تھے اور جن کے چہروں پر موت کی زردی چھا گئی تھی اب وہ پرسکون ہوچکے تھے انہیں دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے وہ صحرا میں بھوکے پیاسے چلتے رہے ہوں اور اب جا کر انہیں کوئی نخلستان نظر آیا ہو۔

سب لوگ اوپر عرشے پر آگئے تھے یہ دیکھنے کے لئے کہ طوفان کے گزرنے کے بعد کیا حالات ہوئے ہیں یا جہاز کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا......؟

لیکن جب وہ اوپر آئے تو سب کچھ پہلے کی طرح نارمل تھا۔ سمندر یوں پرسکون اور خاموش تھا جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو اور ویسے بھی یہ خشکی تو تھی نہیں کہ جہاں طوفان کے بعد بہت تباہی ہوتی ہے اور نظر بھی آتی ہے...... یہ سمندر تھا یہاں ایک پل میں کچھ اور دوسرے پل میں کچھ اور......

سب مسافروں کی زبانوں پر اسی واقعہ کا ذکر تھا سب اپنے اپنے تجربات بیان کررہے تھے۔ روزی بھی اب نارمل تھی اور دل چسپی سے سمندر کا جائزہ لے رہی تھی کبھی وہ ریلنگ پر آگے جھکتی اور کبھی کسی ڈولفن کو دیکھ کر خوشی سے چلاتی۔ اسے ذرا بھی خیال نہیں رہا تھا کہ رابرٹ کتنی دیر سے اسے ہی تکے جارہے تھے۔ وہ اپنی مستی میں گم تھی اردگرد سے بالکل بے نیاز......

رابرٹ اس وقت بالکل اکیلے تھے اور کرسٹی اپنی ایک ہم عمر لڑکی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ رومیو نے متلاشی نظروں کو آس پاس دوڑایا لیکن جولی اسے کہیں دکھائی نہ دی۔ انہوں نے روزی کی طرف دیکھا جو اپنے آپ میں مگن سمندری نظاروں سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ وہ روزی کے پاس آیا اور کہا کہ وہ نیچے واش روم میں جارہا ہے اور نیچے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ اس کا خیال تھا کہ جولی یقیناً نیچے ہوگی اور اس سے بات کرنے کا اس سے اچھا اور کوئی موقع نہیں۔

جیسے ہی وہ نیچے گیا رابرٹ نے محتاط نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ سب لوگ اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ اس نے ایک لمبی سانس بھری اور روزی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ روزی نے رابرٹ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو سمٹ کر ایک طرف کھڑی ہوگئی اور سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔

''ایکسکیوز می مس روزی...... کیا کچھ دیر کے لئے آپ کے پاس کھڑا ہوسکتا ہوں؟'' رابرٹ نے نہایت شائستگی سے دریافت کیا۔

''جی...... آپ کھڑے تو ہو ہی چکے ہیں۔ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں......؟''

''کرتو آپ بہت کچھ کرسکتی ہیں مس روزی...... لیکن آپ تو ہماری طرف توجہ ہی نہیں دیتیں۔ اتنا بھی آپ کو خیال نہیں کہ کوئی آپ کے لئے کتنا بے تاب ہے۔'' رابرٹ نے اپنے لہجے کو جذباتی بناتے ہوئے کہا جبکہ روزی ان کی بات سن کر بھڑک گئی۔

''آپ کو شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔ میں آپکی بیٹی کی ہم عمر کی ہوں۔ اور اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے آپ دوسری عورتوں کے لئے کیوں بے تاب ہیں؟ کیا آپ کو اپنی عمر کا کچھ لحاظ نہیں......؟''

''ایک بار ملو تو سہی سویٹ ہارٹ۔ پھر تمہیں بتاؤں گا کہ میری عمر کیا ہے؟'' رابرٹ نے خباثت سے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

روزی کا دل چاہ رہا تھا کہ رابرٹ کو ایک تھپڑ جڑ دے لیکن آس پاس موجود لوگوں کا خیال کرکے چپ ہوگئی اور صرف اتنا کہا۔

''بہت ہوگیا مسٹر رابرٹ۔ آپ یہاں سے چلے جائیں ورنہ میں شور مچا کر سب کو آپ کی اصلیت بتا دوں گی......؟''

''ابھی تو میں جارہا ہوں مس روزی لیکن جلد ہی آپ کو اپنی بانہوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' رابرٹ نے یہ کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے نو دو گیارہ ہوگئے جبکہ روزی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی......

☆......☆......☆

رومیو عرشے سے اتر کر ہال میں آیا تو جولی وہاں موجود نہیں تھی۔ اس نے ہر طرف نگاہ دوڑائی مگر بے سود...... پھر اس نے اپنے قدم اس کے کمرے کی طرف بڑھا دیئے۔ دروازے کے پاس جا کر اس نے آہستہ سے دستک دی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور جولی کا دلکش چہرہ نظر آیا۔ جولی نے پہلے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''ہیلو مسٹر رومیو......! یہ واقعی آپ ہیں یا میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔'' جولی نے حیرت اور خوشی سے ملی جلی آواز میں کہا۔

اس کے جواب میں رومیو نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔

''نہیں مس جولی...... یہ خواب نہیں حقیقت ہے میں حقیقت میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔''

''حیرت ہے حقیقت بھی اتنی خوبصورت ہوتی ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ صرف خواب خوبصورت ہوتے ہیں جبکہ حقیقت اور بات۔'' اور اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ رومیو کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مس جولی...... آپ کی باتیں بھی آپ کی طرح بہت اچھی ہیں۔ یقیناً آپ کی قربت بہت دلچسپ ہوگی۔''

''مس جولی نہیں...... صرف جولی...... تم مجھے جولی کہا کرو۔'' جولی نے ایک ادائے دلربائی سے کہا اور رومیو کو اپنا دل سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

''پلیز! جولی! اتنا تو بے چین مت کرو۔ یہ دل تو پہلے ہی بہت بے صبرا ہوا جارہا ہے۔''

رومیو نے کہا تو جولی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''بہت خوب...... آپ تو کافی جلد باز انسان ہیں۔ ابھی پہلی ہی ملاقات ہے اور آپ بے صبرے بھی ہوگئے۔ ویسے کہتے ہیں کہ ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیے ورنہ دل بھی جل سکتا ہے۔'' جولی نے معنی خیزی سے کہا اور...... وہ

رومیو ہنس پڑا اور بولا۔

''مزہ تو گرم گرم کھانے میں ہے ٹھنڈا مجھے بھاتا نہیں۔''

''یعنی آپ بھی میری طرح ہیں۔ مجھے ایسے لوگ بہت اٹریکٹ کرتے ہیں جو ہو بہو میری طرح ہوں۔''

''تو پھر کب ملاقات ہوگی جولی......؟ میں اب اور صبر نہیں کرسکتا۔'' رومیو بے تاب لہجے میں بولا تو جولی پرسوچ لہجے میں بولی۔

''کل رات ٹھیک رہے گا، ویسے تو رابرٹ پانی پینے یا سگریٹ پینے کے لئے اٹھتے رہتے ہیں لیکن میں انہیں چائے میں نیند کی دوا دے دوں گی تاکہ کوئی مسئلہ نہ ہو۔ ایک منٹ میں آئی۔''

یہ کہہ کر جولی اندر گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شیشی تھی جس میں کوئی سفید سا سفوف بھرا ہوا تھا۔ اس نے وہ شیشی رومیو کے ہاتھ میں پکڑائی اور بولی۔

''تم ایسا کرنا یہ نیند کی دوا تم اپنی بیوی کو چائے میں ملا کر دینا۔ اس طرح ہمیں دونوں طرف سے اطمینان رہے گا۔''

''لیکن ہم ملیں گے کہاں......؟'' رومیو نے اہم نکتہ اٹھایا۔

''گڈ...... بہت اچھا سوال کیا ہے تم نے...... ایسا کرنا جو روم نمبر 16 ہے۔ وہ خالی ہے اور اس طرف جاتا بھی کوئی نہیں۔ وہاں ہم اطمینان سے مل سکیں گے۔''

جولی تو جیسے سارا پلان کئے بیٹھی تھی۔ رومیو نے اثبات میں سر ہلایا اور وہاں سے واپس پلٹ آیا......

''کیا سوچ رہے ہو رومیو......؟'' روزی نے رومیو کے قریب بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھے۔ رومیو بستر پر لیٹا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ جب مسلسل خاموش اور ایک ہی پوزیشن میں پڑا رہا تو

روزی نے فکر مند ہو کر اس سے سوال کیا لیکن رومیو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"رومیو...... رومیو......" روزی کے بار بار پکارنے پر وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا۔

"ک...... کیا ہوا؟"

"مجھے تو نہیں لیکن تمہیں ضرور کچھ ہو گیا ہے۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ کیا سوچ رہے ہو......؟" روزی نے دوبارہ پوچھا تو اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"کچھ نہیں ...... بس ایسے ہی ...... تم سو جاؤ۔"

رومیو کے لہجے میں بیزاری ہی بیزاری تھی لیکن روزی اس وقت کسی اور خیال میں تھی اس لئے وہ محسوس نہیں کر سکی۔

"رومیو ایک بات بتاؤ......" روزی نے رومیو کی طرف دیکھ کر کہا اس کی آنکھوں میں ان گنت سوالات تھے۔

"کون سی بات؟" رومیو کی آنکھوں میں صرف جولی کا ہی سراپا تھا اس لئے اسے روزی کے سوالات برے لگ رہے تھے۔

"یہ طوفان کیوں آیا تھا......؟" اس نے ایک عجیب سا سوال کیا۔ جسے سن کر رومیو نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔

"پتہ ہے رومیو؟ میں نے کتاب میں پڑھا تھا کہ جب اللہ کو کوئی بات ناپسند ہوتی ہے اور گناہ بڑھنے لگتے ہیں تو ایسے عذاب آتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ اس سے عبرت پکڑیں۔ رومیو تم خود سوچو اس دن پارٹی میں کیا ہوا تھا......؟ انجوائمنٹ کے نام پر لوگ کیسی کیسی غلط اور نامناسب حرکتیں کر رہے تھے۔ وہ عورتیں کیسے غیر مردوں کی بانہوں میں اترا رہی تھیں اور مرد بھی اپنی بیویوں کو چھوڑ کر غیر عورتوں میں دل چسپی لے رہے تھے۔"

روزی اپنی دھن میں بولے گئی جب کہ رومیو کو لگا جیسے وہ اس پر طنز کر رہی ہے وہ بیزاری سے بولا۔ "بس کرو روزی؟ یہ تم ہر روز کیا باتیں لے کر بیٹھ جاتی ہو؟ پلیز! خود بھی انجوائے کرو اور مجھے بھی کرنے دو۔"

"پلیز! رومیو غور کرو اور میری بات کو یونہی ٹالو۔ تم نے دیکھا کہ جب پارٹی میں مرد عورتیں حد سے تجاوز کرنے لگے تھے تو فوراً ہی بادل گڑگڑائے تھے۔ ا طوفان آ گیا تھا حالانکہ کچھ دیر پہلے موسم بالکل صاف تھا۔ اللہ کا عذاب تھا جس کا میں نے مسلمانوں کی کتابوں میں پڑھا ہے۔ رومیو خدا ہم سے ناراض ہے۔ تم دیکھنا رومیو...... تم دیکھنا آگے اور بھی بہت کچھ ہو اس وقت تک جب تک کوئی ایک بھی اللہ سے معا نہیں مانگ لیتا...... میں اللہ کو ماننے لگ گئی ہو ...... لیکن ابھی کچھ وقت اور چاہیے مجھے یقین کر میں۔ اور تم دیکھنا میں تمہیں بھی یقین دلا کر رہوں گی۔"

روزی کی دیوانگی بڑھتی جا رہی تھی۔ رومیو اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"بس بہت ہو گیا روزی...... اب میں ایک بھی نہیں سنوں گا۔ خود بھی سو جاؤ؟ اور مجھے بھی سو دو، تم نے ساری تفریح کا مزہ خراب کر دیا ہے؟" یہ ہوئے رومیو نے کروٹ بدل لی۔ جبکہ روزی تاسف سے اسے دیکھا اور آنکھیں موند لیں......

☆......☆......☆

دوسرے دن رومیو وقت مقررہ پر روم 16 میں پہنچ گیا۔ جولی اسی کی منتظر تھی جیسے ہی وہ کمر میں داخل ہوا تو جولی بے قراری سے اس کی طرف لپک

"کب سے انتظار کر رہی ڈارلنگ...... اتنی دیر لگا دی؟"

"میرے خیال میں ابھی اتنی بھی دیر نہیں ہو میری جان۔" رومیو نے اس کی بے تابی سے لطف ا ہوتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں مجھے تو کافی وقت ہو گیا انتظار کر ہوئے شاید میں جلدی آ گئی ہوں اور تم مقررہ پر۔" جولی نے خود کو سنبھالتے ہوئے شرمندہ سے میں کہا۔

رومیو نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں کے

میں بھر لیا۔

"میری جان میرا مقصد ہرگز تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ میں تو کب سے بے چین تھا تم سے ملنے کو۔ لیکن وقت کٹ ہی نہیں رہا تھا کہ بڑی مشکل سے روزی کو سلا کر آیا ہوں۔"

"کیا تم نے اسے وہ دوا نہیں دی......؟" جولی نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

"دی ہے میری جان...... تم فکر نہ کرو، دراصل اس پر آج کل ایک بات کا وہم سوار ہو گیا ہے اسی پر بحث کرتی رہتی ہے؟" رومیو نے بیزار لہجے میں کہا۔

"کس بات کا وہم......؟" جولی نے استفسار کیا۔

"چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو......؟"

"بتاؤ نا پلیز! کیا مجھ سے بھی چھپاؤ گے؟" جولی نے ایک لاڈ سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ دراصل کچھ عرصہ پہلے اس کے ہاتھ چند اسلامی کتابیں لگیں۔ اس نے مجھ سے اجازت لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کا ارادہ محض نالج میں اضافہ کرنا تھا لیکن کچھ دنوں بعد اس نے مجھ سے سوال کرنا شروع کر دیئے۔"

"کس قسم کے سوالات؟" جولی نے دل چسپی سے پوچھا۔

"یہی کہ اللہ کون ہے؟ اس کائنات کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور بھی بہت سے سوالات کرتی ہے۔ اب تو اس کا یقین اللہ پر پختہ ہوتا جا رہا ہے خود اس نے مجھ سے کہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ جلد ہی مسلم ہو جائے گی۔" رومیو نے ساری تفصیل بتانے کے بعد اپنے خدشے کا اظہار بھی کر دیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ روزی مسلم ہو جائے گی؟"

"نہیں رومیو اسے مسلم مت ہونے دینا۔ اگر وہ مسلم ہو گئی تو سمجھو وہ گئی تمہارے ہاتھ سے۔ یہ مسلم عجیب خیلات کے مالک ہوتے ہیں! مجھے تو ذرا بھی اچھے نہیں لگتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک عورت کو صرف اپنے شوہر اور شوہر کو صرف اپنی بیوی کے قریب ہی رہنا چاہیے اور ان کا ہی وفادار رہنا چاہیے۔ اب تم خود بتاؤ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ اپنے آپ کو صرف ایک بندے تک محدود کر دینا۔ زندگی تو صرف انجوائمنٹ کے لئے ہوتی ہے اسے ایسے ضائع کر دینا کہاں کی عقل مندی ہوتی ہے کیا تم میری باتوں سے اتفاق کرتے ہو رومیو......؟" جولی نے بے تکان بولنے کے بعد رومیو سے سوال کیا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم، میرا بھی زندگی کے متعلق کچھ اسی طرح کا نظریہ ہے لیکن پتہ نہیں روزی کو دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے، بہت بور کرنے لگی ہے؟"

"اور اب میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" جولی نے ایک ادائے دلربائی سے کہا۔

"تمہاری تو بات ہی کچھ اور ہے میری جان۔ مجھے تمہاری جیسی عورت ہی سوٹ کرتی ہے۔ اچھا اب ذرا میرے قریب آؤ بہت باتیں ہو گئیں اب کچھ کام کی بات کرتے ہیں۔"

رومیو نے شرارت سے کہتے ہوئے جولی کو اپنی گود میں اٹھا کر بیڈ کی طرف قدم بڑھا دیئے جبکہ جولی زور سے ہنس پڑی......

☆......☆......☆

جہاز کو سمندر میں سفر کرتے سات دن ہو چکے تھے لیکن ابھی منزل بہت دور تھی۔ سمندر کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا ابھی مہربان تو کچھ ہی دیر میں سب سے بڑا ظالم، شام ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ رومیو نہ جانے کہاں تھا اور روزی نے حسب معمول عرشے کی ریلنگ تھامے سمندر میں نہ جانے کیا تلاش کرنے میں مصروف تھی۔ رابرٹ نے اسے دیکھا تو اس کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"ہائے مس روزی......" رابرٹ نے خاصی چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہائے......؟" روزی نے خاصی بے دلی سے جواب دیا

"ایک بات پوچھ سکتا ہوں مس روزی......؟" رابرٹ نے سوالیہ نظروں سے روزی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پہلی بات تو یہ مسٹر رابرٹ کہ آپ مجھے مسز رومیو بھی کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ مجھے اپنا نام کہلوانا پسند نہیں۔"

"مس روزی ہو یا مسز رومیو اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟" رابرٹ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا جبکہ روزی پھٹ پڑی۔

"بہت فرق پڑتا ہے مسٹر رابرٹ۔ جب آپ مجھے مسز رومیو کہیں گے تو آپ کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوگی کہ میں شادی شدہ اور کسی کی بیوی ہوں۔ اور آپ جو یوں بے باک نظروں سے میری طرف دیکھتے ہیں اس سے نجات ملے گی۔"

"بہت خوب مس روزی...... یا مسز رومیو......" رابرٹ نے مسز کو خاصا لمبا کر کے طنزیہ لہجے میں کہا اور پھر بولے۔

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون شادی شدہ ہے یا نہیں۔ مجھے جو پسند آتا ہے میں اسے حاصل کر کے رہتا ہوں اور تمہیں میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آج رات تم مجھ سے مل رہی ہو۔ اگر تم نہ آئی تو پھر اس موبائل میں ریکارڈ ڈ ویڈیو تمہارے شوہر تک پہنچ جائے گی اور پھر یہ جو تم مسز رومیو کا ٹھپا اپنے ساتھ لگائے رکھتی ہو اسی وقت اس سے نجات مل جائے گی۔"

"بند کرو اپنی یہ بکواس۔ تم خود کو سمجھتے کیا ہو کہ جس لڑکی پر تم نگاہ ڈالو گے وہ تمہارے قدموں میں ہوگی؟

سن لو مسٹر رابرٹ...... یہ تمہاری بھول ہے اور جس ویڈیو کی بات کر رہے ہو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ کیونکہ میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا جس سے ڈروں۔ تم بیشک جو مرضی کر لو لیکن میں ہرگز تم سے نہیں ملوں گی اور مہربانی ہوگی آئندہ مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش بھی مت کرنا۔" روزی نے انگلی اٹھا کر رابرٹ کو کہا جس کے جواب میں رابرٹ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"پہلے یہ ویڈیو دیکھ لو اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا۔" رابرٹ نے اپنا موبائل روزی کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

روزی نے نہ چاہتے ہوئے بھی موبائل پکڑا اور اس نے جو کچھ دیکھا وہ سب اس کے ہوش اڑانے کو کافی تھے۔

موبائل میں روزی کی نہایت قابل اعتراض ویڈیو تھی جو شاید اس کے واش روم میں نہانے کی تھی جہاں وہ بہت بے فکری سے نہا رہی تھی۔ پتہ نہیں یہ ویڈیو کس طرح بنائی گئی تھی۔

حالانکہ یہ حقیقت تھی کہ وہ نہاتے وقت واش روم کا دروازہ لاک نہیں کرتی تھی لیکن ان کے کمرے میں بلا اجازت بھلا کون داخل ہوتا۔؟

وہ موبائل پکڑے ساکت کھڑی تھی کہ رابرٹ نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اس سے لے لیا۔ اور پھر اپنی طنزیہ آواز میں بولے۔

"یہ تو صرف ویڈیو ہے اگر تم نے ملنے سے انکار کیا تو اس ویڈیو سے متعلق وہ، وہ کہانیاں تمہارے شوہر کو بتاؤں گا کہ وہ تمہاری صورت دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرے گا۔ آج رات 12 بجے روم نمبر 20 میں......"

رابرٹ نے انگلی اٹھا کر اسے وارن کے سے انداز میں کہا اور آگے کو قدم بڑھا دیے جبکہ روزی ساکت سی اس کی پشت دیکھتی رہ گئی......

دن گزر گیا اور پھر رات آ گئی۔ جیسے ہی روم نمبر 20 میں روزی داخل ہوئی۔

رابرٹ کی چہکتی ہوئی آواز اس کی سماعتوں میں زہر گھول گئی اس نے کہا۔

"دیکھا مس روزی...... میں نے کہا تھا ناں کہ میں جسے چاہتا ہوں حاصل کر کے رہتا ہوں چاہے اس کے لئے مجھے کوئی سا بھی طریقہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔"

"ابھی میں صرف اس کمرے میں آئی ہوں مسٹر رابرٹ ابھی تم مجھے حاصل کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے، تم نے آنے کا کہا تھا اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے حاصل کر چکے ہو؟"

روزی کے لہجے میں شدید نفرت تھی جسے رابرٹ نے بخوبی محسوس کر لیا تھا پھر اس نے کہا۔

"اس کمرے میں آنے کا مطلب ہے کہ اب میں جو چاہوں کر سکتا ہوں تم ہر طرح سے میرے دائرہ اختیار میں ہو......!"

جبکہ رابرٹ کی بات سن کر روزی کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی اور وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

"تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تم ایک ادنیٰ انسان ہو جو اپنی مرضی سے حرکت بھی نہیں کر سکتا۔ اور تم سب کچھ کرنے کا دعویٰ کر رہے ہو...... جب تک وہ اللہ جو خالق کائنات ہے اس کی مرضی نہیں ہوگی تم آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتے۔"

"بہت خوب مس روزی...... آپ بھی مسلموں کی زبان بولنے لگیں...... اللہ کی مرضی...... ہوں...... اگر اللہ تمہاری اتنی ہی حفاظت کرنا چاہتا ہے تو پھر اس نے مجھے یہ ویڈیو کیوں بنانے دی......؟" رابرٹ نے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس میں وہ روزی کی قابل اعتراض ویڈیو تھی۔

"خیر جو بھی ہو اب تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اب باتوں کو چھوڑو اور میری بانہوں میں آ جاؤ۔"

یہ کہہ کر رابرٹ نے روزی کی طرف قدم بڑھائے تو روزی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"ہاہاہا...... اب پکارو اپنے اللہ کو......! کہ وہ تمہیں مجھ سے بچائے۔ نہیں بچائے گا وہ...... تم ایسے ہی اس کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔ نہیں بچائے گا وہ......"

رابرٹ ایسے ہی کفر بکتا اس کی طرف بڑھا۔

روزی کے منہ سے...... اللہ...... نکلا۔

ابھی رابرٹ کے ہاتھ روزی کو چھو بھی نہ پائے تھے کہ جہاز کو اتنے زور سے جھٹکا لگا کہ رابرٹ اچھل کر دور جا گرا۔

روزی بھی اس جھٹکے سے بمشکل سنبھلی۔ ابھی وہ کھڑی ہی ہوئی تھی کہ اس کی نظر موبائل پر پڑ گئی جو رابرٹ کے ہاتھ سے چھوٹنے کے بعد کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ رابرٹ اٹھ کر موبائل اٹھاتا روزی نے پھرتی سے موبائل اٹھایا اور باہر کی طرف بھاگ گئی۔

عرشے پر آ کر اس نے موبائل کو سمندر میں پھینک دیا اور اطمینان کی سانس لی...... اس کا یقین اللہ پر اور بھی مضبوط ہو گیا لیکن اس کے اندر ابھی ایک اور بے چینی تھی کچھ اور جاننے کی جستجو۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسی راستے پر ہے جو منزل کی طرف جاتا ہے لیکن ابھی وہ منزل سے بہت دور ہے۔

"کچھ ایسا ہے جو وہ نہیں جانتی۔ اور جو کچھ وہ نہیں جانتی وہی اسے منزل پر پہنچا سکتا ہے......" ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اس نے عجیب سا شور سنا۔ اسے بہت حیرانگی ہوئی کہ یہ کیسا شور ہے......؟

وہ صورت حال جاننے کے لئے اندر گئی، جونہی وہ دروازے پر پہنچی تو اس نے ایک نہایت وحشت ناک منظر دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ ایک بہت ہی بھیانک مخلوق ایک آدمی کو پکڑے ہوئے ہے اور اس کی گردن پر اپنا منہ رکھا ہوا ہے۔ اس آدمی کی چیخیں بہت مدہم ہو چکی تھیں۔ پھر آخر کار بالکل ہی ختم ہو گئیں۔

وہ حیران تھی کہ یہ کون سی مخلوق ہے اور یہ جہاز میں کیسے داخل ہوئی؟

ابھی وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس بلا نے اس مردہ آدمی کو اٹھایا اور ایک طرف بڑھنے لگی پھر ایک کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر اس میں داخل ہو گئی اور دروازہ بند ہو گیا......

ہر کوئی سراسیمہ دکھائی دے رہا تھا جیسے موت

ان کے سروں پر ناچ رہی ہو۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ بلا کیسے اور کب اندر آئی......

سب لوگوں نے اپنے اپنے کمروں میں گھس کر دروازے اندر سے لاک کر لیے تھے۔ روزی بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی لیکن اس کی نظریں ابھی تک اسی دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر یہ ہوا کہ اس کے قدم اپنے کمرے کے بجائے اس کمرے کی طرف بڑھنے لگے جہاں وہ بھیانک مخلوق داخل ہوئی تھی۔ دروازے کے قریب جا کر اس نے کان دروازے سے لگا دیئے۔

اندر سے عجیب سی کھرچ......کھرچ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی کچھ کھانے میں مصروف ہو۔ اس نے کی ہول سے جھانکا اور اس نے نہایت ہولناک منظر دیکھا۔ وہ مخلوق جس آدمی کو اٹھا کر لے گئی تھی اس کا اب نام و نشان بھی نہیں تھا البتہ کپڑوں کے ٹکڑے اور ہڈیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔

روزی نے اپنی آنکھیں کی ہول سے ہٹا لیں اور تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی......

پورے جہاز میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ سب لوگ جہاز کے کپتان سے باز پرس کر رہے تھے لیکن کپتان خود بھی لاعلم تھا۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی اور ان لوگوں نے اس کمرے کو باہر سے اچھی طرح لاک کر دیا تھا تاکہ وہ مخلوق اندر ہی رہے اور انہیں کچھ سوچنے کا وقت مل جائے اور وہ اس عجیب الخلقت مخلوق کے خلاف کچھ موثر اقدام کر سکیں اس اچانک پڑنے والی افتاد سے وہ سب بوکھلائے ہوئے تھے انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کریں......؟

”میرے خیال میں ہمیں اس مخلوق کو کسی طرح سے بے ہوش کر کے سمندر میں پھینک دینا چاہیے......!“ ایک آدمی نے اپنا خیال پیش کیا۔

”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اسے بے ہوش کیسے اور کون کرے گا......؟“ ایک اور آواز آئی اور سب کو

اچانک ایک زوردار چنگھاڑ کے، ساتھ اس کمرے کا دروازہ گر گیا جس میں وہ بھیانک مخلوق بند تھی۔ اس آواز کا سننا تھا کہ سب مسافروں میں دہشت پھیل گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا وہ ادھر بھاگ گیا۔ وہ مخلوق کمرے سے باہر آئی اس کی آنکھوں سے آگ کے شعلے سے نکلتے محسوس ہو رہے تھے شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اسے کمرے میں بند کیا گیا تھا اور اب وہ اپنا غصہ ان پر نکالنے والی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اس کا رخ ہال کے باہر کی طرف کھلنے والے دروازے پر تھا کیونکہ زیادہ تر مسافر اوپر کی طرف بھاگ گئے تھے۔ روزی اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اس بھیانک مخلوق کی پشت اس کی طرف تھی۔

روزی جانتی تھی کہ اب اگر وہ مخلوق عرشے پر پہنچ گئی تو کسی کا بھی بچنا مشکل ہوئے گا۔

وہ مخلوق آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی آگے کی طرف جا رہی تھی جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو اپنے شکار کی اور اسے یہ اطمینان ہو کہ کوئی بھی اس سے بچ نہیں پائے گا۔ اس کے پورے جسم پر بالوں کی موجودگی نے اسے مزید خوفناک بنا دیا تھا۔

اس کے لمبے بالوں کو دیکھ کر اچانک روزی کو کچھ خیال آیا وہ تیزی سے جہاز کے کچن کی طرف بھاگی جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں لائٹر تھا۔ وہ دبے قدموں اس مخلوق کے پیچھے پہنچ گئی وہ مخلوق اپنی ہستی میں گم اوپر کی طرف جا رہی تھی اس کے منہ سے عجیب و غریب غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ روزی نے لائٹر جلایا اور چپکے سے اس مخلوق کے لمبے بالوں کو آگ لگا دی۔ جھاڑ جھنکاڑ نما بالوں نے تیزی سے آگ پکڑ لی اتنے میں وہ مخلوق اوپر پہنچ چکی تھی۔ اسے اوپر دیکھ کر لوگوں کے چہروں پر خوف پھیل گیا۔ اور پھر وہ اس کے پیچھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس مخلوق کے بالوں میں آگ لگی ہوئی تھی اور وہ تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔

اچانک اس مخلوق کو بھی کچھ غلط ہونے کا احساس

ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتی آگ نے مکمل طور پر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی بھیانک آوازوں نے لوگوں کا دل دہلا دیا۔ پھر اچانک اس مخلوق نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اور پھر سمندر کے گہرے پانی نے اس مخلوق کو اپنے اندر سمو لیا۔

☆......☆......☆

اس دن کے بعد رابرٹ نے روزی کو کبھی مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جب بھی کبھی روزی کے آمنے سامنے ہوتا، نظریں جھکا لیتا۔

جبکہ جولی اور رومیو کی ملاقاتیں جاری تھیں۔ جن سے روزی بے خبر تھی۔

جہاز مسلسل اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ مسافروں کے دلوں میں انجانا سا خوف پھیل گیا تھا سمندر میں طوفان آنا تو معمولی بات تھی لیکن اس خوفناک مخلوق کے آنے کے بعد سب کے دلوں کو عجیب سے خوف نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہر وقت دل کو یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اب کچھ ہوا کہ تب......

روزی دل سے اللہ کے وجود کی قائل ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود وہ دل سے پرسکون نہیں تھی۔ وہ کیوں پرسکون نہیں......؟ اس......کیوں......کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ عرشے کی ریلنگ تھامے سمندر کی وسعتوں کو تکتے کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ اچانک ایک زوردار جھٹکے سے وہ بمشکل سنبھلی۔

پھر اس کے بعد تو جھٹکے جیسے شروع ہو گئے۔ اس نے خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے نیچے سمندر کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئی کہ برف کے بڑے بڑے تودے پانی میں تیرتے ہوئے اس جہاز سے ٹکرا رہے تھے جس کی وجہ سے جہاز کو مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک یہی سلسلہ جاری رہا اور پھر برف کے تودوں کے ختم ہوتے ہی جھٹکے بھی بند ہو گئے اور سب نے سکون کا سانس لیا......

”بیٹا! ہم جانتے ہیں کہ تم کیوں بے سکون ہو......؟ تم یہی جاننا چاہتی ہو نا کہ اللہ تعالیٰ کو ماننے کے بعد بھی تمہارے اندر سے بے چینی ختم نہیں ہو رہی۔“

”ہاں میں جاننا چاہتی ہوں کہ آخر یہ بے چینی کیسی ہے؟ آپ کون ہیں؟ پلیز! مجھے بتائیں میں کیا کروں۔“ روزی نے بے چینی سے ان سے دریافت کیا جو نہایت نورانی شکل والے بزرگ تھے ان کے چہرے پر ان کی سفید داڑھی انہیں بہت بارعب بنا رہی تھی۔

”بیٹا! تم نے اللہ کی ذات کا اقرار تو کر لیا لیکن اس کے محبوب کی ذات کے بارے میں کچھ نہیں جانا جو اسی کی ذات کا حصہ ہے۔“ بزرگ کی شفقت سے بھرپور آواز گونجی۔

”تو پھر محترم بزرگ......! مجھے بتایئے کہ کون ہے ان کا محبوب تاکہ میں ان کی ذات معتبر کا بھی اعتراف کر سکوں کہ مجھے دلی سکون نصیب ہو جائے۔ کون ہے وہ محبوب ہستی جو اللہ کا محبوب ہے؟ کون ہے وہ خوش قسمت؟“ روزی نے روندھی ہوئی آواز میں کہا۔

جواباً وہ بزرگ مسکرا کر بولے۔

”وہ ہیں اللہ کے محبوب اور آخری نبی حضرت محمد ﷺ......جن کی ذات کا انکار گویا اللہ کی ذات کا انکار ہے۔ تم نے اللہ کو مانا لیکن اس کے محبوب سے بے خبر رہی اس لئے تمہیں سکون نہیں مل رہا اب تم ان کی ذات کا اقرار کرو تو تمہارے اندر سکون ہی سکون پھیل جائے گا۔ اور ایک بات سے میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آنے والے وقت میں تم لوگوں کو جو اس جہاز پر سوار ہیں بہت سی مصیبتیں آنے والی ہیں۔ کچھ نادیدہ قوتوں کے زیر اثر آئے گا یہ جہاز......صرف اتنا یاد رکھنا کہ جتنی بھی مصیبت پہنچے اللہ کو یاد رکھنا اور ہر چیز جو تمہیں نقصان پہنچانا چاہے ان کا حل صرف آگ ہے۔ آگے تم خود دیکھ لینا۔ اب تم گواہی دو کہ ”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ بزرگ نظروں سے اوجھل ہو گئے اور روزی کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی۔ اس کے لبوں پر ابھی تک

کلمہ تھا۔ وہ حیران سی چاروں طرف دیکھنے لگی گویا یہ ایک خواب تھا یعنی حقیقی خواب۔ اس نے سوچا اور کمرے سے باہر قدم بڑھا دیئے۔

☆......☆......☆

سب لوگ حیرانگی سے اس جزیرے کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں جہاز آپ ہی آپ بڑھتا جارہا تھا۔ جہاز کے کیپٹن نے جہاز کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اس جزیرے کی طرف لے جارہی ہے۔ آخر کار تھک ہار کر کیپٹن نے جہاز کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ جہاز کشاں کشاں اس جزیرے کی طرف بڑھتا جارہا تھا اور سب مسافر حیران وپریشان تھے کہ یہ کیا ہوا......؟ جزیرہ تو ان کی منزل نہیں تھی...... پھر کیپٹن سے اس بارے میں سوال کیا تو اس نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''میں نے بہت کوشش کی ہے لیکن جہاز کسی صورت کنٹرول نہیں ہو رہا۔ ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی ان دیکھی طاقت ہے جو جہاز کو جزیرے کی طرف کھینچ رہی ہے۔''

یہ سن کر سب لوگوں کے چہروں پر خوف چھا گیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب نہ جانے اس جزیرے پر کیا صورتحال پیش آتی ہے۔

روزی کچھ نہ کچھ اس حقیقت سے واقف تھی کیونکہ اسے خواب میں اشارہ مل چکا تھا۔ اس نے لائٹر بھی اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا اور وہ آنے والے وقت کے لئے خود کو تیار کر رہی تھی۔

رومیو بھی اس کے پاس تھا اس کے چہرے پر بھی پریشانی ہویدہ تھی۔ رومیو روزی کے بارے میں ابھی کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ روزی نے ابھی اسے کچھ بتایا تھا کیونکہ حالات ہی ایسے پیش آرہے تھے کہ کچھ بتانے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

جہاز رک چکا تھا ساحل کے نزدیک، وہاں پانی بہت گہرا تھا۔ اگر وہاں پانی کم ہوتا تو جہاز وہاں پھنس سکتا تھا اور ایک دفعہ جہاز کا پھنسنے کا مطلب اس سے ہاتھ دھونا ہے کیونکہ پھر جب تک کوئی اور جہاز نہ آجائے، مدد کو، اسے گہرے پانی میں نہیں لایا جاسکتا......

وہ سب جہاز سے لٹکتی سیڑھی اور کشتی کے ذریعے جزیرے کی سرزمین پر اترے۔ بہت ویران اور سنسان جزیرہ تھا نہ کوئی چرند پرند نہ کوئی ذی روح۔ لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی کا موڑ مڑتے ہی انہیں ایک بہت بڑی بستی دکھائی دی۔ وہاں انہیں، بہت سے لوگ ادھر ادھر چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ آخر کار وہ سب بستی میں پہنچ گئے، جیسے ہی وہ بستی میں داخل ہوئے بستی والوں مڑ کر یوں اچانک ان کی طرف دیکھا جیسے کسی نے ریموٹ کا بٹن دبا کر انہیں مڑنے پر مجبور کر دیا ہو، ان کی آنکھوں کی وحشت ناکی نے ان سب کے جسموں میں خوف کی لہر دوڑا دی۔ وہ سب بھوکے درندے کی مانند ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور یہ صرف ایک لمحے کے لئے ہوا اس کے بعد وہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ وہ سب مٹی اٹھا اٹھا کر ایک جگہ جمع کر رہے تھے نہ جانے ان کا مقصد کیا تھا کچھ لوگوں کو انہوں نے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ دکھائی دیئے جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

آخر تھک ہار کر وہ ایک جگہ ستانے کے لئے بیٹھ گئے اور محتاط نظروں سے چاروں اطراف کا جائزہ لینے لگے ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اتنے لوگوں کے ہونے کے باوجود یہ خاموشی بہت زیادہ پراسرار محسوس ہو رہی تھی۔

شام ہونے کو آئی تھی لیکن انہوں نے ابھی کچھ کھایا پیا نہیں تھا جہاز سے نکلتے وقت انہیں اس بات کا خیال ہی نہیں رہا تھا اور اب یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں ساری رات بھوکا ہی رہنا پڑے گا۔ یہ اتنی پریشانی کی بات نہیں تھی لیکن روزی بہت متفکر ہو رہی تھی۔ رومیو کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ''میرا دل کہہ رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے...... لیکن کیا ہونے والا ہے اس کا کچھ پتہ نہیں۔'' لائٹر اس نے مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا تھا جیسے اگر لائٹر نہ ہوا تو وہ زندہ نہیں رہیں گے۔

اچانک وہ چونک گئے۔ دو آدمی ان کی طرف آ رہے تھے قریب آ کر انہوں نے انہیں اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ اجنبی انہیں لئے ایک بہت بڑی جھونپڑی میں آ گئے۔ اندر پہنچ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ایک بہت بڑا دستر خوان بچھا ہوا تھا اور اس پر طرح طرح کے کھانے لگے ہوئے تھے اجنبیوں نے انہیں کھانے کا اشارہ کیا اور فوراً باہر چلے گئے وہ اتنے بھوکے تو نہ تھے لیکن کھانوں سے اٹھنے والی اشتہا انگیز خوشبو نے ان کی بھوک چمکا دی اور وہ سب کھانے پر ٹوٹ پڑے کھانا بہت لذیذ تھا ایسا کھانا انہوں نے زندگی میں نہیں کھایا تھا کھانے کے بعد انہیں نیند نے آلیا اور وہ وہیں سونے کے لئے لیٹ گئے......

دوسرے دن روزی کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ دوسرے سب لوگ ابھی سوئے پڑے ہیں لیکن حیرانگی کی بات یہ تھی کہ ان میں مسٹر اینڈ مسز رابرٹ اور ان کی بیٹی غائب تھے وہ بہت پریشان ہوگئی دوسروں کو جگانے کے بجائے اس نے خود باہر جا کر حالات کو دیکھنے کا فیصلہ کیا...... وہ جھونپڑی سے باہر آئی اور ایک طرف چل پڑی۔ کچھ دیر بعد وہ ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں وہ بستی والے مٹی جمع کر رہے تھے۔ وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ آدھے سے زیادہ مٹی سرخ ہو چکی ہے اور کچھ لوگ ایک بڑے سے برتن میں کوئی سرخ مائع اس میں ڈال رہے ہیں۔ وہ بہت حیران سی ایک طرف چل پڑی۔ کچھ دور جا کر اسے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ وہ وہاں پہنچی اور اس نے جو منظر دیکھا، اس نے اسے وہیں ساکت کر دیا۔

اس نے دیکھا کہ مسٹر اینڈ مسز رابرٹ اور ان کی بیٹی درختوں سے الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ ان کی گردن جسم سے علیحدہ تھی اور ان کے نیچے ایک بڑا سا برتن رکھا تھا جس میں خون ان کی گردنوں سے ٹپک کر گر رہا تھا۔ اور گردنوں سے گرتا خون کو ایک اور برتن میں ڈال کر ایک طرف لے جارہے تھے، اسے اب سمجھ آیا کہ وہ سب خون کا کیا کرتے ہیں؟ وہ اس خون کو اس مٹی میں ملا رہے تھے جو وہ ابھی دیکھ کر آئی تھی اور جس کا رنگ اب سرخ ہو چکا تھا۔

کسی کی بھی نظر اس پر نہیں پڑی تھی وہ دہشت زدہ سی واپس پلٹ آئی واپس آ کر اس نے سب کو اس واقعہ کے بارے میں بتایا جسے سن کر سب بہت خوفزدہ ہو گئے جبکہ رومیو کے چہرے پر دکھ کی ایک لہر چھا گئی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ جولی یوں اچانک بچھڑ جائے گی۔ وہ گم صم سا ہو گیا۔

سارے لوگ بہت دہشت زدہ تھے۔ انہوں نے فوراً واپس جہاز میں جانے کا ارادہ کیا۔ اور واپسی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ابھی وہ ساحل پر پہنچے کہ انہیں اپنے پیچھے عجیب وغریب آوازیں آنے لگیں انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ ایک گرد وغبار کی آندھی انہیں اپنی طرف بڑھتی محسوس ہو رہی تھی اور اس آندھی کا شور بہت عجیب تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آندھی انہیں اپنے آپ میں سمیٹ کر لے جائے گی اور ان کا نام ونشان بھی نہیں ملے گا۔ لوگوں کے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اچانک روزی کے ذہن میں ایک جھماکہ ہوا۔ اس نے فوراً لائٹر جلایا اور وہاں پڑے خشک پتوں کو آگ دکھا دی۔ آگ تیزی سے اس طرف پھیلنے لگی جہاں سے آندھی آ رہی تھی جیسے ہی آگ تھوڑا بلند ہوئی۔ آندھی کا شور ایک پل کے لئے تھا اور دوسرے ہی لمحے آندھی کا نام ونشان نہیں تھا۔ روزی نے سب کو جہاز کی طرف بھاگنے کا کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب جہاز میں پہنچ چکے تھے اور جہاز کچھ ہی دیر میں اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔

جہاز پر موجود سارے لوگ عرشے پر حیران وپریشان جمع تھے اور ان کے سامنے نہایت عجیب وغریب منظر تھا۔

ان کا جہاز برف میں مکمل طور پر پھنس چکا تھا تا حدنگاہ چاروں طرف برف ہی برف تھی آگے برف کے بلند پہاڑان کا راستہ روکے کھڑے تھے جہاز رک چکا تھا اور وہ سب اس نئی مصیبت سے سراسیمہ تھے۔

اچانک انہیں کڑک ،کڑک کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے ریلنگ سے نیچے جھانکا، اور ان کے ہوش اڑگئے وہ برف جس نے ان کا راستہ روکا تھا اب آہستہ آہستہ جہاز کے اوپر آرہی تھی۔ وہ بہت حیران سے اس برف کو دیکھ رہے تھے جو مسلسل اوپر پھیلتی جارہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برف کچھ ہی دیر میں جہاز کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور وہ سب کچھ ہی دیر میں اس برف کا ایک حصہ ہوں گے اور ان کا نام ونشان بھی ختم ہوجائے گا۔

روزی کو ان بزرگ کی بات ابھی تک یاد تھی وہ ریلنگ کے پاس آئی اور لائٹر جلا کر اس برف کے نزدیک کیا جو ریلنگ تک آچکی تھی۔ آگ کا دکھانا تھا کہ وہ برف یوں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگی جیسے کوئی خود اسے توڑتوڑ کر گرا رہا ہو۔ کچھ ہی دیر میں جہاز مکمل طور پر برف سے آزاد ہوچکا تھا۔ لیکن ابھی برف کے پہاڑجوں کے توں موجود تھے۔ برف سے آزاد ہوتے ہی جہاز خود بخود چل پڑا۔ انہوں نے جہاز کو کنٹرول کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے جہاز کا انجن کسی اور کے کنٹرول میں آگیا ہو۔

آخر تھک ہار کر انہوں نے جہاز کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا۔ جہاز تیزی سے ان پہاڑوں کے نزدیک پہنچتا جارہا تھا۔ اور سارے مسافر یوں سکتے میں تھے جیسے کسی نے ان کی قوت گویائی چھین لی ہو......

جہاز کو لگنے والے جھٹکوں سے روزی کو ایک دم ہوش آگیا اس نے فوراً سے پیشتر لائٹر جلایا اور ان چٹانوں کے قریب کردیا کیونکہ جہاز اب برف کی چٹانوں کے درمیان ڈولتا پھر رہا تھا۔ اور اسے اتنے زور سے جھٹکے لگ رہے تھے کہ اگر کچھ دیر یہی صورتحال رہی تو جہاز ضرور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجائے گا......

جونہی روزی نے لائٹر چٹان کے قریب کیا چٹان پانی بن کر بہہ گئی۔ اسی طرح اس نے دوسری چٹانوں کے ساتھ بھی کیا۔ وہ لائٹر کو جس چٹان کے قریب لے جاتی وہ پانی بن کر بہہ جاتی۔ 20 منٹ کی پرمشقت سفر کے بعد وہ اس چٹانی سلسلے سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے......

اذیت اور جان لیوا سفر کے بعد جہاز اب اپنی منزل مقصود پر پہنچ چکا تھا۔

روزی اور رومیو بھی جہاز سے نیچے اتر آئے روزی کا دل ایمان کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ اب اس نے تفریح تو نہیں کرنی تھی لیکن اس کا ارادہ جلد واپس اپنے ملک جاکر اسلامک سینٹر جوائن کرنے کا تھا اور اس نے رومیو سے بھی کہہ دیا تھا کہ جلد بائی ائیر واپس جانے کا انتظام کرے۔ اس وقت بھی وہ ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے کہ روزی بولی......

"رومیو...... تمہیں بتارہی ہوں کہ میں دل اور قلبی طور سے اسلام قبول کرچکی ہوں۔ میں اب کسی صورت مذہب اسلام سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ مجھے بہت خوشی ہوگی اگر تم بھی اسلام قبول کرلو کیونکہ یہ ایک ایسا دین ہے جو ہر طرح سے مکمل ہے لیکن اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے تو پھر ہم میاں بیوی کی حیثیت سے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ میں نے پڑھا ہے کہ ایک مسلم عورت صرف مسلم شوہر کے ساتھ ہی رہ سکتی ہے۔" یہ کہہ کر روزی کرسی پیچھے کرکے کھڑی ہوگئی اور رومیو کی طرف دیکھ کر کہنے لگی......

"مجھے بہت خوشی ہوگی اگر تم اسلام قبول کرکے زندگی کا یہ سارا سفر میرے ساتھ گزارو۔ اگر نہیں۔ پھر تم مجھے آزاد کردو کیونکہ میں ایک غیر مسلم شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" یہ کہہ کر روزی نے اپنا بیگ اٹھایا اور ہوٹل سے باہر نکل گئی جبکہ رومیو خالی خالی نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا......

زدو پشیمان

اسمارہ نوشین۔فیصل آباد

بند کمرے میں اچانک ٹھنڈی ہوا کا سرور بخش جھونکا آیا اور پھر روشنی کا ایک ہالہ نظر آیا اس روشن ہالہ میں ایک نورانی چھرہ ہیولہ نمودار ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے......

غرور اور تکبر والا ہمیشہ ذلیل ورسوا ہوتا ہے جس کا اٹل ثبوت کہانی پڑھ کر پتہ چلے گا

میں دو بھائیوں کی اکلوتی اور لاڈلی بہن اور شہوار ہوں۔ تقریباً تین سال کی عمر میں، میں بہت صاف اور مکمل الفاظ کی ادائیگی کرنے لگی تھی، اس لئے مجھے سب نے بلبل کہنا شروع کردیا۔ ہروقت مسرتوں کے گیت گاتی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ غم کیا ہوتا ہے اور کیسے آتا ہے؟ رونا کیا ہے؟ اور لوگ کیوں روتے ہیں؟ میں جو خواہش کرتی وہ اسی وقت پوری ہوتی۔

میرا کمرہ ہر طرح کے کھلونوں سے بھرا ہوتا تھا۔ پھر بھی شام کو جب بابا جانی آتے تو میرے لئے کچھ نہ کچھ ان کے ہاتھ میں ضرور ہوتا۔

خوشحال گھرانے کا تصور ہمارے گھر کو دیکھ کر مکمل ہوجاتا۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تو امی جان نے مجھے اپنے ساتھ کچن کے کام میں لگالیا۔ اور کچھ ہی دنوں میں شوق نہ ہوتے ہوئے بھی میں اچھی

خاصی کوکنگ سیکھ گئی۔

میرے بابا جانی کو میرے ہاتھ کے پکوان بہت پسند آتے۔ وہ بہت خوش ہوتے کھا کر۔ ہنستے کھیلتے ایک دن بابا جانی گھر سے نکلے۔ میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں باہر کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔

کیونکہ مجھے کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ تمام موضوعات پر، چاہے شاعری ہو، سفرنامے ہوں، ناول، افسانے یا مکالمے، الغرض ہر طرح کی کتابیں پڑھنے سے مجھے بہت رغبت تھی۔

مجھے اپنے کورس کی کتابیں پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ بابا جانی کا خیال تھا کہ میں ایک دن ضرور رائٹر بنوں گی۔

امتحانات سے فارغ ہو کر بھی گھر کے کاموں سے جب مجھے فرصت ملتی تو میں اپنی کتابیں پڑھنے لگتی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی دستک اتنی شدید تھی کہ میرا دل ڈر سے کانپ گیا منہ سے بے اختیار نکلا الٰہی خیر۔ مگر خیر تو رخصت ہو چکی تھی۔ چھوٹے بھائی نے جیسے ہی دروازہ کھولا باہر چارپائی پر چادر میں لپٹا کوئی وجود نظر آیا، میں بھی باہر بھاگی اور جب دیکھا تو بابا جانی کے دفتر کے لوگ بابا جانی کو لے کر آئے تھے۔ ہم ایکدم گھبرا گئے اور زندگی میں پہلی دفعہ بابا جانی کا چہرہ دیکھ کر میں بے اختیار روئی۔ میرے سرخ وسفید چہرہ والے بابا جانی کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ اتنی دیر میں امی جان بھی باہر نکل آئیں اور بابا جانی کو دیکھ کر ان کی بھی حالت خراب ہوگئی اتنے میں میرے کانوں میں آواز پڑی شاید بابا کے کسی دفتر کے کلرک کی تھی وہ کہہ رہا تھا۔

”میں صاحب سے کچھ فائلوں پر دستخط کروانے کے لئے ان کے پاس گیا۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ اچانک شاہنواز صاحب نے دل پر ہاتھ رکھا اور جھک گئے، میں نے گھبرا کر سب لوگوں کو بلا لیا۔ صاحب کو صوفے پر اٹھا کر لٹایا، ڈاکٹر کو جلدی سے بلایا، ڈاکٹر نے آتے ہی چیک کر کے بتایا کہ شاہنواز صاحب کی ہارٹ اٹیک سے ڈیتھ ہوگئی۔“

یہ خبر ہم پر بجلی بن کر گری، بھائی مجھے اور امی سنبھال رہے تھے، ساتھ ہی خود بھی صدمے نڈھال تھے۔ ہمارا گھر مہمانوں سے بھرا تھا بابا جانی کوئی آواز بھی واپس نہ لا سکی۔ اور وہ اپنی آخری آرام گاہ کی طرف اپنے ابدی گھر میں جا سوئے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔

ہوتے ہوتے کچھ ماہ یونہی گزر گئے، بابا جانی کے دفتر والوں کے بابا جانی کی گریجویٹی کی رقم وغیرہ لئے کوشش کرنے سے کچھ آسانی ہوگئی۔ بعدازاں پنشن کے لئے امی جان نے میرا نام لکھوا دیا۔ کہ پنشن میری بیٹی کے نام سے ہو۔ یوں بابا جانی کی پنشن سے حالات ٹھیک ہونے لگے۔

انہی دنوں میرا میٹرک کا رزلٹ آیا، میں شاندار نمبروں سے میٹرک کلیئر کیا تو بھائی جان چھوٹے بھیا کے مشورے سے مجھے کالج میں ایڈمیشن دیا، اور ہوتے ہوتے میں نے ایف اے امتیاز نمبروں سے پاس کرلیا۔

ابھی میں تھرڈ ائیر کے پہلے سال میں تھی کمزوری اور بیماری کی وجہ سے میری امی بھی مجھے بلکتا چھوڑ کر چلی گئیں۔ امی کے بعد میں بالکل خاموش ہوگئی، یا ہر دم روتی رہتی یا گھر کے کاموں میں مصروف رہتی بڑے بھیا نے بابا کی گریجویٹی سے کاروبار اسٹارٹ کیا تھا اس لئے بہت مصروف تھے ان کا کاروبار چل نکلا تھا۔ چھوٹے بھیا ابھی پڑھ رہے تھے وہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھے جب ان کے کہنے پر میں دوبارہ کالج جانا شروع کردیا۔ ابھی تک بابا جانی پنشن نکلوانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ سیدھی میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جاتی تھی۔ اب گریجویشن کے پیپر دینے لگی تھی جب میری ممانی کے کہنے پر بڑے بھائی شادی پر تیار ہوگئے کہ میں گھر میں سارا دن اکیلی رہتی ہوں چلو مجھے بھی بھابھی دوست کے روپ میں مل جائے گی تو ممانی صاحبہ کی بھانجی بھیا کے لئے چنی گئی جو واقعی بھیا کے ساتھ بہت جچتی

یوں بابا امی کو یاد کرتے بھیا کے سر پر سہرا سج گیا اور صبا، بھابھی بن کر ہمارے گھر آگئی۔

بھابھی بہت اچھی تھیں نرم خو، اور ہنسنے مسکرانے والی۔ میں سارا سارا دن ان کے آگے پیچھے پھرتی۔ وہ ایک مرتبہ کہہ دیتیں کہ ”بلبل بریانی کھانے کا دل چاہ رہا ہے۔ میں جھٹ کچن میں چلی جاتی۔ بھابھی کو تو میں گھر کے کسی کام کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیتی۔

انہی دنوں میرا گریجویشن کا رزلٹ آ گیا میں نے بی اے بھی شاندار نمبروں سے پاس کیا تھا اس دن گھر میں سب بہت خوش تھے۔ اسی خوشی میں بھابھی نے گھر میں پارٹی رکھی جس میں ان کی کزنز بھی شامل تھیں اور رشتے داروں کے ساتھ، ان کی کزن جوہی جو بہت خوبصورت تھی اسے تو ہمارا گھر بہت پسند آیا۔ پارٹی میں ہی کسی نے میرے آگے پڑھنے کے بارے میں پوچھا تو بھیا نے کہا۔ ”انشاء اللہ! آگے ایم۔ اے کرے گی۔“

مگر ساتھ ہی بھابھی نے رونی صورت بنا کر کہا۔ ”اگر بلبل کالج چلی گئی تو اس کے بعد میرا دل کیسے لگے گا، میں تو بلبل کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔“ یوں میری اتنی خواہش کے باوجود میں نے ایم۔ اے کا خیال دل سے نکال دیا۔

اب میں ہوتی اور بھابھی، میری وہی روٹین گھر کی صفائیاں وغیرہ کرنے کے بعد بھابھی کے لئے کچھ نہ کچھ ان کی فرمائش پر بنا دیتی وہ بہت تعریف کرتیں اور میں خوش ہو جاتی۔

اب تو اکثر ان کی کزن جوہی بھی آنے لگی اور جس دن جوہی آتی وہ سارا دن میں اور کچن ہوتا۔ کیونکہ بھابھی کی طرح وہ بھی بہت خوش خوراک تھی۔ میں نے اکثر نوٹ کیا کہ وہ اس وقت آتیں جب چھوٹے بھیا گھر پر ہوتے اور ہفتے میں ایک دن تو اس کا آنا ضروری ہوتا۔

رمضان کا تیسرا روزہ تھا ہم تینوں بھائی بہن روزہ رکھتے جب کہ بھابھی روزہ نہیں رکھتی تھیں۔ تیسرے روزے کی بات ہے انتہائی گرمی پڑ رہی تھی۔

آج تو دل کو بھی کچھ ہو رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ٹھنڈے پانی کے دو تین گلاس پی لیتی اگر روزہ نہ ہوتا۔ بھابھی مجھے آوازیں دیتی ہوئی کمرے میں آئیں۔ وہ مجھے جانو کہتی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو بھابھی میرے بیڈ کے پاس کھڑی تھیں کہنے لگیں۔ ”جانو کیا کر رہی تھیں؟“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”بھابھی سونے لگی ہوں۔“

وہ کہنے لگیں۔ ”وہ جوہی کے ساتھ اس کا بھائی زید سعودی عرب سے آیا ہے، ایک گھنٹہ تک وہ آجائیں گے جانو تم تو جانتی ہو میں تو کچن میں دو منٹ نہیں رہ سکتی پلیز! عزت کا سوال ہے۔“

آج پہلی بار دل چاہا کہ جواب دے دوں کچن میں جانے سے۔ مگر پھر طبیعت کی خرابی کے باوجود میں کچن میں گئی تو کھانوں کی لمبی لسٹ وہاں کاؤنٹر پر پڑی تھی۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی مگر وقت کم تھا اس لئے کھانے کی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ ایک گھنٹہ بعد وہ لوگ آ گئے تو بھابھی کے کہنے پر انہیں شربت بنا کر دیا۔ اتنے میں جوہی کی آواز آئی۔ ”آپی! وہ آپ کی بلبل جانو نظر نہیں آرہی؟“ تو بھابھی ہنستے ہوئے بولیں۔ ”بلبل کو کچن سے عشق ہے اس لئے وہ کچن میں ہی ہے۔“

کام سے فارغ ہوئی تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں کھانا سرو کرتی۔ اتنے میں بھابھی آئیں۔ ”جانو! کتنی دیر سے میں سر تھامے ٹیبل پر بیٹھی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”سب کچھ تیار ہے بھابھی اب ٹیبل آپ خود سیٹ کریں۔“

بھابھی نے ناگواری سے مجھے دیکھا مگر میری حالت کے پیش نظر چپ کر کے نکل گئیں۔ اور میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ مجھے نہیں پتہ باہر کیا ہوا؟ کس نے کیا کھایا؟ میں بہت نڈھال تھی، میری آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں لیکن مجھے محسوس ہوا کہ جیسے

کوئی میرے کمرے میں داخل ہوا ہے مگر میں نے آنکھیں نہ کھولیں، آج پہلی بار مجھے دکھ اور کوفت ہوئی تھی۔ مگر کس کو کہتی۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار سی پورے جسم پر پڑ رہی ہے۔ میں حیرت زدہ رہ گئی مگر وہ پھوار اچھی اور پیاری محسوس ہو رہی تھی۔

پھر پتہ نہیں میں کتنی دیر تک سوتی رہی کہ چھوٹے بھیا کی آواز نے مجھے نیند سے بیدار کیا۔ انہوں نے میری آنکھیں دیکھیں جو سرخ ہو رہی تھیں اور میرا چہرہ تمتما رہا تھا۔ انہوں نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پھر فوراً بولے۔ ’’بلبل تمہیں تو شدید بخار ہے۔ بھابھی بتا رہی تھیں کہ تم صبح سے کمرے میں سو رہی ہو، وہ دو دفعہ تمہیں جگانے آئیں مگر تمہیں نیند میں دیکھ کر واپس چلی گئیں۔ آج ان کے کزن آئے تھے انہوں نے کھانا بھی خود ہی بنایا، بلبل تم ٹھیک نہیں تھی تو مجھے بتا دیتی۔‘‘

مجھے اتنی حیرت ہوئی سن کر کہ میں سارا دن سوتی رہی، پھر بھیا مجھے اٹھا کر ٹیبل پر لے گئے بھابھی نے دوپہر کے بچے ہوئے کھانے ٹیبل پر سجا رکھے تھے۔ مگر آج ان کا موڈ میرے ساتھ کچھ خراب تھا وجہ سمجھ میں نہ آئی کیوں؟ پھر رات کو چھوٹے بھیا مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے جو ہماری گلی کے نکڑ پر تھا راستے میں بھیا نے بتایا کہ ’’بھابھی ان کی شادی جوہی سے کرنا چاہتی ہیں۔‘‘ مگر بھیا جوہی سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ وہ بھابھی کی اصلیت کچھ کچھ جان گئے تھے۔ دوسرا وہ اپنی کلاس فیلو صائمہ کو چاہتے تھے اور اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ اور بھیا کے انکار پر بھابھی کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ بھابھی نے میرے حوالے سے بتایا کہ میں جوہی کو چاہتی ہوں اور اس گھر میں لانا چاہتی ہوں، میں حیران ہو گئی۔ چھوٹے بھائی نے پوچھا کہ ’’بلبل اگر تم ایسا چاہتی ہو تو میں اپنی محبت قربان کر سکتا ہوں؟‘‘

مگر میں نے بھیا سے کہا۔ ’’نہیں آپ صائمہ سے ہی شادی کریں مجھے تو خود ہی جوہی اتنی پسند نہیں۔‘‘ تو بھیا نے سکون کا سانس لیا۔ دوائی لے کر میں گھر آ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ’’چار دن تک مکمل آرام کرنا ہے۔ کیونکہ بخار اترتے اترتے تین دن لے گا اور چوتھے دن تھکاوٹ، اس کے بعد پھر بے شک سارا کام کرنا۔‘‘

بھیا نے گھر آ کر بھابھی کو بتایا تو بڑے بھیا بولے۔ ’’بلبل تم نے کیا کیا تھا جو یہ حال ہوا۔‘‘ مگر میں خاموش رہی۔

جوہی کے رشتے پر جب رات کو بات ہوئی تو چھوٹے بھیا نے سختی سے انکار کر دیا۔ دو دن بعد بڑے بھیا نے کاروبار کے سلسلے میں باہر جانا تھا۔ میں بخار سے جل رہی تھی دوا نے وقتی اثر کیا اور بھابھی نے سب کو تسلی دی کہ بلبل اب ٹھیک ہے اسے سونے دو۔ یوں میں کمرے میں اکیلی لیٹی تھی مجھے بہت بے چینی ہو رہی تھی میرا حلق سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا مگر میرے پاس کوئی نہیں تھا جو مجھے دو گھونٹ پانی کے پلا دیتا میں ہمت کر کے اٹھنے لگی تو گر گئی۔

اچانک دو ہاتھوں نے پانی کا گلاس میرے منہ کے ساتھ لگا دیا۔ میں نے غنودگی میں کچھ نہ سوچتے ہوئے پانی پیا۔ اور پھر مجھے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ’’بیٹی آرام کرو میں آپ کے پاس ہی ہوں۔‘‘

میں نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں تو وہ چہرہ مجھے اپنے بابا جانی جیسا لگا۔ میرے ہونٹوں سے بابا جانی کے نام کی سسکی نکل گئی۔ مگر اس مہربان وجود نے کہا۔ ’’بیٹا! میں تمہارا بابا جانی نہیں مگر تمہیں ان سے کم بھی نہیں چاہتا، میں پچھلے چھ ماہ سے تمہارے کمرے میں تمہارے ساتھ ہوں۔‘‘

میں حیران زدہ رہ گئی مگر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے سونے کے لئے کہا یہ ان کے ہاتھ کا اثر تھا کہ یا کچھ اور کہ میں پرسکون ہو کر نیند کی وادی میں اتر گئی۔ پھر اچانک میں جاگ گئی مگر میری آنکھیں بند تھیں۔ مجھے ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں۔

’’جوہی تم سے شادی کے لئے شہروز نے انکار

کر دیا ہے۔‘‘ بھابھی نے کہا۔ ’’جوہی نے کہا اگر اس نے صاف جواب دے دیا ہے تو تم نے مجھے اتنے خواب کیوں دکھائے؟‘‘ بھابھی بولی۔ ’’میں نے بہت کوشش کی۔‘‘

میں سن ہوتے ذہن کے ساتھ سوچتی رہی کہ اب کیا ہو گا کیونکہ دونوں کمرے سے چلی گئی تھیں اور پھر دو بج کر ابھی 40 منٹ ہوئے تھے کہ گھر میں جیسے بھونچال آ گیا ہو، جوہی کے رونے کی آوازیں اور بھابھی کی اونچی آواز میں گالیوں اور کوسنوں کی آوازیں۔ میں آرام سے لیٹی رہی کہ انہوں نے نیا ڈرامہ شروع کر دیا۔

اچانک چھوٹے بھیا کی آواز آئی۔ وہ بہت غصے میں بول رہے تھے کہ بھائی کی آواز سن کر میں باوجود اس کے کہ اٹھ نہیں سکتی تھی مگر مشکل سے اٹھی اور کمرے سے باہر آئی تو بھیا کی شرٹ پھٹی ہوئی تھی اور جوہی اور بھابھی بھیا کو گھیرے کھڑی تھیں مجھے دیکھ کر یکدم بھیا پریشان ہو گئے جب بھابھی نے نیا تیر چھوڑا۔ ’’تو ابھی جوہی سے نکاح کر اسی طرح تیری غلطی کا ازالہ ہو گا۔‘‘

بھیا میرے پاس آئے اور بولے۔ ’’بلبل تم بتاؤ تمہارے بھیا ایسا کر سکتے ہیں۔‘‘ میں نے نفی میں سر ہلایا تو بھابھی چیخ کر بولیں ...... شہروز! اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ تمہیں جوہی سے ابھی، اسی وقت نکاح کرنا ہو گا یا پھر گھر چھوڑ دو۔‘‘

بھیا بولے۔ ’’ٹھیک ہے میں آج ہی گھر چھوڑ دوں گا۔‘‘

میری جان ہی نکل گئی۔ ’’بھیا نہیں یہ گھر جتنا بڑے بھیا کا ہے اتنا ہی آپ کا ہے۔ آپ اوپر چلیں مجھے بھی اوپر لے چلیں، نیچے پورشن میں بھابھی اور شہریار بھائی رہیں، میں اور آپ اوپر شفٹ ہو جائیں گے۔ ہمارا بھابھی سے یا ان کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔

بھیا میرا اور اپنا سامان سمیٹیں ہم اوپر جا رہے ہیں۔ بھابھی اور جوہی رونا دھونا بھول کر حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ مگر اس خیال سے کہ دوسرے ہی دن ہمیں آٹے دال کا بھاؤ پتہ چل جائے گا۔ جوہی نے اشارہ بھی کیا مگر بھابھی بولی۔ ’’تم دیکھو کیسے یہ کل ہی گڑگڑا کر معافی مانگیں گے۔‘‘

یوں بھیا نے سارا سامان سمیٹا اور اوپر کے پورشن میں دوسرے کمرے میں رکھ آئے اور پھر آ کر مجھے بھی پکڑ کر لے گئے اور جاتے ہی سیڑھیوں کے دروازے کو لاک کر آئے کہ نیچے سے کوئی اوپر نہ آ سکے میں اوپر آتے ہی ہانپنے لگی تھی۔ بھیا مجھے یقین دلانے لگے کہ۔ ’’یہ سب میں نے نہیں کیا۔‘‘

میں نے بھیا کو بتایا کہ ’’دونوں نے مجھے سوتا سمجھ کر پلاننگ کی ہے مگر مجھے اس حد تک ان کے گرنے کی امید نہیں تھی۔‘‘

بھیا بہت پریشان تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولے۔ ’’میری جیب میں صرف دو سو روپے ہیں۔ جس سے صرف آج کا کھانے پینے کا سامان آ سکتا ہے۔ پھر کیا کرنا ہے۔

میں نے بھیا سے فیس کے پیسے مانگے تھے تو انہوں نے کہا آج بینک بند ہے کل میں نیویارک چلا جاؤں گا۔ تم اپنی بھابھی سے لے لینا۔ بھابھی سے کل کہا تو انہوں نے کہا بینک سے نکلوانے پڑیں گے۔ ٹائم ہو گا تو لے آؤں گی دو تین دن میں بلبل ٹھیک ہو گی تو گھر سے نکلوں گی ویسے کیسے جا سکتی ہوں۔ اور پرسوں میری فیس کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔ میں نے پہلے ہی پریشان تھا کہ بھابھی پیسے دینے کے موڈ میں پہلے ہی نہیں تھیں اور میرے میڈیکل کے بھی ابھی دو سال پڑے ہیں، میں سوچ رہا ہوں کہ تعلیم چھوڑ دوں کم از کم گھر کا آٹا دال تو چلے۔‘‘

میں سن کر پریشان ہو گئی مگر اچانک میرے ذہن میں ابو جی کی پنشن کا خیال آیا جو میرے نام پر بینک میں جمع ہو رہی تھی، اتنی تو ہو چکی ہو گی کہ ہم دو کے بجائے چار سال بیٹھ کر کھا سکیں۔ میں نے بھیا سے کہا۔ ’’بھیا

پیسوں کی فکر نہ کریں۔ پانچ بجے تک بینک کا ٹائم ہے۔ آپ میرے بیگ سے چیک بک نکال لائیں۔ میں ابھی چیک کاٹ دیتی ہوں۔ جس میں آپ اپنی فیس کل ہی پے کردیں۔ اور گھر کا سامان وغیرہ لے آئیں۔"

بھائی حیران رہ گئے اور بولے۔ "مجھے تو یاد بھی نہیں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر جاب نہ ملی تو کہیں مجھے بھابھی کے آگے جھکنا نہ پڑے۔ مگر تم نے مسئلہ حل کردیا۔ غالباً بھابھی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں ہے یا انہیں ابھی پتہ نہیں اللہ تعالیٰ اگر ایک در بند کرتا ہے تو دوسرا کھول دیتا ہے۔" بھیا چیک بک لے آئے میں نے دستخط کرے اور چیک بھیا کے ہاتھ میں دے دیا اور خود آرام کرنے کے لئے لیٹ گئی، بھیا باہر کے دروازے سے چلے گئے۔ میں نے کہا۔ "باہر تالا لگا جائیں مجھ سے نیچے نہیں جایا جائے گا۔"

اوپر کے پورشن کے دو دروازے تھے ایک باہر گلی میں کھلتا تھا اور ایک گھر کے اندر، میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ ہماری مشکلات حل ہوجائیں، اس دوران میری آنکھ لگ گئی پانچ بجے کھٹکے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ بھیا کچن میں سامان رکھ رہے تھے مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ "بلبل میں سارا سامان لے آیا ہوں تم چیک کرلو، اگر کچھ اور لانا ہے تو بتاؤ۔" میرا بخار اتر چکا تھا مگر ابھی نقاہت باقی تھی۔ جس کی وجہ سے میں زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ بھیا نے مجھے دوا دی اور خود چائے بنا کر لے آئے۔ میں پریشان ہوگئی، میرے ہوتے ہوئے بھیا نے خود چائے بنائی مگر بھیا ہنسنے لگے اور بولے، "اپنی بلبل سے ابھی اتنا کام تو نہیں لینا۔"

میں رات میں گہری نیند سو رہی تھی جب مجھے شدید پیاس لگی۔ میں اٹھ بیٹھی ور پانی کی چاہ میں گلاس کو دیکھا کہ ایکدم گلاس جیسے کسی نے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے پانی پی کر جب دیکھا تو ایکدم میرے ذہن میں کل رات پانی مانگنے اور پھر پلانے والی بات آگئی۔ میں نے بابا کو دیکھا تو وہ بولے۔ "آج صبح سے میں اپنے قبیلے میں گیا ہوا تھا واپس آیا تو تمہارا کمرہ

بھائیں بھائیں کررہا تھا۔ میں پریشان ہوگیا تھا، تمہار[ی]
بھابھی کے کمرے میں گیا تو وہ اپنی کزن کے ساتھ ل[...]
شہروز کے ساتھ کیے گئے ڈرامے پر خوش ہورہی تھی او[ر]
جوہی کہہ رہی تھی۔ "آپا آپکو یقین ہے دو دن میں وہ خو[د]
ہی آپ کے پاس آئیں گے۔" تمہاری بھابھی کہہ رہ[ی]
تھی۔ "یار واپس نہیں آئیں گے تو کیا ہوا کھائیں گے۔
شہروز کے پاس وہی پانچ سو روپے تھے جو فیس مانگنے [...]
تمہارے بھائی نے دیئے تھے جب یہ رقم خرچ ہوجا[ئے]
گی تو اس کے بعد کیا ہوا کھائیں گے اور ویسے بھی کل
اس کی فیس کی آخری ڈیٹ ہے، آٹھ دن پہلے مانگ [...]
تو شہریار نے دے دیتی تھی اچھا ہوا۔ اب یہ ہمارے ح[ق]
میں بہتر ہے۔ اب دیکھوں گی بیمار بہن اور خود کو کیس[ے]
سنبھالتا ہے، شہزادے صاحب کل تک میرے پاؤ[ں]
میں پڑے ہوں گے اس لئے میں نے شہریار کو کچھ نہیں
بتایا ابھی کہ کل رات سے پہلے تمہارا نکاح نہ کروایا تو م[...]
نام ناہید نہیں اور پھر وہ مفت کی نوکرانی، دو دن میں بد[...]
کھانے کھا کھا کر منہ کا ذائقہ خراب ہوگا۔" یہ دیکھ کر [...]
جلدی سے اوپر آیا مگر تمہاری طبیعت دیکھ کر مجھے سکو[ن]
ہوا اور شہروز کا اطمینان دیکھ کر میں خوش ہوگیا۔ ورنہ [...]
آج ہی کچھ کرتا کہ تمہیں فکروں سے نجات مل جائے۔"

اس کے ساتھ بابا نے اپنی جیب سے ہ[...]
ہزار کے نوٹوں کی گڈی نکال کر میرے سامنے رکھ دی
میں نے کہا۔ "نہیں بابا مجھے ان کی ضرورت نہیں۔" [...]
بولے۔ "یہ تمہارا حصہ ہے جس پر ناہید قبضہ کئے بیٹھ[ی]
تھی۔ تم اب دیکھنا کہ میں اس عورت کا کرتا کیا ہوں
میں چھ ماہ سے دیکھ رہا ہوں تمہیں اس گھر میں نوکروں
طرح کام کرتے مگر بولا اس لئے نہیں تھا کہ تم خوشی خو[شی]
سب کر رہی تھیں۔ اب تم ٹھیک ہوجاؤ تو کالج [...]
شروع کرو، دوبارہ سے اپنا تعلیمی کیرئیر اسٹارٹ کرو، [...]
اللہ مالک ہے، میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "بابا آپ کہہ رہے ہیں آ[پ]
چھ ماہ سے میرے ساتھ ہیں بتائیں گے کہ کیسے؟

بابا ہنسنے لگے اور بولے۔ میرا تعلق قوم جنا[ت]

سے ہے۔ "میں تمہارے گھر کے باہر کیکر کے درخت پر کبھی کبھی آتے جاتے ایک دو گھنٹے کے لئے بیٹھ جاتا تھا۔ وہ بھی ایک خوبصورت دن تھا جب میں وہاں آ کر بیٹھا کہ مجھے تمہارے گھر سے خوشبودار پکوانوں کی خوشبو آئی دل میں سوچا کہ بھوک بھی لگی ہوئی ہے کیوں ناں کچن میں چلا جاؤں۔ میں کچن میں پہنچا تو ایک پیاری سی بچی کو کھانے بنانے میں ہلکان ہوتے دیکھا۔ میں حیران رہ گیا مگر بھوک بہت لگی ہوئی تھی اس لئے جیسے ہی بچی باہر گئی، میں کھانے سے انصاف کرنے لگا، اور پھر مجھے اس بچی پر پیار آنے لگا، میری اپنی کوئی اولاد نہیں اس لئے پیارے پیارے بچوں کو دیکھ کر میرے دل میں ان کے لئے محبت جاگ اٹھتی ہے اور پھر تم تو سب کی آنکھوں کا تارا تھی، پہلے تو میں نے دو تین دن بعد تمہیں دیکھنے کے لئے آنے لگا مگر پھر مستقل تمہارے گھر میں رہنے کا ٹھکانا کرلیا۔ میں تمہارے گھر کے اسٹور روم میں رات کو آ کر سو جاتا۔ اور صبح اپنے کام سے چلا جاتا، تمہارے گھر میں چلنے والے ڈرامے سے بے خبر تھا۔ اب جب تمہاری طبیعت خراب ہوئی تو میں نے تمہارے ساتھ دو دن گزارے تو مجھے تمہاری بھابھی کی دوہری چال سمجھ میں آئی، وہ ایک طرف تو تم سے کام کرواتی دوسری طرف تم سے محبت کا اظہار کرکے سب کی نظر میں اچھی بنتی، ابھی میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے ضروری کام سے جانا پڑا اور واپسی پر یہ سب دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔"

میں نے کہا۔ "مگر بابا یہ اچھی بات نہیں۔"

تو بابا نے مجھے بتایا کہ "یہ پیسے وہ جوہی کو دے کر شہروز کا نام لگانا چاہتی تھی اس لئے میں نے تم تک پہنچا دیئے۔"

میں حیران رہ گئی پھر بابا مجھ سے کہنے لگے۔ "تم اب سو جاؤ چند گھنٹے تک تم بالکل ٹھیک ہوجاؤ گی۔"

میں بابا سے بولی۔ "آپ کے بارے میں شہروز بھائی کو بتا دوں ورنہ وہ پریشان ہوں گے۔"

بابا بولے۔ "صبح بتا دینا۔"

صبح ہوئی تو میں نے بھیا سے کہا۔ "بھیا مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" بھیا میرے پاس بیٹھ گئے میں نے تکیہ کے نیچے سے نوٹوں کی گڈی نکال کر بھیا کو دی۔ وہ حیران رہ گئے اور کہنے لگے۔ "بلبل! فیس تو میرے پاس ہے اور باقی پیسے میں نے تمہارے پاس رکھوائے تھے مگر وہ اتنے نہیں تھے، یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "بھیا سب سے پہلے آپ آج ایک موٹر سائیکل خرید لیں۔ اس کے بعد آپ اپنی فیس جمع کروائیں گے اور بعد میں آپ باقی سودا سلف لے کر گھر آئیں گے پورے مہینے کا راشن لے آئیں۔"

بھیا نے کہا۔ "مجھے اب بھی ان پیسوں کی سمجھ نہیں آئی۔" میں نے بھیا کو بابا کی ساری کہانی الف سے یے تک سنا دی تو بھیا بولے۔ "بلبل کیا یہ ممکن ہے؟" تو میں نے بابا کو آواز دی اور بابا کمرے میں آگئے۔ تو بھیا حیران رہ گئے پھر بابا نے بھیا کو بتایا تو "بھیا بہت خوش ہوئے اور بابا کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ "بابا اب مجھے بلبل کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں، اوپر اللہ تعالیٰ اور نیچے آپ ہیں، اس کی حفاظت کے لیے، اب ہم گھر کے تین افراد ہوگئے۔"

بھابھی کے گھر سے آئے دن رقم چوری ہوجاتی جو وہ بینک سے لاتیں دو تین سو سے زیادہ ان کے پرس میں کچھ نہ ہوتا کبھی وہ جوہی پر الزام لگاتیں، کبھی اپنے گھر میں آئے کزن میں سے کسی پر، ان کے ایسے الزامات سے ان لوگوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ اب بھابھی اکیلی رہ گئی تھیں، اب انہیں غم ستانے لگا تھا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ ایک دن میں نے بابا سے کہا۔ "بابا آئندہ بھابھی کے گھر سے رقم نہ لائیں۔" بابا ہنس کر بولے۔ "اس کا اکاؤنٹ خالی ہوگیا۔ بینک میں صرف چند سو روپے ہیں۔"

انہی دنوں بڑے بھیا کے پاس چھوٹے بھیا کا فون آیا، بڑے بھیا نے بھی چھوٹے بھیا کو بہت سنائی اور میرے بار میں بھی بہت کچھ کہا کہ جان دینے والی بھابھی کی قدر نہیں کی اور ساتھ ہی ہم سے لاتعلقی کا

اعلان کردیا۔

ہم حیران تھے کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد اب انہیں رابطے کا خیال آیا۔ تو بعد میں بابا نے بتایا کہ ”جب شہریار بار بار تم دونوں سے بات کرنے کی ضد کررہا تھا تو ناہید نے ایسی اسٹوری سنائی کہ وہ تم دونوں سے بددل ہوگیا۔“ اور پھر بابا نے بتایا کہ۔ ”ناہید کو اس کے میکے والوں نے عید پر تحفے تحائف نہ دینے پر خوب سنائی اور عید کی شام کو اس سے لڑ جھگڑ کر اس کی بھابھیوں نے اس کو گھر سے نکال دیا۔“

پھر میں نے چھوٹے بھیا سے شادی کے لئے زور دینا شروع کردیا۔ بابا نے بھی کہا کہ ”پڑھائی تو ہوتی رہے گی تم شادی کرلو۔“

لڑکی والے شہروز بھیا کو پہلے ہی پسند کرتے تھے یوں انکار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے رشتہ منظور کرلیا مگر شادی جلد کرنے پر وہ رضا مند نہیں تھے۔ مگر میں نے زور دے کر انہیں منالیا۔ یوں ایک ماہ کے اندر ہی صائمہ دلہن بن کر ہمارے گھر آگئی۔

بھیا کی شادی پر ان کے دوست رحمان نے پتہ نہیں کب مجھے پسند کرلیا، اور پھر بھیا کی شادی کو ابھی آٹھ دن ہی ہوئے تھے جب وہ لوگ رشتہ لے کر آگئے اور بابا کے مشورے پر بھیا نے رشتہ قبول کرلیا اور جتنی جلدی میں نے بھیا کی شادی کی، اس سے بھی زیادہ جلدی یعنی جٹ منگنی پٹ بیاہ، رحمان کے گھر والوں نے کی اور میں دلہن بن کر رحمان کے گھر آگئی یہاں میرا بہت شاندار استقبال کیا گیا، یہاں مجھے محبت اور چاہت بے حساب ملی جلدی اس لئے ہوئی کہ رحمان کی دبئی میں جاب تھی اور وہ چھٹی پر آئے تھے۔ یوں شادی کے دو ہفتہ بعد میں روتی دھوتی رحمان کے ساتھ دبئی چلی گئی۔

مگر بابا سے وعدہ لیا کہ وہ ہفتے میں نہیں تو ایک ماہ میں ایک بار مجھے ضرور ملیں گے۔ بابا نے وعدہ کرلیا۔ اور یوں بابا نے صائمہ اور بھیا سے بھی اجازت چاہی کہ وہ اب کام کے سلسلے میں زیادہ گھر پر نہیں رہیں گے، بھیا کے اصرار پر انہوں نے کہا۔ ”کبھی کبھی آسکوں گا۔“ یوں بھابھی اور بھیا خوش خوش رہنے لگے۔

مجھے دبئی آئے ہفتہ ہوا تھا جب بابا آئے میں نے بابا کے بارے میں رحمان کو بتادیا تھا۔ یوں انہوں نے کوئی اعتراض کئے بغیر خوشی سے بابا سے ملاقات کی۔

یوں ہوتے ہوتے چھ ماہ گزر گئے جب ایک دن بابا نے بتایا کہ بڑے بھیا جب پاکستان پہنچے تو پہلے تو انہیں ہم پر بڑا غصہ آیا کہ چھوٹے بھیا نے نہ صرف اپنی شادی بلکہ میری شادی بھی کروادی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ انہیں ناہید کے پھوہڑپن اور بدسلیقگی کا پتہ چلا اور ان کے ڈراموں کا۔ کیونکہ ناہید کو کچن سے الرجی تھی گھر کی صفائی وغیرہ سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ سب بابا کی وجہ سے ان کی نظروں میں آیا اور پھر بابا نے انہیں ناہید اور جوہی کا ڈرامہ بتایا تو بھیا حیران رہ گئے۔ پھر وہ تو ناہید بھابھی کو طلاق دینا چاہتے تھے مگر بابا نے روک دیا، اور میری قسم دی جس کے بعد وہ رک گئے مگر اسی شام شہریار بھیا اور بھابھی نے شہروز بھیا کے پاس جاکر معافی مانگی اور مجھے بھی فون کرکے معذرت کی، اور میں نے حسب حال درگزر کردیا۔

سال گزرتے دیر نہ لگی، ایک ماہ کی چھٹی پر رحمان پاکستان آگئے، دیار غیر میں مجھے اپنوں کی یاد بہت ستاتی رہی، جب میں پاکستان آئی تو میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔

تیسرے دن میرے دونوں بھائی اور بھابھیاں اچانک میرے گھر آوارد ہوئیں یہ ان کی طرف سے سرپرائز تھا میرے لئے مگر انہیں کیا پتا۔ دو دن پہلے ہی بابا نے مجھے ان کے آنے کا بتا چکے تھے۔ اس لئے میں نے اور رحمان نے ان کے استقبال کی بھرپور تیاریاں کی تھیں، ساتھ ہی بابا کو بھی آنے کا کہا۔ جنہوں نے انجان اور اجنبی ہوتے ہوئے ہماری اتنی مدد کی کہ ہمارا گھر ٹوٹنے سے بچ گیا اور ایک دفعہ پھر میرے دونوں بھائی آپس میں پیار محبت سے رہنے لگے۔

کمرے کا آسیب

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

کمرے میں اچانک روح کی آواز سنائی دی، نہیں میں کہیں نہیں جاسکتا، یہی تو ایک جگہ ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کے خوشگوار لمحات گزارے تھے مجھے اپنے جسم سے بھی نفرت ہے اسے میں تابوت میں چھوڑ آیا ہوں۔

قدم قدم پر خوف وہراس پھیلاتی اور اچنبھے میں ڈالتی بہت ہی پراسرار کہانی

دنیا کی سیروسیاحت کے بعد میری خواہش تھی کہ لندن میں رہائش اختیار کرلوں لیکن ایک عمدہ مکان کی تلاش ایک مسئلے کی شکل میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ اتفاقاً ایک شام جب کہ میں کسی کام کی وجہ سے نکلا تھا میری نگاہ ایک ایسے مکان پر پڑی جس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو میں چاہتا تھا۔ وہ ایک قدیم طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ میں مضبوط دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تو مجھے سکون کا احساس ہوا۔ کیونکہ سڑک کا شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ آگے بڑھ کر میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔

ذرا ہی دیر میں ایک سن رسیدہ آدمی اندر سے نکلا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

”میں اس مکان کو کرائے پر لینا چاہتا ہوں۔“ اسے دیکھتے ہی بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ اسی لمحے

اس کی بیوی بھی وہاں آ گئی۔
"یہ صاحب مکان کرائے پر لینا چاہتے ہیں۔"
"حیرت ہے......" وہ عورت مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "میں نے مکان کو کرائے پر دینے کی بات کسی ایجنٹ سے نہیں کی تھی۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ میرا خیال تھا کہ مکان کو کرائے پر دے دوں اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اندر تشریف لائیں۔"

میں اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہوا۔ اس نے مجھے سارا مکان دکھایا۔
"پرسکون جگہ ہے۔" میں نے بے اختیار کہا۔
"آپ نے اسے پسند کیا...... شکریہ" عورت نے کہا اور میں نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ شرائط اگر ذرا بھی موزوں ہوئیں تو اس مکان کو لے لوں گا۔ مگر میں نے اس سے ایک سوال کردیا۔
"میڈم! آپ اسے چھوڑنا کیوں چاہتی ہیں؟"
یہ سنتے ہی وہ کچھ پریشان ہوگئی لیکن جلد ہی اس نے جواب دیا۔
"بات یہ ہے کہ یہاں کوئی ملازم نہیں ٹھہرتا، میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ ملازموں کے عقبی کمرے میں پراسرار آوازیں آتی ہیں اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے سے کوئی گزرا ہے۔ اس وجہ سے وہ خوفزدہ ہوکر یہاں سے بھاگ جاتے ہیں اور اب یہ آوازیں دو کمروں میں بھی سنائی دیتی ہیں۔"
چند لمحے رکنے کے بعد وہ پھر بولی۔
"ہمیں یہاں رہائش اختیار کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ میرے شوہر پچھلے سال اپنے چچا کے مرنے کے بعد یہاں آئے ہیں۔"
بہرکیف ایک گھنٹے کے اندر اندر تمام شرائط طے ہوگئیں اور وہ دن بھی آ گیا جب خالی مکان میرے سپرد کردیا گیا۔ غبار آلود کمروں کے متعلق میں نے آرائش کرنے والوں کو بتا دیا تھا کہ کس کمرے سے کون سا مصرف لیا جائے گا لیکن ایک کمرہ ایسا تھا جسے میں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور یہ زیریں منزل سے زینے کچھ فاصلے پر تھا۔
رات کے 10 بجے میں اپنے سیکریٹری سمیت مکان میں داخل ہوا۔
چاروں طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا پھر اس تار میں۔ ٹٹول کر ہم آرائش کرنے والوں کی سیڑھی کے سے گزرے اور اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ نیچے سڑک آنے جانے والوں کا شور اس وقت یوں محسوس ہور جیسے ساحل سے ٹکرانے والی لہروں کا مترنم شور......
لیمپ میرے سرہانے پر پڑا تھا۔ کچھ دیر مطا کے بعد بٹن آف کردیا اور پھر میں سونے کے لئے لی گیا۔ دفعتاً مکان کی زیریں منزل سے ایک عجیب آ ابھری...... میں چونک پڑا۔ اسی لمحے کسی کمر دروازہ کھلا اور بند ہوگیا۔ میرا خیال فوراً ان بند در کی جانب گیا جنہیں ہم نے بند کیا تھا۔ یقیناً یہ ہ نتیجہ ہے۔" میں نے سوچا لیکن فوراً ہی یاد آیا کہ ر بے حد پرسکون ہے اور باغ سے گزرتے وقت میں دیکھا تھا کہ وہاں ایک پتہ بھی متحرک نہیں تھا۔
چند لمحوں بعد میرے کانوں نے دوبارہ آواز سنی اور میں ہوشیار ہوگیا۔ اب جو کچھ میں سن اس میں شک وشبہ کی گنجائش بہت کم تھی۔ نیچے ز کوئی بھاری بھاری قدموں سے چل رہا تھا۔ آواز رفتہ قریب آتی جارہی تھی۔ اور میرا دل زور زور دھڑکنے لگا تھا۔ چاہتا تھا کہ بٹن دبا کر روشنی کرلو ہمت نہیں ہورہی تھی۔ زینے پر آہٹ ہوئی اور چراچراہٹ! مجھے فوراً یاد آ گیا کہ زینے کا ایک تختہ ہے اور یہ اس جگہ کی تھی جہاں سے زینہ میرے کمر طرف مڑتا ہے۔ وہ پراسرار قدم میرے کمر جانب بڑھ رہے تھے اور صاف ظاہر تھا کہ چلنے خاص عجلت، میں نہیں ہے۔ قدموں کی آواز قریب گئی اور پھر وہ پراسرار قدم میرے دروازے کے آ کر رک گئے یا ختم ہوگئے۔

بے چینی اور اضطراب کے عالم میں انسان کا ذہن عجیب وغریب طریقے پر کام کرتا ہے۔ مجھے یقین تھا وہ بھاری چٹخنی میں نے چڑھا رکھی ہے، جو کسی دباؤ یا زور کو کسی حد تک روک سکتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس پراسرار وجود کے شانے بہت چوڑے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے وہ نقاب چڑھائے ہوئے ہو...... اس قسم کے سینکڑوں خیالات میرے ذہن میں گردش کررہے تھے۔ میں فوراً اٹھا اور آتش دان سے لوہے کی وزنی سلاخ نکال کر ہاتھ میں تھام لی اور دوسرا ہاتھ بجلی کے بٹن پر رکھ کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔
انتظار...... طویل انتظار! لمحات سرکتے رہے۔
پھر اسی لمحے میرے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ ہونے لگی جیسے کوئی ہستی اپنی انگلی کے جوڑ کی ہڈی سے ضرب لگاتا ہو...... خوف اور دہشت کی شدید لہر میرے رگ وپے میں اترتی چلی گئی۔ اور جسم کا رواں رواں کھڑا ہوگیا اور دل میں اس پراسرار ہستی کا خوف جاگزیں ہوگیا۔ ایک مرتبہ پھر وہی رگوں میں خون منجمد کردینے والی آواز پیدا ہوئی۔
"کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ"
غیرارادی طور پر میری انگلی نے بٹن پر دباؤ ڈال دیا تو فوراً روشنی پھیل گئی۔ اور میں نے دروازے کی چٹخنی گرا کر دروازہ کھول دیا...... لیکن میرے سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے رات کی ہولناک تاریکی کے!
میں نے اطمینان کا سانس لیا۔
دن کی روشنی میں ہنسنا آسان ہے۔ پرکنس نے غیر معمولی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "لیکن میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔ کیونکہ اگر میں ایک رات بھی یہاں اور رہا تو خوف سے میرا ہارٹ فیل ہوجائے گا۔"
"کیوں؟ کیا تم نے بھی آوازیں سنی تھیں؟ دستک کی آوازیں۔"
"جی ہاں......" پرکنس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔
"خیر...... اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میں نے اس سے رائے طلب کی۔
"مکان کو فوراً چھوڑ دیا جائے۔ قفل لگا کر کنجی مالک مکان کو دے دیجئے کیونکہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔"
"نہیں۔ میں یہیں رہوں گا اور ساتھ تمہیں بھی رہنا ہوگا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
اس رات ہم دس بجے کے قریب آئے اور آتش دان کے پاس بیٹھ گئے۔ ٹھیک رات کے ایک بجے جب کہ ہم پر غنودگی طاری تھی، وہی پراسرار آواز دوبارہ سنائی دی۔ یہ کسی کے قدموں کی آواز تھی۔ اور قریب سے قریب تر آتی جارہی تھی حتیٰ کہ وہ دروازے کے قریب آ کر رک گئی۔ چند ساعت اور اس پراسرار ہستی نے جو ہمارے اعصاب پر چھائی ہوئی تھی اپنی غیر مرئی انگلیوں سے دستک دی۔ "......کھٹ...... کھٹ...... کھٹ؟"
وہی اعصاب شکن دستک کی آواز!
اسی لمحے بجلی کا بلب خود بخود روشن ہوگیا۔
"اوہ! مائی گاڈ......! یہ بھوت ہرگز نہیں۔" میری سانس اوپر کی اوپر رہ گئی۔ کیونکہ ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا جس نے میری رگوں میں خون سرد کردیا۔
میں دروازے کے پاس کھڑا تھا کہ میرے سر کے قریب ہی تین یا چار انچ کے فاصلے پر وہی کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ہونے لگی۔ اس مرتبہ یہ خوفناک اور لرزہ خیز آواز پہلے سے کہیں زیادہ واضح اور صاف تھی۔
ایک جست میں، میں کمرے میں آیا، دروازہ بند کیا۔ چٹخنی چڑھائی اور خوف وہراس سے کانپتا ہوا۔ بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر رات آنکھوں میں کٹ گئی۔
صبح ہوئی تو مجھ میں ہمت پیدا ہوئی۔
میں نے کھڑکی کھولی، سڑک پر زندگی رواں دواں تھی۔ میں نے کپڑے پہنے اور چبوترے پر چلا گیا۔ میری نظر ڈھیلے تختے پر پڑی اور رات کے واقعات ذہن میں تازہ ہوگئے۔ میں ایک لمحہ کے لئے لرز گیا مگر یہ خوف عارضی تھا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے میں ہنس

پڑا...... اپنی کمزوری اور واہمے پر!

عین اسی لمحے سیکریٹری کمرے سے باہر نکلا۔

"کیوں پرکنس، رات کیسی گزری؟"

"کیا آپ سو چکے تھے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"میں خواہ مخواہ توہمات کا شکار ہوگیا تھا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مجھے وہم ہوگیا تھا کہ زینے پر کوئی چڑھ رہا ہے اور کمرے کے کواڑ پر دستک دے رہا ہے۔"

پرکنس خوفزدگی کے عالم میں تھا۔ خیر جیسے تیسے دن گزر گیا، رات آئی۔ ہم دونوں آتشدان کے پاس بیٹھے تھے کہ اچانک کمرے سے باہر کسی کے قدموں کی آوز سنائی دی۔

پھر کسی تاخیر کے بغیر ہم دونوں نے آتشدان سے ایک ایک سلاخ اٹھائی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

سکوت......! موت کا سا پراسرار سکوت، چپہ چپہ پر حکمران تھا۔ جب میں زینے پر پہنچا تو بولا۔ "پرکنس! ہال کا بلب کس نے روشن کیا؟"

"معلوم نہیں......" پرکنس کے لہجے سے اب بھی خوف کا اظہار ہورہا تھا۔

"آؤ...... اسے بجھا دیں۔" میں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ اور پھر ہم آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے...... یہاں تک کہ زینے کی آخری سیڑھی تک آگئے...... ہمارے بائیں جانب ڈرائنگ روم تھا جس کے دروازے کھلے ہوئے تھے ہم نے دیکھا کہ کمرے کے اندر پیتل کے برقی بٹن چمک رہے ہیں لیکن پھر ایک حیرت انگیز بات ظہور میں آئی...... ہماری آنکھوں کے سامنے ہی بٹن یکے بعد دیگرے دبنے لگے اور روشنی پھیل گئی...... پھر روشن کمرے میں ایک نہایت عجیب شیطانی قہقہے کی آواز گونجی جس کی بازگشت کئی لمحوں تک چکراتی رہی...... ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور دہشت سے جسم میں لرزش پیدا ہوگئی۔

آواز لحہ بہ لحہ قریب آنے لگی اور پھر ہم اپنے اپنے کمروں کی طرف دوڑ پڑے۔ دوسری رات ہوٹل سے کھانا کھانے کے بعد میں نے پرکنس سے پوچھا۔

"تم نے کیا تدبیر سوچی ہے؟" تو پرکنس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔ "میں نے ایک خوفناک کتا منگوا لیا ہے اور میں یقین سے کہہ دیتا ہوں کہ اگر وہ پراسرار ہستی انسان ہوئی تو اس کی خیر نہیں۔"

"مگر پرکنس!" میں نے کہا۔ "فرض کرو اگر وہ بھوت نکلا۔"

"میں نے کہیں پڑھا ہے کہ بھوت روشنی میں نمودار نہیں ہوتے۔"

"لیکن تم ان پراسرار قدموں کے بارے میں کیا کہو گے جو بالکل زینے کے نزدیک آگئے تھے۔"

"ہاں یہ بات الجھن کا باعث ہے۔ کیونکہ آواز واضح تھی۔ میں نے سنا ہے کہ یہ بالکل محسوس نہیں ہوتے اور فضا میں پرواز کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھوت ہرگز نہیں انسان ہی ہے جو ہمیں کسی نہ کسی سبب سے اس جگہ سے بھگانا چاہتا ہے۔"

"تو گویا تم اسے پکڑنے کے لئے وہ خونخوار کتا لائے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا......

"تمہاری ترکیب یہی ہے نا کہ آج رات وہ بدمعاش یہاں آئے تو تمہارا کتا اسے اپنے خونخوار جبڑوں میں جکڑ لے۔"

پرکنس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ وہ اپنی ترکیب پر مطمئن نظر آرہا تھا۔ مگر مجھے اس کی ترکیب پر اطمینان نہیں تھا...... نجانے کیوں؟

جب وہ کتا مکان میں داخل ہوا تو خوشی سے ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم اسے یہ دیکھنے کے لئے نچلی منزل میں لے گئے کہ دروازے بند ہیں یا نہیں؟ کتا ہر کمرے میں ناک سکیڑ کر، بھونکتا تھا۔ یقیناً اسے بلیوں اور چوہوں کی مہک محسوس ہورہی تھی۔ لیکن ایک جگہ اس نے پرکنس کو حیران کردیا۔ جب ہم صحن وغیرہ سے ہوکر آئے تو چھوٹے کمرے کی چوکھٹ کے پاس پہنچے جس کو آرائش کرنے والوں نے چھوا تک نہ

تھا۔ اندر داخل ہوکر پرکنس نے دیا سلائی جلائی مگر کتا دہلیز کے پاس ہی رک گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس کے جسم کے بال کانٹوں کی مانند کھڑے ہوگئے تھے۔ دیا سلائی بجھ گئی۔ چاند کی مدہم روشنی میں ہم نے دیکھا کہ کتے کی آنکھیں معمول سے بڑی ہوگئی ہیں۔ ہم دونوں واپس آئے۔ کتا بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اب بھی لرز رہا تھا۔

کچھ دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اچانک پرکنس نے میرا بازو ہلا کر کہا۔

"یہ آواز کیسی تھی؟"

مگر میں نے کچھ نہ سنا تھا۔ کتا بھی ایک دم سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے زیریں منزل سے کسی کے قدموں کی خوفناک آواز آئی...... میں نے نہایت غور سے سنا کہ قدم پہلے کھانے کے کمرے کی جانب اور پھر زینے کے قریب پہنچ کر رک گئے...... چند لمحوں بعد...... ان کا رخ اوپر کی سمت ہوگیا۔

پرکنس کا چہرہ خوف کی وجہ سے سفید تھا۔ یکا یک دروازے پر کسی نے زور سے ٹھوکر ماری اور نہایت کریہہ آواز میں کہا گیا۔

"اس گھر میں کیا ہنگامہ برپا ہے؟"

ساتھ ہی چٹخنی ٹوٹ گئی اور دروازہ کھل گیا ہماری نگاہوں کے سامنے ایک پولیس مین کھڑا ہوا تھا۔

"اس گھر میں کیا ہورہا ہے؟" پولیس مین نے سخت لہجے میں کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔ ابھی پانچ منٹ پیشتر تم لوگوں میں سے کسی نے عقبی دروازہ بند کرکے قفل چڑھا دیا۔ پہلے چکر میں ادھر ادھر سے گزرتے ہوئے میں نے چیک کیا کہ تم میں سے کسی نے چٹخنی کھول کر دروازہ کھولا...... اور جب صحن میں داخل ہوا تو دیکھا کہ گزرگاہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور تمام بلب روشن ہیں۔ اس وقت ایک خالی گھر میں تم لوگ کیا کررہے ہو۔ آخر ماجرا کیا ہے؟"

مجھے یقین تھا کہ اس وقت روحانی کرشموں کا ذکر فضول ہے۔ چنانچہ میں نے نرم لہجہ میں کہا۔

"محترم! ہم نے ہرگز غفلت نہیں کی ہم احتیاط سے دروازے کی چٹخنی بند کرچکے تھے۔ یہ دوبارہ کیسے کھلی...... ہمیں نہیں معلوم۔"

"ہمیں یہاں کے چپے چپے کی تلاشی لینی ہوگی میرے خیال میں یہاں ضرور کوئی چھپا ہوا ہے۔"

پولیس مین کے کہنے پر ہم نے چھت سے تہ خانوں تک ہر جگہ دیکھی۔ کتا بھی ہمارے ساتھ تھا۔ پولیس مین نے ہر چیز پر تیز نگاہ ڈالی، کتا ہمارے ساتھ اس کمرے میں نہ گیا جس میں ایک دفعہ پہلے وہ خوفزدہ ہوچکا تھا۔ پولیس مین نے چند باتیں اپنی ڈائری میں نوٹ کیں اور چلا گیا۔ اسے رخصت کرنے کے بعد ہم اپنے اپنے بستر پر دراز ہوچکے تھے۔

پولیس مین کے معائنے کے بعد ایک ہفتہ آرام سے گزرا کیونکہ کوئی پراسرار واقعہ ظاہر نہیں ہوا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ جب ہم آتشدان کے گرد بیٹھ کر قہوہ سے شغل کرنے لگے تو اسی لمحے بلوریں پیالے سے کھٹ کھٹ کی آوازیں نکلنے لگیں۔

میرے ایک دوست نے یہ سن کر مشورہ دیا کہ ہمیں ایک میز کے گرد بیٹھ کر بھوت سے اپنے نام کے ہجے کرانے چاہیے۔

میں نے اس کے مشورے کو قبول کرلیا اور ایک سادہ کاغذ اور پنسل لے کر بلند آواز سے کہا۔ "میں الف سے لے کر ی تک تمام حروف پڑھتا ہوں۔ براہ کرم آپ جس حرف پر ٹھہرنا چاہیں تو دستک دے دیں مثلاً اگر آپ کا نام ج سے شروع ہوتا ہے تو آپ دوسرے حرف پر دستک دے دیں آخر میں تمام حروف پڑھ کر سناؤں گا۔ اگر بالکل درست ہوں تو تین بار دستک دیں۔ اگر غلط ہوں تو صرف ایک بار؟"

پھر اس طریقے سے جو پیغام ہم تک پہنچا وہ یہ تھا۔

"میں کارل کلنٹ تھا۔ ایک سو بیس سال پیشتر میں یہاں رہتا تھا۔ اگر زیریں منزل کے کمرے خالی کردو تو تمہیں مزید باتیں معلوم ہوں گی۔"

ہم فوراً زیریں منزل کے اس کمرے میں گئے جہاں پرکنس کا کتا خوفزدہ ہوگیا تھا۔ اس کمرے میں بجلی کا انتظام نہ تھا اس لئے میں نے موم بتی روشن کی اور مینٹل پیس پر رکھ دی۔ ابھی ہمیں کرسیوں پر بیٹھے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ کھٹ کھٹ کی آوازیں سنائی دینے لگیں مگر اس دفعہ آواز پہلے سے تیز اور دیوار کے وسط میں سے نکلتی محسوس ہورہی تھی اور اس مرتبہ پیغام یہ تھا۔

''میں ہوں کارل کلنٹ...... ایک زمانے میں، میں اس گھر کا مالک تھا اور پہلے میں نے لیڈل کو قتل کرکے دفن کیا تھا۔''

''لیڈل کون......؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''آرتھر لیڈل۔''

''کیا آپ کسی قسم کی مدد چاہتے ہیں؟''

''نہیں......'' جواب دیا۔

اس کے بعد موم بتی یک لخت بجھ گئی اور تاریکی میں تیز سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔

اگلی صبح میں نے مکان سے متعلق سرکاری کاغذات دیکھے۔ ان کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوا کہ 1740 اور 1800 کے درمیان اس گھر کا قدیمی حصہ ایک قسم کی کاشت والی زمین تھی۔ جس کا مالک ایک جرمن کارل کلنٹ تھا۔ آرتھر لیڈل آخری مرتبہ اس شخص کے ساتھ تھا مگر بعد میں اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ چند سال بعد اس کارل کلنٹ کے تمام نشانات صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ اور اس کے بعد اس جگہ نے کئی چولے بدلے۔

چند ہفتے مزید سکون سے گزرے۔ بالآخر میں نے خالی کمرے کا مصرف لینے کا فیصلہ کیا اور وہاں بجلی کے تار جڑوائے۔ مگر اسی رات میری خواب گاہ کے دروازے پر نہایت زوردار دستکیں ہوئیں دوسرے دن میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اس راز کو حل کرکے ہی چھوڑوں گا۔ میں نے مشہور چشم معمول جو شخص روحوں کو بلانے پر قادر ہو شیسل ہسک سے رابطہ کیا اور اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے دی۔

نو بجے شب تک احباب وغیرہ پہنچ گئے میں انہیں کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ معمول کو درمیان میں بیٹھایا۔ روشنیاں گل کردی گئیں۔ سوائے ایک چھوٹے سے لیمپ کے۔ جس پر شیڈ پڑا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد روح کا ظہور ہونا شروع ہوا۔ اور اس پراسرار ہستی نے انگلیوں سے شیشے کے جھاڑ اور دیوار سے ملحق آئینہ پر کھٹ کھٹ...... کی، قدموں کی آواز بھی ابھرنے لگی جو چھوٹے کمرے سے آرہی تھی پھر کمرے کے اندر ابر سا بننے لگا۔ جو بتدریج بڑھتا جارہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ سر اور شانے ابھرے...... اور بالآخر انسانی ہیولے کے نقوش واضح ہوگئے۔ میرے سامنے کارل کلنٹ موجود تھا۔ اس کی غمزدہ آنکھیں، افسردہ چہرہ، دلی کیفیات کا ترجمان تھا۔ میرے دل میں ہمدردی کے جذبات ابھرتے چلے گئے۔ آخر کچھ دیر بعد آواز آئی...... سرگوشی جیسی پراسرار آواز!

''تم یہاں کیوں جمع ہو۔ اور کیا چاہتے ہو؟''

''یہ میرے دوست ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟''

''میں کارل کلنٹ ہوں۔''

ایک ساعت کی بھی تاخیر ہوئے بغیر کہا گیا۔ ''120 سال پہلے میں یہاں رہتا تھا...... مگر تم اس مکان میں کیوں آئے ہو؟''

''کیونکہ مجھے آپ کا مکان پسند آیا ہے...... اور شاید میں آپ کی کچھ مدد بھی کرسکوں۔''

''میری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔'' مغموم لہجے میں کہا گیا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تم میرے آرام میں مخل ہو...... یہ مکان خالی کردو۔''

''مگر شاید تمہیں سکون نہیں۔ ورنہ ہمیں یوں راتوں کو ڈرایا نہ کرتے۔''

''میں مجبور ہوں جس رات سے میں مرا ہوں اسی جگہ رہتا ہوں۔''

''تو کیا لیڈل کو آپ نے قتل کیا تھا......؟''

''ہاں...... وہ میری محبوبہ پر بری نظر رکھتا تھا۔ مجھے چارلٹ سے بے انتہا محبت تھی۔ جس کا اندازہ تم

نہیں کرسکتے۔ لیڈل نے اسے سبز باغ دکھانے کی کوشش کی۔ ایک رات وہ اپنی حد سے تجاوز کرنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے ختم کردیا۔

بالکل ایسے ہی جیسے پاگل کتے کو ختم کردیا جاتا ہے۔ لوگ میرے اس فعل کو قتل کہتے ہیں۔ مگر یقین کرو۔ اگر لیڈل اور میں دوبارہ بھی زندہ ہوجائیں تو پھر بھی میں اسے قتل کرنے میں دیر نہ لگاؤں گا۔''

''مگر چارلٹ کا کیا بنا؟''

''وہ کچھ عرصہ بعد مرگئی تھی۔ اس نے لیڈل کی لاش چھپانے میں میری مدد کی تھی اور پھر بعد میں راز فاش ہوجانے کے خوف سے وہ فکرمند رہنے لگی۔ اسی فکر نے اس کی جان لے لی...... اس کی لاش قبرستان میں دفن ہے جو قریب ہی دائیں جانب واقع ہے۔''

''اور تمہارا کیا انجام ہوا؟''

''چارلٹ کے مرنے کے بعد میں مغربی جرمنی چلا گیا۔ لیکن ایک لمحہ بھی سکون نہ ملا۔ تنگ آکر میں نے خودکشی کرلی...... اور پھر ایک دن مجھے یہ احساس ہوا کہ جیسے میں کسی گہری نیند سے بیدار ہوا ہوں۔ جس کمرے میں، میں بیدار ہوا وہ زیریں منزل والا کمرہ تھا۔''

''مگر کیا تم کہیں اور نہیں جاسکتے؟''

''نہیں میں کہیں نہیں جاسکتا۔ یہی تو ایک جگہ ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کے خوشگوار لمحات گزارے ہیں۔ مجھے اپنے اس جسم سے بھی نفرت ہے جو میں تابوت میں چھوڑ آیا ہوں مجھے یہیں سکون ملتا ہے۔''

''اپنے جسم میں واپس جاؤ...... شاید تمہیں نیند اور سکون ملے۔''

''جس کمرے میں، میں ہوں وہاں مجھے نیند نہیں آتی بلکہ کہیں بھی نیند نہیں آسکتی۔ میں ابد تک اسی طرح بے چین رہوں گا۔ شاید یہی میری سزا ہے۔''

''مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ کوئی ایسی خدمت جو میں آپ کے لئے انجام دے سکوں۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جواب دیا گیا۔

''نچلی منزل کے چھوٹے کمرے کو چھوڑ دو اور شام ہوتے ہی اس کے اندر کوئی نہ جائے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میرا وعدہ ہے کہ تمہیں کبھی پریشان نہیں کروں گا۔''

''پھر کارل کلنٹ کی روح غائب ہوگئی اور میں نے اسی وقت اس کمرے کو مقفل کردیا اور کبھی نہ کھولا۔

پھر ایک سال بعد جب میں لندن سے جانے لگا تو ایک مرتبہ پھر میں نے مجلس کرائی تاکہ کارل کلنٹ کا شکریہ ادا کروں۔

کارل کی روح فوراً نمودار ہوئی۔ میں نے کہنا شروع کیا۔

''کارل میں اس جگہ سے جارہا ہوں...... میں نے سوچا کہ آپ کا شکریہ ادا کردوں کہ آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا...... آخری مرتبہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ دوسرے لوگ اس مکان میں آکر رہیں، میں تمہارے لئے کیا کچھ کرسکتا ہوں؟''

چند لمحوں بعد جواب ملا۔

''میرے دوست! میں تمہارے ساتھ ہی جانا چاہتا ہوں۔''

مرنے کے بعد تم واحد شخص ہو، جس کے دل میں میرے لئے سچی ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے ہیں...... تمہیں چھوٹے کمرے کے تختوں کے پیچھے چارلٹ کی تصویر مل جائے گی...... اسے نکال کر نئے مکان میں کسی دیوار پر آویزاں کردینا۔

اور جب تم اس دنیا سے نکل کر سایوں کی دنیا میں آؤ گے تو کم سے کم دو ساتھی، تمہارے استقبال کے لئے ضرور موجود ہوں گے۔''

اس کے بعد میں نے چارلٹ کی تصویر کو نکالا، جس کی نشاندہی کارل کلنٹ کی روح نے کی تھی...... اور اس وقت بھی وہی تصویر میری نگاہوں کے سامنے آویزاں ہے، جب کہ میں یہ سچی پراسرار کہانی ان صفحات پر منتقل کررہا ہوں۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 90

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

جگرام ایک کونے میں باادب کھڑا تھا۔ پنڈت کی آواز سن کر بولا۔ مہاراج آپ فکر نہ کریں میں آپ کی خواہش پوری کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ دشمن کا سر آپ کے چرنوں میں لاکر ڈال دوں گا اور موت کی ہانڈی بھی آپ کے سامنے ہوگی۔ پنڈت بولا۔ جگرام تو ٹھہر، میں سنگھا کو بھی بلاتا ہوں۔ تم دونوں مل کر مورکھ رولوکا کا کھوج لگاؤ، پنڈت کی آواز پر سنگھا بھی حاضر ہوگیا اور پھر جگرام اور سنگھا پنڈت کا حکم ملتے ہی غائب ہوگئے۔ پھر پلک جھپکتے ہی دونوں حاضر ہوگئے اور جگرام بولا۔ مہاراج میں نے ایک جگہ ایک دھند نما کنڈل دیکھا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ مورکھ اسی کنڈل میں خود کو چھپائے بیٹھا ہے۔ بہر حال جگرام نے اس کنڈل پر ایک اور کنڈل قائم کردیا مگر رولوکا بھی چوکنا تھا۔ وہ زمین کی تہہ میں پہنچ کر اس جگہ سے نکل گیا اور پنڈت کے سارے بیر اس جگہ پہرہ دیتے رہے کہ رولوکا نکلے تو اسے پکڑلیں گے اور پھر ایک دن رولوکا پنڈت کے کمرے میں حاضر ہوگیا اور بولا۔ پنڈت تو بہت بڑا بے وقوف ہے تو چند ٹکوں کی خاطر لوگوں کی جان لیتا رہا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موت کی ہانڈی کمرے میں پنڈت کے سامنے ظاہر ہوگئی جسے دیکھ کر پنڈت حواس باختہ ہوگیا۔ پنڈت دھپ سے فرش پر ڈھے گیا اور پھر موت کی ہانڈی اس کے سامنے فرش پر گر کر چکنا چور ہوگئی۔ ہانڈی کا فرش پر گرنا تھا کہ پنڈت کے منہ سے خون بھل بھل نکلنے لگا اور پنڈت ساکت ہوگیا اس کے بعد رولوکا پلک جھپکتے ہی مطب کے اپنے کمرے میں پہنچ گیا اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد بستر پر لیٹ کر بے خبر سوگیا۔ صبح کے وقت حکیم وقار سے ملاقات ہوئی تو حکیم وقار نے رولوکا کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور پوچھا اور سنائیں پنڈت شنکر کا کیا بنا۔ رولوکا نے جواب دیا۔ پنڈت نے بہت ہلکا کردیا تھا۔ خیر وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا اور آپ سنائیں رولوکا نے حکیم وقار سے پوچھا اور آپ کے ہاتھ میں یہ کون سی کتاب ہے لگتا ہے کوئی اچھی کتاب ہے اس لئے آپ اس کا بغور جائزہ لے رہے ہیں، حکیم وقار نے جواب دیا ہاں! مجھے یہ اچھی لگی ہے اس کا نام ہے "روشنی کا سفیر" رولوکا بولا۔ نام سے تو لگتا ہے واقعی بہت اچھی ہے۔ چلئے آج میں بھی اسے سنتا ہوں۔ آج ویسے بھی مطب میں مریضوں کی چھٹی ہے۔ یہ سن کر حکیم وقار بولے۔ آپ تشریف رکھیں، میں کتاب شروع کرتا ہوں اور حکیم وقار نے "روشنی کا سفیر" پڑھنا شروع کیا۔ (اب آگے پڑھیں)

"**ہم** مسلمانوں کے قریب ہمیشہ سے اس لئے رہے ہیں کہ انہوں نے ہم کو انسان تو سمجھا ہے، انہوں نے وہ ستم تو نہیں کئے جو بڑی ذات کے لوگوں نے ہم پر کئے ہیں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو تو یہ بڑی ذات کے لوگ، ملیچھ یعنی گندے لوگ قرار دیتے ہیں۔" ہردیال نے کہا۔

"پنڈت جو ایک لوٹا پانی سے غسل کرتا ہے اس کی دھوتی تک گیلی نہیں ہوتی جسم بھی گیلا نہیں ہوتا اس کا اشنان ہوجاتا ہے جو گوبر سے رسوئی لیپتا ہے اور کہتا ہے پوتر ہوگئی۔ وہ مسلمانوں کو گندہ کہتا ہے جبکہ مسلمانوں کا نہانے کا ایک مذہبی طریقہ ہے۔ ایک بال بھی سوکھا رہا تو غسل نہیں ہوا اس پر بھی وہ ملیچھ ہے۔"

گوپال نے رائے دی۔ "بھیا میں نے کچھ مسلمانوں کے بارے میں پڑھا ہے ان کے مقابلے میں ہندو دھرم اپنی موجودہ شکل میں بھی اور ماضی میں بھی وہ متفرق اعمال کا مجموعہ رہا ہے بلند ترین سے پست ترین تک ایک دوسرے سے متصادم و متضاد مگر آج کے ہندو کی سوچ بدل رہی ہے اس کو ہم قطعی متصادم و متضاد نہیں کہہ سکتے۔

مسلمان سیکڑوں سال سے ہندوستان میں آباد

ہیں۔ مگر ان کے بنیادی احکامات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی اس بات کی ہندو کو جھنجھلاہٹ تو ہے ملک سیکولر ہوگیا ہے قانون ہیں، بڑی بڑی تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں مگر آج بھی برہمن کا ترشول مسلمانوں کے سروں پر ہے۔" ہردیال نے بتایا۔

"بہرحال اب تو ہم سب کو اسی معاشرے میں رہنا ہے مقابلہ کرنا ہے۔"

تین روز میں ہی اجالا کی ماں کی طرف سے منظوری آ گئی۔ اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہردیال کے سسرال والے بھی تعلیم یافتہ تھے اور گوپال کے بھی، اس لئے ساری فضول رسموں کو چھوڑ دیا گیا۔ ایک کمیونٹی ہال میں دونوں دولہا اور دلہنیں چلی گئیں۔ شہر کے سب ہی نامی گرامی سرکاری لوگ اور عزیز و اقارب کو دعوت دی گئی۔

پہلے گوپال کے پھیرے ہوئے اس کے بعد ہردیال نے پھیرے کئے۔

باس دیو بڑی سی پیلی پگڑی باندھے مہمانوں سے ملتے رہے ان کا شکریہ ادا کرتے رہے کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی اس کی ذات کے بارے میں کوئی سوال کرتا وہ کمشنر بنگلور کا باپ تھا۔ سب ہی احترام سے جھک کر اس سے مل رہے تھے۔ وہ باس دیو سے نہیں کمشنر کے باپ سے مل رہے تھے مبارک بادیں دے رہے تھے بڑا شاندار پر تکلف کھانا پیش کیا گیا۔ اس کا انتظام بھی گوپال نے کیا تھا۔ مگر یہ صرف چند لوگ جانتے تھے۔ اس کے بعد ناچ گانے کا پروگرام تھا۔

دونوں دلہنیں گھر آ گئیں، ڈاکٹر ہردیال اور کمشنر گوپال دونوں ایک ہفتہ کی چھٹیوں پر تھے سرکاری کوٹھی کو بھی دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ یہ ایک یادگار شادی تھی۔ سادہ بھی اور رنگا رنگ بھی سادہ اس لئے کہ ہندوؤں کی بہت رسمیں اس میں نہیں ہوئیں۔ رنگا رنگ اس لئے کہ لوگوں نے صاحب کو خوش کرنے کے لئے بہت پروگرام خود کر دیئے۔ ایک ہفتہ کے بعد گوپال دفتر گیا تو اس کو خوش خبری ملی اس کا پروموشن ہوگیا ہے اور سینٹرل میں اس کو بلایا گیا ہے۔ سیکریٹری پلاننگ اس کو بنایا گیا ہے۔ اور ایک ہفتہ میں رپورٹ دینا ہے۔ یہ بہت بڑی خوش خبری تھی۔ اس کے بے داغ ریکارڈ اور اس کی کارکردگی کو سراہا گیا اور صوبے سے سینٹرل گورنمنٹ میں طلب کیا گیا تھا۔ اس نے فون پر ہردیال کو کہا اور یہ خوش خبری سنائی تو وہ بولا۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے آپ پہلے شادی کر لیتے تو پہلے ہی سیکریٹری ہو جاتے۔" ہردیال ہنس کر بولا۔

"تیری ہر بات نرالی ہے، سن میں گھر جا رہا ہوں میری جگہ پر آدمی کل آئے گا اب مجھے اس کو چارج دینا ہے کام بہت ہیں اور وقت کم ہے۔"

گوپال شرما اجالا کے ساتھ دلی روانہ ہوگیا۔

پنڈت رام مورتی گوپال شرما کے سامنے جب بھی آتا بڑی مسکین صورت کے ساتھ آتا تھا۔ شادی کے وقت بھی اس نے خود کو باندھ کر رکھا تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بڑا سیدھا سادہ آدمی تھا۔ یہ شخص نہایت گھنا اور کینہ رکھنے والا آدمی تھا۔ بول وہ اس لئے نہیں سکا کہ گوپال کی پوزیشن بنگلور میں بہت اونچی تھی دوسرے اس کی بہن اور اجالا خود گوپال کی طرف تھیں، اور قانونی طور پر بھی وہ کمزور تھا۔ مگر اس کے دل میں گوپال کے لئے بڑی نفرت تھی۔

"لے گیا برہمنوں کی عزت لے گیا سیکڑوں سال کی کمائی ہوئی دولت اس لڑکی نے برباد کر دی۔"

"ارے تو تم کیوں مرے جا رہے ہو۔ اجالا تمہاری لڑکی تو نہیں تھی۔" اس کی بیوی جامنی نے کہا۔

"ارے تجھے کیا پتہ پنڈت لکھ رام کو اس نے پہلے جیل بھجوایا اور پھر اجالا کو اپنے جال میں پھانس لیا اور برہمنوں کو نیچے ڈال دیا، یہ سارا کام اس نے پلان بنا کر کیا ہے۔ ارے اس چمار کا میں کیا کروں، میرے دل میں اگنی جل رہی ہے۔" پنڈت رام مورتی نے بے چینی سے کہا۔

"میری تو سمجھ میں تمہاری بے چینی نہیں آ رہی

ارے اجالا ایک پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی تھی اس کو وہ پسند آیا تو اس نے شادی کی ہے تم نے دیکھا نہیں کہ دونوں کتنے خوش تھے۔" جامنی دیوی نے جواب دیا۔

"تو نے یہ کہاوت تو سنی ہوگی گھورے کی اینٹ چوبارے پر اچھی نہیں لگتی۔" پنڈت بولا۔

"اب اس کہاوت کو بھول جاؤ بڑے نامی گرامی پنڈتوں کی لڑکیاں مسلمان لڑکوں کے ساتھ پھر رہی ہیں۔ ٹھاکروں کی لڑکیاں شودروں کے گھروں میں کھا رہی ہیں۔" جامنی نے کہا۔

"ارے سب تو ایسا نہیں کر رہے۔" پنڈت جھنجھلا کر بولا۔

"کر تو رہے ہیں وہ بھی برہمن ہیں ٹھاکر ہیں، اب تم بھی بھول جاؤ پچھلی کھتا اور جو نئی کہانی شروع ہوئی ہے اس پر عمل کرو اگر ایسا نہیں کرو گے تو اکیلے رہ جاؤ گے، تم اجالا کے ماما ہو باپ نہیں ہو، گوپال کے سامنے اجالا کا باپ بھی ہوتا تو وہ بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔" جامنی نے کہا۔

"تو چاہے کچھ بھی کہہ جامنی میں کیسے بھول جاؤں کہ ایک چمار میری بھانجی کو لے گیا ہے۔"

"تو پھر جلتے رہو، مجھے پتہ ہے تم کچھ نہیں کر سکو گے، تم اپنی طرف دیکھو، تمہاری بھی دو دو بیٹیاں کنواری بیٹھی ہیں۔ ان کی طرف دیکھو، کرو تلاش کوئی کھرا برہمن۔" جامنی نے کہا۔

ہردیال بنگلور کے ناناوتی اسپتال میں سرجن تھا، باس دیو گوپال کے ساتھ نہیں گیا تھا۔

ڈاکٹر پوجا کا پاؤں بھاری تھا اور باس دیو کا پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہیں تھا وہ روز ناشتہ پر ہردیال کو کہتا۔ "تو کیا آدمی ہے ہردیال، بہو کے آرام کے دن ہیں اور تو اس کو کام میں جوتے ہوئے ہے۔"

ہردیال ہنس پڑتا۔ "باپو ابھی کام کرنا آگے فائدہ مند ہوگا آپ کیوں چنتا کرتے ہو، میں تو اس کے پاس ہر وقت رہتا ہوں۔"

دلی میں اجالا کا بھی یہی حال تھا اس نے باس دیو کو نہیں بتایا تھا گوپال جانتا تھا کہ باپو سن کر دیوانہ وار دوڑیں گے جب کچھ ہو جائے گا تو ضرور خبر کر دوں گا۔

اجالا کا وزن بہت بڑھ گیا تھا ڈاکٹرز کا خیال ٹھیک ثابت ہوا اور اجالا کو دو لڑکے پیدا ہوئے۔ دونوں ٹھیک تھے۔ گوپال نے فون پر یہ خوشخبری ہردیال کو سنائی اور اس نے باپو کو بتایا تو باس دیو خوشی سے ناچنے لگا، میرا دل کرتا ہے فوراً دلی چلا جاؤں۔" وہ بولا۔

"چلے جاؤ مگر یہاں پر پوجا ہے اس کو کیسے چھوڑیں اکیلی۔" ہردیال بولا۔

"ہاں رے میں تو خوشی میں بھول ہی گیا تھا۔" باس دیو بولا۔

اس کے تین دن کے بعد پوجا کے دو جڑواں لڑکیاں پیدا ہوگئیں۔ باس دیو نے بڑی خوشی کے عالم میں بھی حیرت سے کہا۔ "ارے تم دونوں نے پہلے سے طے کر رکھا تھا کیا۔"

"یہ بھگوان کی مرضی ہے باپو۔" ہردیال بولا۔

"ٹھیک ہے بھگوان کی مرضی ہے جو دے اچھا ہے ہمیں تو شکر ادا کرنا ہے۔"

یہ خوش خبری گوپال تک بھی پہنچی گوپال اس وقت اجالا کے پاس اسپتال میں تھا۔

"واہ ہردیال مجھ سے کم نہیں رہا تو۔" گوپال ہنس کر بولا۔

"ہاں یہ تو تعجب کی بات ہے دونوں بھائیوں کے گھر جڑواں بچے پیدا ہوگئے۔" اجالا بولی۔

"تمہارے بارے میں مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔" گوپال بولا۔

"مجھے خود ایسا ہی لگ رہا تھا۔" اجالا بولی۔

"اور وہ دونوں تو ڈاکٹر ہیں ان کو تو پوری طرح پتہ چل گیا ہوگا۔"

"تم کب تک اسپتال میں رہو گی۔" گوپال نے پوچھا۔

"ڈاکٹر تو کہہ رہی تھی سب ٹھیک ہے آپ جا سکتی ہیں۔" اجالا نے بتایا۔

"تو میں رات سات آٹھ بجے دفتر سے اٹھوں گا اور سیدھا تمہارے پاس آؤں گا اور تم کو گھر لے جاؤں گا تم چاہو تو کسی نرس کو اپنے پاس رکھ لو، میں کل سویرے بنگلور جاؤں گا اور شام کی پرواز سے واپس آجاؤں گا، ہردیال اور پوجا خوش ہوجائیں گی۔" گوپال بولا۔

"ہاں ہوآ ؤ تم بڑے ہو تمہارا فرض بنتا ہے۔"

گوپال کو اچانک دیکھ کر ہردیال خوشی سے پھٹ گیا۔ باس دیو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔

"پہلے یہ بتاؤ بھیا کہ بھابھی کیسی ہے اور بچے ٹھیک ہیں۔" ہردیال نے پوچھا۔

"ہاں گوپال پہلے یہ بتا۔" باس دیو نے بھی پوچھا۔

"میں تیری بھابھی کو گھر پہنچا کر آیا ہوں دونوں بچے بھی ٹھیک ہیں سب کچھ نارمل ہوا ہے۔" گوپال بولا۔

"اور بھیا یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ میں نے بھیا کو آگے اسی کارن رکھا تھا بھگوان نے میرا پروگرام پورا کردیا پہلے تم باپ بنے اس کے بعد میں۔"

"ارے یہ سب اوپر والے کی مہربانی ہے تم روزانہ، نہ جانے کتنوں کی دعائیں لیتے ہو۔" گوپال بولا۔

"بھیا میں نے آج تک کسی مریض سے نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے کس ذات کا ہے کس دھرم کا ہے؟ میں ڈاکٹر ہوں میرا کام انسانوں کی زندگی بچانا ہے میری نیت صاف ہوتی ہے اور بھگوان میری مدد کرتا ہے۔ لوگ میری تعریف کرتے ہیں مگر مجھے اصل خوشی مریض کے ٹھیک ہونے پر ہوتی ہے۔" ہردیال بولا۔

"تو نے جو لائن پکڑی ہے وہی درست ہے، دولت اور شہرت دونوں انسان کے دماغ میں فطور پیدا کرتی ہیں، تیری دولت وہ دعائیں ہیں جو تجھے ملتی ہیں دولت دنیا میں بڑی اہمیت رکھتی ہے ہر آدمی اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے مگر میں پوچھتا ہوں کیا وہ اس دنیاوی دولت کو ساتھ لے جائے گا، جو چیز ساتھ نہیں جائے گی اس سے پریم بڑھانا کہاں کی عقل مندی ہے۔ انسان کی ضرورت کیا ہے اس کو وہ مل رہا ہے تو پھر دھن دولت کے پھیر میں کیوں پڑے۔ تم جانتے ہو میری پوسٹ آج بھی ایسی ہے کہ میں دھن کے ڈھیر لگا سکتا ہوں۔ مگر باپو کی خواہش دولت جمع کرنے کی نہیں تھی، جو خواہش تھی اس کو میں نے اور تم نے پورا کردیا ہے اب اپنے کردار سے ثابت کرنا ہے کہ بڑی ذات کے لوگ ہی اس دیش کے بھگت نہیں ہیں ہم بھی ہیں، ہم نے خود کو ان کی بھیڑ میں نمایاں رکھنا ہے۔ لوگ دور سے دیکھ کر ہمارے بارے میں رائے قائم کریں اور وہ رائے ایسی ہو کہ بڑی ذات والے شرمندہ ہوجائیں۔" گوپال نے کہا۔

"آپ نے درست کہا بھیا، میں نے محسوس کیا ہے اور آپ نے بھی کیا ہوگا کہ کچھ لوگ ہمارے نزدیک آتے ہیں اور بڑے احترام سے پیش آتے ہیں مگر ان کا احترام ہماری کرسی کے لئے ہوتا ہے ہماری ذات کے لئے نہیں ہوتا، کچھ برابر کے لوگ کبھی کبھی کوئی نہ کوئی لفظ ایسا ضرور کہہ جاتے ہیں جو طنزیہ ہوتا ہے۔ ان کے دل میں جو کینہ بھرا ہے وہ ختم نہیں ہوا۔ اس کا کوئی علاج ہے۔ پنڈت کو ہرگز یہ بات ہضم نہیں ہوگی کہ وہ مجھے سلام کرے، ٹھاکر ہرگز جھک کر بات کرنا نہیں چاہے گا۔ یہ بہت پرانا غرور ہے اتنی جلدی کیسے نکل جائے گا ہماری دوسری اور تیسری نسل جب آئے گی تو شاید وہ ان کو جھکا دے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم برابر آگے بڑھتے رہیں۔" گوپال نے کہا۔

"آپ کا گھر تو سرکاری ہوگا۔" ہردیال بولا۔

"سارا ہی کچھ سرکاری ہے، گاڑی بنگلہ سیکورٹی اور ملازمین۔" گوپال بولا۔

"دو چار دن کو بھابھی کو لے کر آجاؤ۔ میں بھی چھٹی کرلوں گا۔" ہردیال بولا۔

"مجھے شام کی فلائٹ سے واپس جانا ہے بس اتنی فرصت میں نے تمہارے لئے نکالی ہے۔" گوپال بولا۔

گوپال کی ایمانداری اس کو آگے بڑھاتی [illegible]

اور وہ سیکریٹری انڈسٹری ہوگیا۔ اس کی شخصیت اتنی بھاری بھرکم تھی کہ بڑے بڑے حکومت کے وزیر بھی جھک کر ملتے تھے اس کی مثال دی جاتی تھی پرائم منسٹر اور صدر بھی اس کی عزت کرتے تھے۔ اس کی بات کو غور سے سنتے تھے وہ سرکاری آفیسروں میں ایک رول ماڈل تھا۔ اس کے کردار اور اصولوں کو جو ناپسند کرتے تھے ان کی تعداد بہت تھی مگر اس کو ان کی پرواہ نہیں تھی وہ اپنا کام کرتا تھا۔ اس پر ہر قسم کے حملے ہوئے الزامات لگائے گئے۔ مگر وہ اپنے اصولوں سے ذرا نہیں ہٹا۔ وقت گزرتا رہا بچے بڑے ہوتے گئے۔

ہردیال بنگلور سے بمبئی چلا گیا ایک بہت بڑے اسپتال کا وہ انچارج تھا۔ اس کی لڑکیاں بھی کالج کی سطح تک آگئی تھیں۔ دونوں بھائی الگ الگ شہروں میں تھے مگر ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی گول کے بچے بمبئی آجاتے تھے اور ہفتوں رہتے تھے۔ باس دیو سورگباشی ہوچکے تھے دونوں بھائیوں اور ان کی بیویوں میں بڑی محبت تھی۔

گوپال کے لڑکوں نے فرسٹ ایئر پاس کیا تو اجالا نے ایک بڑی پارٹی کا بندوبست کیا۔ بمبئی تو وہ پہلے ہی خبر کرچکی تھی۔ ہردیال کے ساتھ پوجا اور دونوں لڑکیاں آچکی تھیں اجالا کے میکے میں ماما پنڈت رام مورتی تھے ان کی لڑکیوں کی شادی ہوچکی تھی رام مورتی بنگلور سے آگئے۔ ان کے من کی کالک دور نہیں ہوئی تھی وہ بولے۔

"آج پنڈت مکھ رام زندہ ہوتے تو کیا وہ خوش ہوتے۔ وہ ایک کھرے برہمن تھے۔ شاید ان کی خوشی نہ ہوتی مگر میں کیا کروں وقت وقت کی بات ہے۔"

"ماما یہ پرانی باتیں ہیں۔ اب بھول جاؤ، میں گوپال کی پتنی ہوں گوپال ایک اچھا پتی ہے اس نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا میری اولاد کو دکھ نہیں دیا اب یہ ذات پات کے جھگڑے بے کار ہیں۔"

"ارے بیٹا! کچھ کہو مگر ہاتھ کی لکیر کو مٹایا نہیں جاسکتا [illegible] سینے پر تو داغ [illegible] تو مرتے دم تک رہے گا، ارتھی جل جائے گی تو بھی شاید وہ داغ نہ جائے۔ برہمنوں کی پرم پرا عزت اور نام سب ملیامیٹ ہوگیا ہے۔" پنڈت نے کہا۔

"دیکھو ماما تم نے میرے سامنے تو یہ باتیں کرلیں مگر اب کسی اور کے سامنے ہرگز نہ کرنا۔ کروگے تو یاد رکھنا میں اپنے پتی کا ساتھ دوں گی۔" اجالا نے لہجہ بدل کر کہا۔

پنڈت بولے۔ "ارے لے میں کوئی پاگل ہوں تم کو اپنا سمجھ کر بات کرلی ہے۔"

پنڈت دل میں دونوں کو گالیاں دینے لگا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

بڑی شاندار پارٹی ہوئی بڑے بڑے وزیر اور سرکاری افسران اور ان کی بیگمات نے شرکت کی ماما کو اب اندازہ ہوا کہ یہ تو بہت بڑا آدمی بن گیا ہے شری گوپال شرما ہر کوئی اس کی عزت کررہا ہے۔ سینٹرل گورنمنٹ کے سب ہی لوگ دعوت میں موجود تھے، ماما کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ رات گئے پارٹی ختم ہوئی اور ایک ایک کرکے مہمان رخصت ہوگئے۔ کوٹھی کا لان خالی ہوگیا۔ ملازمین اس کی صفائی وغیرہ میں لگ گئے اور گھر کے لوگ اندر آگئے۔ گوپال کے بڑے لڑکے کا نام راجیش تھا دوسرا دنیش تھا۔ دونوں برابر تھے۔ مگر گوپال نے راجیش کو بڑا قرار دے دیا تھا۔

ہردیال نے دنیش سے پوچھا۔ "بول بھئی پارٹی کیسی رہی۔"

"چاچا بہت اچھی تھی، پاپا نے بہت خرچ کردیا۔ پارٹی پر۔"

"ارے فکر کیوں کرتا ہے تیری شادی پر میں اس سے بھی بڑی پارٹی دوں گا۔" ہردیال نے کہا۔

"اور میری شادی پر نہیں دوگے۔" راجیش بولا۔

"تم دونوں کی شادی ایک ہی دن ہوگی اور پارٹی بھی دونوں کی ساتھ ہوگی۔" ہردیال نے جواب دیا۔ [illegible]

"ارے بھئی کیوں فکر کرتے ہو تمہارا چاچا تاج محل میں پارٹی کرے گا۔" گوپال بولا۔

"بھابی اب آپ کچھ دنوں کو بمبئی آجاؤ سیر سپاٹے کرو گھومو پھرو بچے بھی چھٹی پر ہیں۔" ہردیال نے کہا۔

"بچوں کو تم لے جاؤ میرا آنا تو ذرا دشوار ہے تم کو پتہ ہے یہ سرکاری آدمی ہیں ان کو نہ دن میں چین ہے نہ رات میں کسی وقت بھی ان کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور یہ چلے جاتے ہیں ان کے کھانے پینے کا بھی وقت نہیں ہے، میں ان کے پروگراموں کو دفتر کی سیکریٹری سے لے کر ان کے لباس اور کھانے کا انتظام کرتی ہوں، کہاں پر کیا پہن کر جانا وغیرہ وغیرہ، میں نہ ہوئی تو سب کام یہ کریں گے مگر کھانا نہیں کھائیں گے۔ یہ تو اب میرے سامنے بھی اکثر کھانا بھول جاتے ہیں۔" اجالا نے کہا۔

"کیوں بھیا! بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں؟" ہردیال بولا۔

"ارے یار یہ جو پتی ورتا عورتیں ہوتی ہیں وہ اپنے مردوں کو اتنا کھلاتی ہیں کہ گول گپا بنا ڈالتی ہیں، تم کہاں اپنی بھابی کی باتوں پر جا رہے ہو۔" گوپال بولا۔

"اچھا آپ بتایئے آپ نے آج پارٹی میں کھانا کھایا ہے۔" اجالا بولی۔

"ارے بھئی یہ پارٹی لوگوں کو کھلانے کو تھی کہ خود کھانے کو۔" گوپال بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا بھیا کہ آپ نے کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔" ہردیال بولا۔

"یار بات یہ ہے کہ چلتے پھرتے پلیٹ ہاتھ میں پکڑ کر کھانا کھانا میرے بس کا کام نہیں ہے۔ میں سکون سے بیٹھ کر کھاتا ہوں تو کچھ کھا لیتا ہوں۔" گوپال نے کہا۔

"سن لیا ہردیال اس لئے میں ان کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی، میں ان کو بہت دور تک جانتی ہوں۔" اجالا بولی۔

"بھابی کھانے کے معاملے میں تو تمہارے دیور بھی چور ہیں۔" پوجا نے کہا۔

"لو میری بھی شکایت شروع ہو گئی۔" ہردیال بولا۔

"اول تو کسی پارٹی میں جاتے نہیں اور جاتے ہیں تو کھانے سے پہلے کھسکتے ہیں، چلو ایک کیس پر کام کرنا ہے اور بغیر کھائے واپس آجاتے ہیں۔" پوجا نے کہا۔

"تو پھر میں اس کو ڈانٹ دوں مگر مجھے خود پہلے کھانے کی عادت ڈالنا ہوگی۔" گوپال بولا۔

"تمہاری لڑکیوں کا رجحان کس طرف ہے میرا مطلب تعلیم کے معاملے میں۔" اجالا نے پوچھا۔

"دونوں باپ پر ہیں ڈاکٹر بننا چاہتی ہیں۔" پوجا نے جواب دیا۔

"میرا بڑا بیٹا راجیش وکالت کرنا چاہتا ہے باپ کی طرح اور چھوٹا انفارمیشن میں کچھ کرنا چاہتا ہے۔"

"بھابی بچے جو خوشی سے کریں گے وہی اچھا ہے ان پر اپنی مرضی ٹھونسنا مناسب نہیں۔" ہردیال بولا۔

"ہاں تو میں نے اور تمہارے بھیا نے کب منع کیا ہے۔"

ماما اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ "اچھا بھئی مجھے نیند آرہی ہے۔"

"ہردیال تم بھی آرام کرو۔" گوپال نے کہا۔

"ٹھیک ہے اور بھابی بھیا کو کھانا ضرور کھلا دینا ورنہ بھوکے سو جائیں گے۔" ہردیال بولا۔

ان کے جانے کے بعد گوپال بولا۔ "تم نے تو بدنام کر دیا۔"

اجالا زور سے ہنس پڑی بولی۔ "باپو ہوتے تو ان سے شکایت کرتی آپ اپنے بارے میں لاپرواہ ہوتے جا رہے ہیں آپ اتنی بڑی کرسی پر بیٹھے ہیں آپ کو اپنی صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اپنی غذا کا خیال رکھنا ضروری ہے میں جانتی ہوں آپ کو بہت بڑے بڑے

فیصلے کرنا ہوتے ہیں آپ کے فیصلے پر لوگوں کے کروڑوں روپے لگے ہوتے ہیں پورے بھارت کی انڈسٹری آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ سینٹرل کے سیکریٹری ہیں، میں اس لئے آپ کو یاد دلاتی رہتی ہوں۔" اجالا بولی۔

"تم میرا ایک بازو ہو، ہر عورت اپنے پتی کو کامیاب دیکھنا چاہتی ہے اور اپنے قریب رکھنا چاہتی ہے، میں بھی تمہارا عادی ہو گیا ہوں تم قریب نہ ہو تو دماغ میں کچھ نہیں آتا۔" گوپال بولا۔

"اچھا رات بہت ہو گئی ہے کچھ کھا لو۔"

ہردیال دونوں لڑکوں کو لے کر بمبئی چلا گیا۔ بنگلہ جو بھرا ہوا تھا۔ سب کے چلے جانے کے بعد سونا ہو گیا۔ سب سے آخر میں ماما گئے۔ ماما کے جانے کے تین دن کے بعد اچانک گوپال کی طبیعت خراب ہو گئی، دن کا وقت تھا دفتر سے اس کو اسپتال پہنچایا گیا اور اس کے پیٹ کی صفائی کر دی درد کچھ کم ہوا مگر ختم نہیں ہوا۔ علاج جاری رہا۔ مگر مکمل آرام نہ آیا۔ ہردیال کو پتہ چلا تو وہ دوڑا چلا آیا اس نے پوری رپورٹوں کو چیک کیا۔ دواؤں کو چیک کیا اور بولا۔

"علاج تو ٹھیک ہے پھر درد کیوں ختم نہیں ہوتا؟"

گوپال کی غذا بند ہو گئی اور کمزوری بڑھنے لگی۔ چند دن میں ہی وہ سالوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ اخبار میں اس کی بیماری کی خبریں چھپیں اور اس کی بیماری کو پراسرار بیماری کہا گیا۔ سالار نے بھی یہ خبر پڑھی اور وہ دلی آ گیا۔ دلی آتے ہی وہ اسپتال چلا گیا اور گوپال کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "اتنی جلدی ان کی یہ حالت؟"

سالار کے چہرے پر بڑی نورانی داڑھی تھی گوپال نے پہلی نظر میں اس کو نہیں پہچانا۔ سالار نے پوری کیفیت پوچھی تو وہ بولا۔

"بھابی ان کا علاج دواؤں سے نہیں ہے میں ان کے گلے میں ایک چیز ڈالتا ہوں انشاء اللہ فائدہ ہوگا اور کل میں کچھ اور کروں گا اس وقت نہیں ہو سکتا کسی نے

[illegible]

بڑا سخت حملہ کیا ہے۔"

سالار نے ایک تعویذ اپنے گلے سے اتار کر گوپال کے گلے میں ڈال دیا۔ اور بولا۔ "اس کو اتارنا نہیں میں کل کسی وقت پھر آؤں گا۔" اور وہ چلا گیا۔

اس تعویذ کے گلے میں آتے ہی گوپال کو کچھ سکون ملا اور اس نے کچھ سوپ وغیرہ پیا اور سو گیا۔

صبح تک وہ سکون سے سویا۔ ہردیال نے صبح خود معائنہ کیا اور بولا۔

"آج بہتر ہے آپ نے کون سی دوائیں رات کو لی تھیں۔"

اجالا بولی۔ "رات کو یہ سوپ پی کر جو سوئے تو پھر صبح ہی آنکھ کھولی ہے۔ دوا تو میں دے ہی نہیں سکی تھی۔"

"تعجب ہے آج ان کے جسم کی حالت وہ نہیں جو کل تھی پورا بدن پر سکون ہے۔"

گوپال بات کاٹ کر بولا۔ "اب پر سکون ہے اسی لئے تو بھوک لگ رہی ہے۔"

ہردیال نے کہا۔ "بھابھی ان کو نرم غذا دیں اور سوپ وغیرہ ضرور دیں۔"

"وہ آیا تھا سالار وہ کہاں گیا۔" گوپال نے پوچھا۔

اجالا بولی۔ "آنے والا ہے کہتا تھا صبح آؤں گا۔"

اجالا ناشتے کے لئے اشارہ کر چکی تھی ایک نرس ناشتے کی ٹرے لے کر آ گئی اور گوپال ناشتہ کرنے لگا ابھی ناشتہ جاری تھا کہ سالار آ گیا آتے ہی بولا۔

"اب آپ ٹھیک ہیں اس کو گھر تک پہنچا آیا ہوں۔"

ہردیال حیرت سے بولا۔ "کس کو گھر تک پہنچا آئے ہیں سالار بھائی۔"

"اپنے صاحب کی بیماری کو اور کس کو......" سالار بولا۔

"ارے بھئی کچھ ایسی زبان میں بات کرو کہ

میری سمجھ میں بھی آئے۔" گوپال بولا۔

"بات اتنی مشکل نہیں ہے سر! آپ بیمار نہیں تھے آپ پر حملہ کیا گیا تھا۔ یہ حملہ ایک سفلی کے گندے بیر نے کیا تھا اور آپ کو اس نے بیمار کر دیا تھا آپ پر کوئی دوا اثر نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ گندہ بیر آپ کے پیٹ میں موجود تھا۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ آپ اچانک بیمار ہوئے ہیں اور ایک اخبار نے آپ کی بیماری کو پراسرار بیماری کہا تو میں دوڑا دلی کی طرف۔ میرے پاس میرے مرشد کا دیا ہوا تعویذ ہر وقت ہوتا ہے فوری طور پر میری سمجھ میں یہی آیا کہ اگر یہ بیماری شیطان کی طرف سے ہے تو تعویذ کام کرے گا اور میں نے وہ آپ کے گلے میں ڈال دیا اور میں نظام الدین اولیا کے مزار پر چلا گیا اور آپ کی صحت کے لئے ان سے کہا اور رات بھر وہیں رہا ہوں۔ فجر کی نماز سے ذرا پہلے میں سو گیا تھا اور مجھے کہا گیا کہ جا شیطان بھاگ گیا اب نہیں آئے گا اور میں آپ کے پاس آ گیا اب آپ بتائیں کیسے ہیں؟" سالار نے پوری روداد سنا دی۔

"حیرت انگیز ہے تمہارا یہ تعویذ، گلے میں آتے ہی مجھے لگا۔ جیسے میرے اوپر پڑا وزن اٹھا لیا گیا، اندر جو بے چینی اور گھبراہٹ تھی خود بخود ختم ہو گئی، پیٹ خالی خالی محسوس ہونے لگا اور بھوک بھی لگی میں نے سوپ پیا اور سکون سے سو گیا۔"

"سالار بھائی آپ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے ہم تو میڈیکل کے نقطہ نظر سے علاج کرتے رہتے۔" ہردیال بولا۔

سالار نے کہا۔ "ہم اور آپ ہندوستان کی سر زمین پر رہتے ہیں یہاں پر بڑے بڑے پراسرار علوم موجود ہیں۔ جن کے بارے میں سائنس تو جیسے کچھ نہیں ہے سفلی ایک گندہ علم ہے اس کو گندے لوگ ہی کرتے ہیں۔

مگر میں حیران ہوں کہ آپ پر یہ حملہ کس نے اور کیوں کیا ہے؟ میں چونکہ بنیادی طور پر سی آئی ڈی والا ہوں اسی لئے اس کام کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔" سالار نے کہا۔

"واقعی یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ کام کس کا ہے؟" ہردیال بولا۔

"میں تمام آئے مہمانوں کی لسٹ چیک کرنا چاہوں گا اس کے بعد مشکوک افراد کو الگ کروں گا، پھر ہر ایک کے بارے میں پتہ کروں گا کہ آپ کی ان سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔

ہر ایک کے بارے میں پتہ کرنا ہوگا۔ میں اس کو ہر حالت میں پکڑوں گا اگر نہ پکڑا گیا تو وہ پھر وار کرے گا۔" سالار نے کہا۔

"بات تو تمہاری درست ہے۔" گوپال نے کہا۔

"آپ گھر جائیں ابھی تعویذ کو خود سے جدا نہ کریں جب ضرورت نہیں ہوگی میں لے لوں گا۔" سالار بولا۔

"سالار بھائی آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اجالا نے پوچھا۔

"بھابی میں اسی شیطان کی تلاش میں جا رہا ہوں گھر پر آؤں گا شام تک، بہت ممکن ہے مہمانوں کی لسٹ پر کام نہ کرنا پڑے اور اس کا پتہ چل جائے۔" سالار نے جواب دیا۔

سالار کے جانے کے بعد گوپال نے کہا۔ "بہت وفادار آدمی ہے، میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا یہ بنگلور سے بھاگا چلا آیا اگر نہ آتا تو پتہ نہیں میرا کیا ہوتا۔"

"اللہ والا آدمی نظر آتا ہے۔" ہردیال بولا۔

"پہلے یہ ایسا نہیں تھا، تھوڑے دنوں میں ہی اس کی کایا پلٹ ہوئی ہے مگر پکا مسلمان ہے نہ رشوت ہے نہ غیر قانونی کام کرتا ہے مجرم اس کے ہاتھ سے نہیں نکل سکتا، ایسا مضبوط کیس تیار کرتا ہے کہ بڑے سے بڑا وکیل مجرم کو بچا نہیں سکتا کچھ لوگ اور اس قسم کے ڈپارٹمنٹ میں آ جائیں تو یہ ایک بہترین ڈپارٹمنٹ بن جائے۔" گوپال نے کہا۔

"اب تو آپ کا تعلق اس ڈپارٹمنٹ سے رہا ہی نہیں۔" ہردیال بولا۔

"ہاں اب میں سینٹرل کا آدمی ہوں وہ جو ذمہ داری دیں گے وہی کرنا ہوگا۔" گوپال نے کہا۔

شام کو سالار ایک آدمی کے ساتھ گھر آ گیا۔ اس آدمی کا حلیہ بہت خراب تھا کپڑے پھٹے ہوئے تھے منہ سوجا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کسی نے اچھی طرح پٹائی کی ہے۔ اس آدمی کو مین گیٹ پر بیٹھا کر سالار اندر آ گیا۔ گوپال ڈرائنگ روم میں تھا، وہیں پر اجالا اور ہردیال بھی تھے۔ سالار نے آتے ہی کہا۔

"آپ کا مجرم پکڑ لیا ہے سر۔"

"کون سا مجرم؟" گوپال نے پوچھا۔

"ارے وہی سفلی کرنے والا گندہ بدمعاش۔" سالار بولا۔

"کہاں ہے وہ؟" ہردیال نے پوچھا۔ تو سالار بولا گیٹ پر بیٹھا ہے۔ "آپ لوگ آئیے دکھاتا ہوں۔"

سب اٹھ کھڑے ہوئے اور گیٹ پر آ گئے وہ شخص گیٹ پر بیٹھا تھا گوپال کو دیکھا تو پیروں میں گر گیا اور بولا۔ "معاف کر دو سرکار بڑی بھول ہو گئی مجھے پتہ ہوتا تو ہرگز نہ کرتا معاف کر دو۔"

سالار نے ایک زور کا ہاتھ اس کی پیٹھ پر مارا اور بولا۔ "ابے یہ تو بتا، تو نے کس کے کہنے پر یہ کیا تھا۔"

"ایک پنڈت کے کہنے پر میں نے کیا تھا جی۔" وہ بولا۔

"اس پنڈت کا حلیہ بتا اس کو بھی پکڑ کر لے آتا ہوں؟" سالار بولا۔

"وہ دلی کے نہیں تھے وہ بنگلور سے آئے تھے اور واپس چلے گئے ہیں۔" وہ بولا۔

"اچھا اس کا حلیہ بتا۔" اب جو اس نے حلیہ بتایا تو وہ ہو بہو پنڈت رام مورتی جیسا تھا جو کہ اجالا کے ماما تھے۔ سب سن کر حیران رہ گئے۔ سالار بولا۔ "سر میں بنگلور میں ہوں آپ فکر نہ کریں اس شخص کا وہ حشر کروں گا کہ آئندہ کبھی زندگی میں پھر نہیں کرے گا۔"

پھر اس شخص سے بولا۔ "کھڑا ہو جا تو نے سفلی کیا تھا اور تو کچھ نہیں کر سکا میں چیلی کرتا ہوں، تجھے دن میں تارے نظر آئیں گے۔" اس شخص نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اس کی ٹانگیں تھر تھر کانپ رہی تھیں زیادہ دیر کھڑا نہ ہو سکا اور دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا۔

سالار نے کہا۔ "سر! کم از کم تین مہینے کے لئے تو اس کو ضرور اندر کر دو۔"

وہ پھر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "معاف کر دو سرکار اب ایسا کام نہیں کروں گا۔"

گوپال نے کہا۔ "اس کو تھانے لے جاؤ اس کا پتہ وغیرہ نوٹ کرواؤ اور اس کو جانے دو اگر اس قسم کی کوئی واردات اور کبھی ہوگی تو یہی پکڑا جائے گا۔"

سالار نے کہا۔ "کھڑا ہو جا تیرے نصیب اچھے ہیں کہ تجھے رحم دل آدمی ملے ہیں ورنہ تیرے جیسے آدمی کو تو سولی پر لٹکا دینا چاہئے۔ مگر یاد رکھنا اب کے اگر تو پکڑا گیا تو پھر تیرا حشر بہت برا کروں گا۔"

اور سالار اس کو لے کر تھانے چلا گیا۔

گوپال اور ہردیال کا چہرہ سنجیدہ تھا سب ہی خاموش تھے اندر آ کر اجالا بولی۔

"ماما کے دل میں تمہارے لئے ہمیشہ پھانس رہی ہے یہ حملہ ضرور ان کے کہنے پر ہی ہوا ہے مگر اب وہ اس گھر میں زندگی بھر نہیں آئیں گے اور نہ میں کبھی ان سے ملوں گی ان کو ذرا خیال نہیں آیا، کیسا زمانہ آ گیا ہے۔"

گوپال بولا۔ "میں خود حیران ہوں میں نے ماما کی ہمیشہ عزت کی اور ان کے دل میں میرے لئے ایسا کینہ کہ میری جان تک لینے پر تیار ہو گئے ایسی مجھ سے کیا دشمنی تھی۔"

"ہاں بھیا حیرت کی بات ہے کتنی گھٹیا حرکت انہوں نے کی ہے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔" ہردیال نے کہا۔

"یہ نفرت جو سینکڑوں سال سے ان کے سینے میں پرورش پا رہی ہے۔ اس کا کارنامہ ہے۔" گوپال

نے کہا۔

''اور پتہ نہیں اس نفرت کے ختم ہونے میں کتنا وقت اور لگے گا۔'' ہردیال بولا۔

اجالا نے کہا۔ ''میرے خیال میں یہ نفرت جانے والی نہیں ہے۔''

ان کے مقابلے میں ایک کردار یہ سالار کا بھی ہے اس شخص نے میری ہمیشہ بھلائی کی ہے پنڈت لکھ رام کے کیس سے لے کر آج تک یہ میری مدد کرتا آیا ہے حالانکہ میں نے اس کے لئے کچھ نہیں کیا وہ کہتا ہے آپ کے اصول اور ایمانداری کو میں پسند کرتا ہوں مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔''

''بھیا آپ کو ایسے لوگ اور ملیں گے اس لئے کہ آپ خود ایسے ہیں۔ آپ کے پاس غیبی امداد آتی رہے گی آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' ہردیال بولا۔

''نیکی کی طاقت بہت ہوتی ہے نیکی نظر نہیں آتی مگر محسوس تو ہوتی ہے نیک کام کرنے کے بعد انسان کو جو قلبی سکون ملتا ہے اس کا بدل کچھ نہیں ہوتا۔'' گوپال بولا۔

گوپال اور ہردیال اپنی ایمانداری اور فرض شناسی کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان کی اولادیں بھی ان کے نقش قدم پر گامزن تھیں ان کے سامنے جو لوگ تھے وہ مثالی تھے۔ گوپال اور ہردیال ہندوستان کے بگڑے معاشرے کے لئے نمونہ تھے ان کو برا کہنے والے وہ لوگ تھے جو خود برے تھے۔ سالار ایک ایسا کردار تھا جو گوپال کے لئے بھی ایک رول ماڈل کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ ایک نہایت ہی بگڑے ڈپارٹمنٹ کا آدمی تھا اور اقلیت کے فرقے سے تعلق رکھتا تھا مگر اس کی فرض شناسی اور ایمانداری اس محکمے کی عزت بنائے ہوتی تھی اس کے بھی بہت دشمن تھے دوستی کی آڑ میں اس پر بہت وار ہوئے مگر سالار کا کچھ نہیں ہوا۔ وہ سینہ تان کر چلتا تھا اس کا اعتماد اور بھروسہ اللہ کی ذات پر تھا۔ وہ اس کا اظہار برملا کرتا تھا۔

دلی میں گوپال اس کا قدر دان تھا۔ بمبئی میں

ہردیال اس کا سچا ہمدرد تھا۔ دنیا میں اور بھی اس قسم کے لوگ ضرور ہیں، سالار ان سب کا قدر دان تھا۔ بڑے سے بڑے معاملے پر کسی نہ کسی طرف سے اس کی مدد ہوتی تھی۔ وہ مدد کرنے والے سب اس کے دوست نہیں ہوتے تھے۔

ہر برائی کے ساتھ اچھائی لگی ہے۔ برائی کو اکیلا نہیں چھوڑا گیا۔ وہ اچھائی برائی کو ختم کرتی رہتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا میں برائی ہی برائی ہو جائے۔ مگر ہزاروں سال سے برائی ہار رہی ہے۔

راجیش اور دنیش تعلیمی منزلیں طے کرتے رہے۔

ہردیال کی لڑکیاں روشنی اور چاندنی بھی تعلیمی میدان میں آگے بڑھتی رہیں۔

سالار کے دو لڑکے تھے دونوں بنگلور میں زیر تعلیم تھے۔ بڑے کا نام نور احمد اور چھوٹے کا انوار احمد تھا دونوں باپ کے نقش قدم پر تھے اور جانتے تھے کہ ہم اقلیت کے ہیں ہماری قابلیت اور تعلیم ہی ہم کو کوئی مقام دلا سکتی ہے اس لئے ان کی محنت دیگر طلبا سے زیادہ ہونی چاہئے سالار نے بھی ان کو باور کرا دیا تھا کہ ''ہمارا مقام ہم کو خود بنانا ہے ہماری مدد کوئی نہیں کرے گا ہمارے ساتھ تعصب ہمیشہ سے رہا ہے اور آگے بھی رہے گا۔''

سالار کے لڑکے مزید تعلیم کے لئے امریکہ چلے گئے۔ سالار کے پاس تو اتنا نہیں تھا کہ ان کو مزید پڑھنے کو امریکہ بھیج سکتا مگر لڑکوں نے اتنی محنت کی کہ وزارت تعلیم نے ان کو وظیفہ دیا اور وہ مزید تعلیم کے لئے امریکہ چلے گئے۔ وہاں پر بھی انہوں نے کمپیوٹر مینوفیکچرنگ میں اعلیٰ ڈگری لی اور وہیں پر ایک فیکٹری میں ملازمت ان کو مل گئی۔ دونوں لڑکے نہایت سادہ مزاج کے تھے ان کو پڑھنے کا شوق تھا۔ زمانہ بدل رہا تھا نئی نئی ایجادات آرہی تھیں کمپیوٹر نے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا اس کے انجینئر کی بہت مانگ تھی۔ بنگلور اس ٹیکنالوجی کا ہندوستان میں گڑھ تھا۔ یہاں پر سرمایہ دار بڑی بڑی فیکٹریاں قائم کر رہے تھے نور احمد کو ایک فیکٹری کی آفر

ہوئی اور وہ بنگلور آگیا۔

انوار احمد امریکہ میں ہی تھا۔ نور احمد ایک بڑے عہدے پر آیا تھا۔ سالار کے ریٹائرمنٹ کے دن قریب آرہے تھے دونوں لڑکے اپنے پیروں پر کھڑے تھے اور سالار احمد کی محنت اس کے کام آرہی تھی۔

چاندنی کی لائن بھی الیکٹرونک تھی اور وہ بھی کمپیوٹر میں اور مینوفیکچرنگ میں انجینئرنگ کرنا چاہتی تھی۔ انوار اور اس کی ملاقات بوسٹن امریکہ میں ہوئی۔ دونوں کے خیالات ایک جیسے تھے۔ دونوں کے دل میں کچھ کرنے کی امنگ تھی اور دونوں شوق سے پڑھنے آئے تھے۔ انوار احمد اپنی فیکٹری میں نئے نئے تجربات کر رہا تھا اس کی پوزیشن بہت نمایاں تھیں۔ چاندنی اس سے بہت متاثر ہوئی۔

''آپ انڈیا میں کس شہر کے ہیں؟'' چاندنی نے پوچھا۔

''میرا تعلق بنگلور سے ہے میرے والد پولیس ڈپارٹمنٹ میں ہیں۔'' انوار نے بتایا۔

''تعلق تو میرا بھی بنگلور سے ہے مگر میرے فادر ملازمت کے سلسلے میں بمبئی آگئے ہیں۔ وہ بہت بڑے سرجن ہیں۔'' چاندنی نے بتایا۔

اور دونوں کی دوستی ہوگئی۔ دونوں روز ملاقاتیں کرنے لگے اور آخر یہ دوستی محبت میں بدل گئی مگر انوار احمد سالار کا بیٹا تھا اس کے سامنے باپ کا کردار ہمیشہ رہا تھا امریکہ میں بھی اس نے اپنے کردار میں ذرا سا جھول نہیں آنے دیا تھا۔

اسی طرح چاندنی بھی نیک باپ کی بیٹی تھی دونوں آزاد ماحول میں رہتے ہوئے بھی خود کو آزاد خیال نہیں کرتے تھے ان پر ان کی تربیت اور بڑوں کے کردار کی بندش تھی۔

انوار نے ایک دن چاندنی کو کہا۔ ''ہماری دوستی امریکہ تک رہے گی اس لئے کہ ہندوستانی معاشرہ اور مذہبی رکاوٹ ہمارے درمیان ہوگی۔ یہاں پر ہم آزاد ہیں مگر میں اپنی مرضی سے اور تم اپنی مرضی سے کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے کیونکہ آخر ہم دونوں کو واپس جانا ہے۔ میں نے اس پر بہت سوچا ہے مگر بات سمجھ میں نہیں آرہی۔''

''تمہارے خدشات درست ہیں ہم دونوں ندی کے دو کنارے ہیں جو کبھی نہیں ملتے۔ مگر محبت صرف پانے کا نام نہیں ہے محبت چاہے جانے کا نام بھی ہے۔ تم مجھے نہ ملو مگر تم کو چاہنے سے مجھے کون روک سکتا ہے۔ میں امریکہ میں رہوں یا ہندوستان میں میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے دل میں جو آئیڈیل کسی مرد کا تھا اس کی تم مکمل تصویر ہو، اب دوسری کوئی تصویر میرے دل میں نہیں آسکتی۔ میں تم کو مجبور بھی نہیں کرتی کہ تم مجھے چاہو۔'' چاندنی نے جواب دیا۔

''میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں مگر سب لوگ میری طرح نہیں ہیں تم پر بہت دباؤ آئے گا۔ ہندو معاشرہ اور تمہارے والدین تم کو مجبور کر سکتے ہیں میں اپنی پوزیشن جانتا ہوں۔ ہندوستان میں مسلمان دوسرے درجے کے باشندے ہیں ہندو ذہن مسلمانوں کو قبول نہیں کرتا۔ سینکڑوں سال کا بھائی چارہ پارٹیشن کے وقت ختم ہو گیا ہزاروں مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا۔ صرف اس لئے کہ انہوں نے الگ ملک کا مطالبہ کر دیا تھا اصولی طور پر اس کو ہندو قیادت نے قبول تو کر لیا مگر اس کا بدلہ ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو قتل کر کے لیا۔ پٹنہ اور ہندو ریاستوں میں مسلمانوں پر جو ستم ہوا اس کی تاریخ گواہ ہے۔ اس کے چشم دید گواہ زندہ ہیں ان حالات میں، میں اور تم ہندوستان میں ایک ہو سکیں یہ ناممکن ہے؟'' انوار نے کہا۔

''ہم نے جو کہا وہ ایک حقیقت ہے میں جانتی ہوں۔'' چاندنی نے جواب دیا۔

''میرا باپ ایک سرکاری آفیسر ہے اور کٹر مسلمان ہے اس نے زندگی بھر رشوت نہیں کھائی کوئی غلط کام نہیں کیا اس کے کردار کی لوگ قسمیں کھاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ان کے اجلے کپڑوں پر ذرا سا بھی داغ لگے۔ میں اپنی محبت قربان کر سکتا ہوں

اپنی خوشی قربان کرسکتا ہوں مگر اپنے باپ کی نیک نامی پر دھبہ نہیں لگا سکتا۔" انوار نے کہا۔

"میری اور تمہاری حالت میں ذرا فرق نہیں ہے۔" چاندنی نے کہا۔

"تم ڈاکٹر ہردیال کی لڑکی ہو، میں سالار احمد کا لڑکا ہوں ہم دونوں میں بنیادی فرق تو یہی ہے۔

ڈاکٹر ہردیال فراخ دل کے مالک ہوں ذات پات پر بھی یقین نہ کرتے ہوں مگر ہیں تو ہندو وہ کیا چاہیں گے کہ تم ایک مسلمان کا گھر آباد کرو؟" انوار نے کہا۔

"تو پھر ایک ہی راستہ ہمارے پاس رہ جاتا ہے کہ ہم انڈیا نہ جائیں اور امریکہ میں ہی اپنا گھر بنالیں۔

یہ ہے تو بہت مشکل کام مگر اس کے سوا مجھے تو راستہ نظر نہیں آتا۔" چاندنی بولی۔

"مگر یہ کتنی بڑی خود غرضی ہوگی ہماری ضرورت ہمارے ملک کو ہے جو ٹیکنالوجی ہم نے اتنی محنت کے بعد حاصل کی ہے اس کا فائدہ ہمارا ملک نہ اٹھائے ہم صرف ذاتی فائدے کی خاطر اپنے پیاروں سے منہ موڑ لیں کتنی آنکھیں ہماری طرف لگی ہیں کتنے لوگ ہماری راہ تک رہے ہیں۔ ہمارے متعلق ان کے کتنے پروگرام ہوں گے کتنے ارمان ہوں گے تم نے اس پر غور نہیں کیا۔" انوار بولا۔

"دیکھو انوار میرا باپ شودر ہے اس کا باپ بھی شودر تھا اور پہلے بھی ایسا ہی تھا۔ ہزاروں سال سے میرے پرکھوں نے بڑی ذات کے ہندو کے ظلم ستم برداشت کئے ہیں پھر ملک آزاد ہوا تو میرے دادا کو سانس لینے کی مہلت ملی انہوں نے اپنے بچوں کو پڑھایا اور معاشرے میں ایک مقام حاصل کیا۔ اور پھر میرے تایا نے برہمن لڑکی سے شادی کرکے دادا کو خوش کیا اور میرے باپ نے ٹھاکروں کی لڑکی سے شادی کرلی، تم سمجھ سکتے ہو ایسا کرنے سے انہوں نے بڑی ذات کے لوگوں کو ذلیل کیا، انہوں نے ایک طرح سے انتقام بڑی ذات والوں سے لیا۔ وقت اتنا آگے

چلا گیا ہے کہ اب مجھے کوئی میلی نظر سے نہیں دیکھ [illegible] میں سرجن ہردیال کی بیٹی ہوں ذات برادری پیچھے [illegible] گئی ہے۔" چاندنی بولی۔

"شاید ایسا نہیں ہے برہمن اور ٹھاکر [illegible] میں آج تک کھٹک ہے تمہارے سامنے منہ پر وہ [illegible] کہتا مگر آپس میں اب بھی تمہارے خلاف باتیں کر[illegible] ہیں میرے والد کے ایک آفیسر تھے ان پر کسی سفلی کر[illegible] والے نے حملہ کردیا تھا مگر میرے والد نے اس کی [illegible] کردی اور اس سفلی کرنے والے کو پکڑ لیا اس نے بتا[illegible] اس پر اس کی بیوی کے ماموں نے حملہ کردیا جو [illegible] میں ان سے صرف اس لئے نفرت کرتا تھا کہ وہ شودر [illegible] اب بتاؤ۔" انوار بولا......

"تم کمشنر گوپال کی بات کر رہے ہو۔" [illegible] نے پوچھا۔

"تم ان کو کس طرح جانتی ہو۔" انوار [illegible] پوچھا۔

"وہ میرے تایا ہیں، ان کے چھوٹے [illegible] ہردیال کی میں لڑکی ہوں۔" چاندنی بولی۔

"اور میں کمشنر گوپال کے خاص اسسٹنٹ [illegible] احمد کا لڑکا ہوں۔" انوار بولا۔

"میں نے انکل سالار کا نام سنا ہے، تایا [illegible] بہت تعریف کرتے تھے۔" چاندنی بولی۔

"واہ یہ بھی خوب رہی اتنے دنوں سے ہم [illegible] ہیں اور آج پتہ چلا کہ ہم پہلے سے ہی قریب ہیں [illegible] سے ہماری ذمہ داری اور بڑھ گئی ہے مجھے اب ہردیال اور گوپال کی عزت کی طرف بھی دیکھنا ہے [illegible] بھی یہی کرنا پڑے گا۔" انوار بولا۔

"سب کی طرف دیکھنا ضروری تو ہے مگر [illegible] طرف کون دیکھے گا۔" چاندنی بولی۔

"ہماری طرف ہمارے جذبے ہیں پاک محبت ہے اور اگر خدا کو منظور ہوا تو سب ہوجائے گا۔ مگر میں تمہارے اور اپنے بزرگوں [illegible] امتحان میں ڈالنا نہیں چاہوں گا۔" انوار بولا۔

"گاڑی بہت بری طرح پھنس گئی ہے میں تم کو بتارہی تھی کہ میں اور میرے بڑے کسی مندر نہیں گئے۔ کسی بت کی پوجا نہیں کرتے تھے ہندو دھرم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو دھرم نے میرے بزرگوں کو سوائے دکھ اور غلامی کے دیا کیا۔

میرا دادا سخت خلاف تھا ہندو دھرم کے کیونکہ اس نے اپنی آنکھ سے ہندوؤں کے ظلم وستم دیکھے تھے۔ اس کے بعد میرے تایا اور باپ کے خیالات بھی آپ کی طرح تھے، میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ ہم لوگ نام کے ہندو ہیں ہماری قدیم پوتھیوں میں کیا لکھا ہے مجھے نہیں پتہ، اب تم مجھے کچھ بھی کہو، اب تک میرا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہے۔" چاندنی بولی۔

"زندگی بڑی الجھی ڈور کے مانند ہوتی ہے اس میں انسان کو ان گنت اور پیچیدہ راستے نظر آتے ہیں انسان کو کسی ایک راستہ کو تلاش کرنا ہوتا ہے جو سچائی کا راستہ ہو، اگر آدمی راستہ بھول جائے تو پھر انسان بھٹک جاتا ہے وہ زندگی بھر راستہ تلاش کرتا ہے مگر نہیں ملتا۔

مذہب ایک راستہ دکھاتا ہے خدا کی طرف جانے کا دنیا کا ہر مذہب کہتا ہے کہ خدا ایک ہے صرف اس کی عبادت کرنی ہے مگر انسان کو بھٹکا دیا گیا ہے۔ وہ ہزاروں خداؤں کی پوجا کرتا ہے اور بھٹکتا رہتا ہے میں ایک مسلمان ہوں میرا باپ پکا اور کٹر مسلمان ہے۔ اس نے جو سبق بچپن میں پڑھا ہے وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ تم کو دھرم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ مسلمان ہوں، مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اچھا انسان ہو جو اچھا انسان نہیں وہ مسلمان نہیں ہوسکتا، میرا باپ اچھا انسان ہے تو مسلمان ہے۔ میں اچھا انسان ہوں تو مسلمان ہوں۔"

"تمہاری بات تسلیم مگر انسان کتنا ہی خود سے بے نیاز ہو، اپنے بارے میں کچھ بھی خیال کرلے اگر وہ انسان ہے تو زندگی کی ضروریات سے الگ نہیں ہوسکتا اس کے اندر کی طلب تو باقی رہتی ہے اور انسانی صفات تو موجود رہتی ہیں ان ہی میں حسن و دلکشی اور پسندیدگی شامل ہیں یہ تو قدرتی جذبے ہیں ان سے انسان الگ نہیں ہوسکتا۔" چاندنی بولی۔

"میں نے اس سے کب انکار کیا ہے میں تم کو پسند کرتا ہوں اس کا اظہار میں برملا کرنے کو تیار ہوں۔ مگر ایک انسان ہونے کے ناطے کوئی بات کوئی حرکت ایسی بھی نہیں کروں جس سے تمہاری یا میری عزت ووقار میں فرق آئے، تمہارے خاندان یا میرے خاندان پر حرف آئے۔ مجھے تمہاری عزت عزیز ہے اپنی عزت کی طرح یہی انسانیت ہے یہی مسلمانیت ہے۔" انوار بولا۔

انوار کے خیالات اور چاندنی کے خیالات ایک جیسے ہی تھے۔ صرف مذہب کے بابت چاندنی کمزور تھی وہ کسی مذہب کے قریب نہیں تھی۔ مگر انوار احمد پکا مسلمان تھا وہ ہر جمعہ کو نماز پڑھنے بھی جایا کرتا تھا سالار احمد نے جو تربیت کی تھی اس کے اثرات امریکہ میں بھی تھے، وقت کے ساتھ ساتھ چاندنی کی محبت بڑھتی جارہی تھی انوار احمد نے یہ محسوس کرلیا تھا۔

انوار نے ایک دن چاندنی سے کہا۔ "دیکھو چاندنی تصوراتی اور حقیقی زندگی میں بڑا فرق ہے انسان کو سارے فیصلے خود کرنا ہوتے ہیں۔ دوسروں پر صرف اس وقت خود کو چھوڑا جاتا ہے جب وہ فیصلے کرنے کی عمر کے نہیں ہوتے۔ بزرگ کہتے ہیں طلب صادق ہو تو تکمیل کے مراحل تک پہنچتی ہے۔ میں تمہاری طلب کو شک کی نظر سے نہیں دیکھتا مگر دوسری طرف عقل کی ترازو پر رکھتا ہوں تو فیصلہ میرے خلاف ہوتا ہے تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے۔"

"ہاں بہت غور کیا ہے، بہت سوچا ہے اپنے دھرم کے بارے میں بھی اور تمہارے بارے میں بھی، میں نے دونوں کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ کر وزن کیا ہے تمہارا وزن ہمیشہ زیادہ رہا ہے، میرے خیال میں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں نے اپنے دھرم کے بارے میں کچھ جاننا ہی نہیں چاہا میرے بزرگ اس مذہب کے ستائے ہوئے لوگ تھے، ہمارے بزرگوں پر جو ستم

ہوئے وہ مذہب کے نام پر ہی ہوئے تھے پھر ہم اس کی طرف کیوں جاتے۔

دوسری یہ کہ میں نے تمہارے بارے میں مذہب سے زیادہ سوچا ہے تمہارے کردار اور اصول میرے لئے نئے ضرور ہیں مگر ان میں کسی کی دل شکنی کی بات نہیں ہے ہر آدمی آزاد ہے ہر عورت آزاد ہے ایک مقام پر ہر مسلمان عبادت کرلیتا ہے کسی کو کسی پر اعتراض نہیں ہوتا۔ میں زیادہ نہیں جانتی مگر جاننا چاہتی ہوں۔ تم میری مدد کروگے؟" چاندنی نے پوچھا۔

"میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ انسان کو کسی مقام پر اپنی طلب سے نفرت نہیں ہوتی۔ علم و آگہی تو بہت بڑی چیز ہے ہم جس قدر جانتے جاتے ہیں ہمیں اسی قدر اپنی جہالت کا احساس ہوتا جاتا ہے۔ مذہب کے بارے میں میری معلومات زیادہ نہیں ہیں بنیادی باتیں جانتا ہوں۔ مگر یہ کوئی برائی نہیں ہے اس کا انتظام ہوسکتا ہے اسلامی سینٹر یہاں پر ہیں مگر میرا ایک مشورہ ہے کہو تو بتاؤں۔" انوار نے کہا۔

چاندنی نے کہا۔ "تم ہی مشورہ دے سکتے ہو میرا اور کون ہے یہاں پر۔"

"تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو عمر کے لحاظ سے بھی بالغ ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ جو ذہین ہوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں وہ غلطیاں نہ کرتے ہوں۔ اپنے فیصلے پر پھر غور کرو اور اگر نہ سمجھ میں آئے تو ایک چکر بمبئی کا لگا کر آجاؤ، ڈاکٹر صاحب اور گوپال صاحب بہت سمجھدار اور دور تک دیکھنے والے لوگ ہیں۔ صرف میری خاطر کوئی ایسا فیصلہ نہ کرو جو تم کو شرمندہ کردے۔ دوسری بات یہ کہ اسلام میں سختی نہیں ہے اگر کسی کو اسلام کی تعلیمات متاثر کرتی ہیں اور وہ دوسرے مذہبوں سے اس کو افضل سمجھتا ہے تو بھی اس کو اسلام کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کسی لالچ یا فائدے کے لئے اسلام قبول نہیں کرنا چاہئے۔ اسلام کی روح کو سمجھنا ضروری ہے۔" انوار نے کہا۔

"تمہاری بات میں بہت وزن ہے میں نے جس طرف قدم بڑھایا ہے وہ کوئی غلط راہ نہیں ہے۔ میں بمبئی جاؤں گی ڈیڈی ممی سے مشورہ کروں گی، تاؤ سے بھی بات کروں گی اس معاملے میں کسی سے ڈرنا کیسا اور چھپانا کیسا تم نے ٹھیک مشورہ دیا ہے۔"

اور چاندنی بمبئی روانہ ہوگئی اچانک بغیر اطلاع کے اس کو دیکھ کر سب حیران ہوگئے۔

ہردیال نے کہا۔ "تمہارا اچانک آنا ضرور کوئی معنی رکھتا ہے۔"

"ڈیڈی آپ کی یاد آئی اور میں چلی آئی تعلیم تو میری ختم ہوچکی تھی صرف تجربے کی خاطر رکی تھی آپ حیران کیوں ہیں؟"

ہردیال مسکرائے اور بولے۔ "بیٹا میں نے تم سے زیادہ وقت دنیا میں گزارہ ہے۔ زیادہ تجربہ لیا ہے آدمی کتنا بھی ایماندار ہو مگر پورا ایماندار نہیں ہوتا۔ انسان کی ٹریجڈی ہے تم بتاؤ گی کہ تم اچانک کیوں آئی ہو مگر اس وقت معاملہ فہمی کی بات کررہی ہو۔"

"چاندنی گردن جھکائے کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "انوار نے ٹھیک کہا تھا، آپ بہت دور تک دیکھتے ہیں۔ انوار کے نام پر ہردیال کی آنکھوں میں تجسس کے سائے لہرائے وہ بولا۔ "یہ انوار کون ہے؟"

"یہ مجھ سے سینئر ہے ہم دونوں کی لائن ایک ہی ہے اس نے کمپیوٹر کی صنعت میں بڑے کامیاب تجربے کئے ہیں اور میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے یہ بنگلور کا رہنے والا ہے اور تاؤ کے خاص آدمی سالار احمد کا لڑکا ہے آپ تو جانتے ہیں مجھے پتہ نہیں تھا اچانک ایک دن باتوں باتوں میں مجھے پتہ چلا تھا بہت مضبوط کردار کا لڑکا ہے۔" چاندنی نے بتایا۔

"اس کا باپ بھی ایسا ہی ہے تم اس سے متاثر ہو شاید۔" ہردیال نے پوچھا۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گی، وہ اس قابل ہے کہ اس سے متاثر ہوا جائے۔" چاندنی بولی۔

"تم جانتی ہو کہ خیال کی پاکیزگی کے لئے ضروری ہے کہ قربت کے باوجود فاصلے رکھے جائیں۔" ہردیال بولا

"ہاں ڈیڈی مجھے پتہ ہے میں آپ کی بیٹی ہوں آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔" چاندنی بولی۔

"تم نے ان دشواریوں پر غور نہیں کیا جو موجود ہیں۔" ہردیال بولا۔

"خوب غور کیا ہے اسی کارن میں آئی ہوں میری سمجھ کی حد یہاں تک تھی، میں نے غور کیا مگر میں نہ سمجھ سکی اور آپ سے مشورہ کرنے چلی آئی۔" چاندنی بولی۔

"سالار کا بیٹا ضرور مثالی ہوگا مگر تم اور وہ چاہنے کی حد تک رہ سکتے ہو اس کے آگے راستہ بند ہے۔ ساری گڑبڑ دھرم کی ہے۔ مسلمان کیسا بھی ہو دھرم کا پکا ہوتا ہے۔" ہردیال نے کہا۔

"معاف کرنا ڈیڈی میں آپ سے پوچھتی ہوں آپ کس دھرم کو مانتے ہیں۔" چاندنی بولی۔

"تم نے بڑا نازک سوال کردیا۔ میرے باپ کو کسی مندر میں جانے کی اجازت نہ تھی اور دادا کو بھی نہیں تھی ہمارے ساتھ جو سلوک ہندوستان میں ہوتا آیا تھا وہ بدترین تھا۔ ہماری نہ کوئی خوشی تھی نہ ہم کسی کی خوشی میں شریک تھے، ہم غلام تھے ہم تو مندر کے اشلوک تک نہیں سن سکتے تھے اس کنوئیں سے پانی نہیں بھر سکتے تھے جو بڑی ذات کے لئے تھا، ہم کیا اور ہمارا دھرم کیا۔ دیش آزاد ہوا تو ہماری قسمت پلٹی اور کچھ عزت لوگوں کی نظر میں بن گئی، نام سے ہندو تو ہیں مگر دھرم کا پتہ نہیں یہ ہے کیا؟ برہمن نے ہم کو دھرم کی کتابوں سے دور رکھا کتنے وید ہیں۔ بھگوت گیتا میں کیا لکھا ہے؟ مہابھارت کیا کہتی ہے؟ پنڈت جو کہتا ہے سب مان لیتے ہیں۔ بڑے بڑے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو نے بھی اپنی مذہبی کتابیں نہیں پڑھی ہیں۔ سب لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔

"پنڈت نے ان کتابوں میں جو لکھا ہے بتایا نہیں اپنے فائدے کی باتیں وہ بتاتا ہے۔ کسی ہندو سے پوچھو کوئی ایک بھگوان نہیں بتائے گا، کوئی تین بتائے گا کوئی تین سو اور کوئی ہزاروں میں بتائے گا۔" ہردیال نے کہا۔

اور گھروں میں جو مورتیاں الگ الگ رکھی وہ کیا ہیں۔" چاندنی نے پوچھا۔

"میرے نزدیک تو ایشور کا تصور یہ ہے کہ ایک ہے اس کو کسی بھی نام سے پکارو فرق نہیں پڑتا ہے تو صرف اس کو پوجو۔" ہردیال بولا۔

"اس سلسلے میں مسلمانوں کا کہنا ہے کہ اللہ ذات میں کسی کو شریک کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ شرک معاف نہیں کرتا، انوار نے مجھے ایک روز یہ بتایا تھا۔"

"میری معلومات بھی زیادہ نہیں ہیں میں بتاؤں۔" ہردیال نے کہا۔

"ڈیڈی میں اسلام کے بارے میں پڑ چاہتی ہوں سمجھنا چاہتی ہوں۔" چاندنی بولی۔

"میں منع نہیں کرتا، اس لئے کہ انسان کو ایک کنارہ تو پکڑنا ہوتا ہے، میں درمیان میں ہوں کنارے پر پہنچو گی میں تم کو منع نہیں کروں گا۔"

چاندنی خوش ہوگئی۔ "ڈیڈی آپ گر ہیں۔" خوش ہوکر بولی۔

"اب میں دلی جاؤں گی تاؤ سے بھی مش کروں گی۔" چاندنی بولی۔

"میرا اور بھیا کا مشورہ ایک ہی ہوگا چا آزمالو۔" ہردیال بولا۔

چاندنی دلی روانہ ہوگئی گوپال اچانک ا سامنے دیکھ کر حیران ہوا اور خوش بھی ہوا بولا۔

"تم امریکہ سے کب آئیں؟"

چاندنی نے جواب دیا۔ "ابھی ایک ہفت ہے۔"

"تمہاری تعلیمی کیفیت کیا ہے؟" گوپال بو

"تعلیم تو ختم ہوگئی میں کچھ تجربے کرنے پریکٹیکل کے لئے رکی تھی۔" چاندنی بولی۔

"تو اب نہیں جاؤ گی! اس کا مطلب یہ؟" گوپال بولا۔

"میں آپ سے ایک مشورہ کرنے آئی تھی" چاندنی بولی۔

"تم انفارمیشن ٹیکنیکل لائن میں ہو اور میں قانونی آدمی تم کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔" گوپال بولا۔

"مشورہ پروفیشن کا نہیں ہے ذاتی نوعیت کا ہے۔"

"اچھا پوچھو کیا بات ہے؟" گوپال بولا۔

"پوچھنا یہ ہے کہ ہم لوگ ہندو ہیں اور یہ دھرم ذات پات کا دھرم ہے ہم خود کو کس جگہ رکھتے ہیں کوئی مقام ہمارے لئے ہے اس دھرم میں۔"

گوپال نے سوال سنا اور گردن جھکا کر بیٹھا رہا کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔

"یہ سوال تم نے کیا ہے کسی اور کو یہ سوال کرنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی اس لئے کہ میری میز پر دو ترنگے لہراتے ہیں مگر تم کو جواب دینا بھی ضروری ہے تو سنو بیٹا! مزہب کوئی ہو انسانوں سے محبت کا درس دیتا ہے مگر ہمارے بزرگوں کے ساتھ محبت کا سلوک کبھی نہیں ہوا، ہمارے سینوں میں بڑی ذات کے ہندو کے خلاف ہمیشہ نفرت رہی مگر ہمارے بزرگ کچھ نہ کرسکے اس لئے کہ دھرم کے ٹھیکیداروں نے ہمارے ہاتھ پیر اس طرح باندھ دیئے تھے کہ ہم صرف غلامی کرسکتے تھے اور یہی سینکڑوں سال سے ہورہا تھا۔ مگر دیش آزاد ہوا کچھ ہمارے ہمدردوں نے ہمارے لئے راستہ بنایا اور اس پر چل کر ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔ مگر قوانین کی موجودگی میں بڑی ذات کے لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں منہ پر پرنام کرتے ہیں اور بعد میں گالیاں دیتے ہیں انسان کا ذہن ابھی نہیں بدلا اس کے بدلنے میں نہ جانے کتنا وقت اور لگے گا۔" گوپال نے کہا۔

"آپ کے ایک دوست اور اسسٹنٹ سالار انکل ہوا کرتے تھے وہ کہاں ہیں؟" چاندنی بولی۔

"وہ دلی میں ہے، میرے پاس دن میں یا رات کو ضرور آتا ہے تم کو ان سے کام ہے۔"

"بہت ضروری کام ہے مگر ان کو ہی بتاؤں گی آپ بھی موجود ہوں گے۔" چاندنی بولی۔

رات کو سالار آگیا سب ڈرائنگ روم میں

شرح اموات

ٹی وی پر دیہاتی انٹرویو دے رہا تھا ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا، ہمارے گاؤں کے لوگوں کی صحت بہت اچھی ہے پندرہ سال بعد ہمارے گاؤں میں صرف ایک آدمی مرا ہے۔

انٹرویو لینے والا بولا کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ بدنصیب کون تھا اور کس مرض میں مبتلا ہوکر انتقال کرگیا؟ دیہاتی نے کہا۔ "وہ ہمارے گاؤں کا ڈاکٹر تھا اور اس کی موت فاقوں کے باعث ہوئی۔"

(شہزادہ صغیر)

موجود تھے۔ راجیش بھی موجود تھا۔ گوپال کی بیوی اجالا بھی موجود تھی سالار ایک گھر کے فرد جیسا تھا۔

"تم ہردیال کی لڑکی چاندنی ہو۔" سالار نے پہچان کر کہا۔

"ہاں انکل! میں وہی ہوں امریکہ سے ایک ہفتہ پہلے ہی آئی ہوں۔ آپ کا بیٹا انوار بھی تو وہیں پر ہے۔" چاندنی بولی۔

سالار نے پوچھا۔ "اس کو جانتی ہو؟"

"ہم دونوں نے ساتھ پڑھا ہے وہ مجھ سے سینئر ہیں، میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔" چاندنی بولی۔

"اب تو نہیں جاؤ گی۔" سالار بولے۔

چاندنی نے جواب دیا۔ "کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

راجیش بولا۔ "ارے اب کون جانے دے گا۔"

چاندنی نے مسکرا کر راجیش کی بات سنی اور بات آگے بڑھائی؟

"انکل آپ مذہب کے بارے میں کچھ بتائیں۔"

سالار بولا۔ "تم کس مذہب کے بارے میں

جاننا چاہتی ہو پہلے یہ بتاؤ۔"

"پہلے تو ہندو مذہب کے بارے میں بتائیں یہ کیا ہے؟"

"تم یہ سوال ایک مسلمان سے کررہی ہو میں تم سب کو عزیز رکھتا ہوں کسی کی بھی دل شکنی ہو میں نہیں چاہوں گا اس لئے یہ سوال واپس لے لو کچھ اور پوچھ لو۔"

"انکل یہ ضروری ہے، میں ذہنی طور پر خلفشار میں مبتلا ہوں۔"

گوپال نے کہا۔ "سالار تم جو کہنا چاہتے ہو کہو یہاں پر کوئی پورا ہندو نہیں ہے۔"

"سر بات یہ ہے کہ زبان پر ایک بات آتی ہے تو اس کو پورا کرنا پڑتا ہے، بہت نازک سوال ہے اس کا جواب تلخ بھی ہوسکتا ہے۔" سالار نے کہا۔

"ہر دوا میٹھی نہیں ہوتی دوا کی تلخی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔" گوپال بولا۔

سالار نے کہنا شروع کیا۔ "ہر دور میں اور ہر قوم میں ریفارمر آتے رہے ہیں۔ کسی نے کچھ نام دیا کسی نے کچھ مگر آپ ان کے پیغام پر غور کریں سب کا پیغام خدائے لاشریک کے بارے میں وہ بتاتے رہے۔ حضرت آدمؑ سے چلیں اور آج کے دور میں آجائیں کسی نے بتوں کی پوجا کا نہیں کہا۔ بدھا (گوتم بدھ) نے بھی اپنے آخری پیغام میں یہی کہا کہ تم لوگ میرے بت بنا کر نہ پوجنا۔ ہندو دھرم کی ہر کتاب کو پڑھ لیں کسی میں بت پرستی کا نہیں کہا گیا ہے۔ پھر یہ بتوں کی پوجا کہاں سے شروع ہوگئی۔ اس کی کوئی تاریخ کسی کے پاس ہے؟ کس نے یہ شروعات کی؟ کس نے پہلا بت کس کا بنایا؟

پھر سوال ہوتا ہے ایشور کون ہے دیوی دیوتاؤں کی حیثیت کیا ہے؟ یہ خود سے طاقت ور ہیں یا ان کو کسی نے طاقت دی ہے، جس نے ان کو طاقت دی ہے وہ کون ہے پھر اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو طاقت دیتا ہے اس کو پس پشت ڈال کر ان کو کیوں پوجا جارہا ہے۔

آگے بڑا اہم سوال ہے انسانوں کی چار طبقوں میں تقسیم کی ہے اور کس کے حکم پر ہوئی ہے اگر ایشور کے کہنے سے کی گئی ہے تو کیا اچھوت اس کی مخلوق نہیں ہیں۔ اور اگر کسی خاص طبقے کے انسان نے کی ہے تو پھر یہ انسان اتنا بااختیار ہے کہ اتنا بڑا کام کرسکے اور کیا وہ اتنا باکردار ہے کہ وہ یہ تقسیم کرے۔

دنیا بنانے والا انسان پر ایسا ظلم ہرگز نہیں کرے گا۔ میں اس کو خدا کہتا ہوں تم ایشور کہتے ہو، دنیا کی ہر مذہبی آسمانی کتاب میں صرف ایک خدا کا حوالہ ہے۔ صرف ایک خدا کی عبادت کا کہا گیا ہے، اسلام میں تو شرک بدترین گناہ ہے اس کی تو معافی ہی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ میں تم کو کیا بتاؤں۔" سالار نے بات ختم کی۔

"انکل اس کا مطلب ہوا کہ چار طبقوں کی تقسیم ہی غلط ہوئی تھی۔" چاندنی بولی۔

"میں کسی کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کا یا اس کو برا کہنے کا قائل نہیں ہوں اس لئے کہ جواب میں مجھے بھی کچھ سننا پڑے گا تم نے پوچھا تھا اور یہاں پر سب اپنے تھے اس لئے میں نے تم کو بتایا ہے اگر کسی کی دل شکنی ہوئی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔" سالار بولا۔

گوپال نے جواب دیا۔ "تمہاری باتیں میرے لئے نئی نہیں ہیں کیونکہ میرے بزرگوں کے ذہنوں میں یہ سوالات تھے اور ان کے علاوہ ہزاروں لوگوں کے ذہنوں میں برہمنوں کی ناانصافیاں تھیں اس لئے ہندو سرکار نے ان قوانین پر پابندی لگائی اگر پہلے والا قانون جو ہزاروں سال سے تھا اگر ٹھیک تھا تو پھر اتنی آسانی سے ختم کس طرح ہوا، کسی نے نئے قانون کے خلاف آواز کیوں نہ اٹھائی اس کی وجہ یہ تھی کہ سب جانتے تھے کہ جو ہو رہا ہے غلط ہے کچھ لوگ اکثریت پر ظلم کررہے ہیں اس کو ختم ہونا چاہئے دھرم سے ہماری دوری کی وجہ بھی یہی ہے کہ دھرم کو تو چند لوگوں نے مندروں میں قید کرکے رکھا تھا، اپنے مطلب کی باتیں سامنے لاتے تھے۔

راجیش بھی بولا۔ "ڈیڈی ہم تو نام کے ہندو ہیں مندر ہم جاتے نہیں، ہندو دھرم کے بارے میں جانتے نہیں، اصل بات یہ ہے کہ ہمارا کوئی دھرم ہی نہیں۔"

اجالا گوپال کی بیوی نے بیٹے کو کہا۔ "تم پڑھ لکھ کر ناستک ہوگئے ہو اور دھرم کو بھولتے جارہے ہو میں نے تم کو جو تعلیم بچپن میں دی تھی اس کو بھول گئے ہو۔"

"ممی بہت سی باتیں تو میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی ہیں۔ جس مذہب میں اتنی بہت ذاتیں ہوں اور اتنے بہت دیویاں اور دیوتا ہوں تو بتائیں کس کی طرف آدمی جائے۔ کس کو مانے کس کو نہ مانے۔" راجیش نے جواب دیا۔

گوپال بولا۔ "اچھا تم ایک نئی بحث شروع کرو تمہاری ممی برہمن ہیں تم ان کو قائل نہیں کرسکو گے۔"

پھر گوپال حیران ہوکر بولا۔ "سالار تم نے تو ہم سے بھی کہیں زیادہ ہندو مذہب کو پڑھا ہے۔"

"سر بات یہ ہے کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ شوق ہوتا ہے مجھے تاریخ پڑھنے کا شوق رہا ہے میں نے ہر مذہب کے بارے میں پڑھا ہے جب بھی وقت ملا جو کتب میرے ہاتھ آئیں میں پڑھتا رہا۔" سالار بولا۔

"واقعی انکل آپ کی معلومات حیرت انگیز ہیں۔" چاندنی بولی۔

"بات ادھوری رہ گئی ہے پوری بات سن لیں۔" سالار نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

دھرم کے ویدوں کا ذکر آئے گا تو ہندو دھرم میں چار وید ہیں یہ سب مختلف منتروں کا مجموعہ ہیں ہندوؤں کی مستند ترین لغت کی کتاب جس کا نام نرکت ہے اس میں لکھا ہے کہ جس مقصد کو جس دیوتا کے ذریعہ رشی نے پورا ہوتا ہوا جان کر تعریف کی ہے وہی دیوتا کا منتر ہے اس طرح گوناگوں مقاصد سے رشیوں نے منتر لکھ ڈالے ہیں۔

جیسے پہلی کتاب کا نام رگ وید ہے اس کے دس ہزار منتر ہیں اور دس منڈیوں میں تقسیم ہے۔ سارا وید نظم میں ہے اس میں خداؤں کی تعریف اور بزرگوں کے گیت ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کو مخاطب کرکے ان سے دعائیں کی گئی ہیں۔ رگ وید کو سب ویدوں سے پرانا وید خیال کیا جاتا ہے۔ اگر ویدوں کی کہانی شروع ہوگئی تو بات بہت لمبی ہوجائے گی۔" سالار نے کہا۔

گوپال نے کہا۔ "میں نے چار ویدوں کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھا ہے تمہاری بھابی کو سب کے نام پتہ ہیں۔"

"دوسرا وید، یجر وید، سام وید، اتھروید، یہ ہیں چار وید۔" اجالا بولی۔

"بھابی آپ کی معلومات زیادہ ہیں۔" سالار بولا۔

"گوپال کے گھر آکر میں بھی پوجا پاٹ سے دور ہوگئی ہوں۔" اجالا بولی۔

"انکل مجھے ان ویدوں یا کسی اور کتاب میں کوئی دل چسپی نہیں ہے، مجھے اسلام ایک سیدھا اور سچا مذہب لگا ہے اس میں ذات پات چھوت چھات، چھوٹے بڑے کے بھید بھاؤ نہیں ہیں، آپ کچھ بتائیں۔"

"کتنے حیرت کی بات ہے ایک ہندو گھرانے میں بیٹھا ہوں اور تم میرے مذہب کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔ میں اس سے اس گھرانے کی فراخ دلی اور وسعت نظری کا اندازہ کرسکتا ہوں۔" سالار بولا۔

اس کے علاوہ اس خاندان کا پس منظر بھی ہے اگر میرے باپ دادا کو انسان سمجھا گیا ہوتا۔ ہندو معاشرے نے ان کو عزت دی ہوتی ان کو ذلیل نہ کیا گیا ہوتا تو ہمارے ذہنوں میں ہندو کے خلاف بغاوت کے جذبات نہ ہوتے بلکہ ہندو مذہب کے خلاف کبھی خیال نہ آتا۔"

اب اگر ہماری نئی نسل کسی اور طرف دیکھ رہی ہے تو اس میں ان کا کیا قصور ہے یہ لوگ باشعور ہیں تعلیم یافتہ ہیں خود اپنا مقام مقرر کرنا چاہتے ہیں میں ان کو روک نہیں سکتا اس لئے کہ یہ ان کا بنیادی حق ہے یہ اسلام کو سمجھنا چاہتی ہے۔ تو ضرور ایسا کرے۔" گوپال نے کہا۔

چاندنی واپس امریکہ چلی گئی مگر گوپال اور ہردیال کو ایک نئی سوچ دے گئی دونوں بھائیوں کی سوچ میں بہت بڑی تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ مگر دونوں نے اس کو اپنے حد تک رکھا دونوں نے اپنی بیویوں تک کو ہوا نہیں لگنے دی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ گمنام آدمی نہیں

ہیں ان کا ایک مقام ہے ہزاروں لوگوں سے ان کا روز کا تعلق ہے اور وہ ہندوستان میں رہتے ہیں ہندو معاشرے میں ان کو رہنا ہے سب ان کے دوست نہیں کچھ بظاہران کے دوست نظر آتے ہیں مگر پیٹھ مڑتے ہی ''سالا ہے چمار اور نخرے برہمنوں والے کرتا ہے ارے بھلا کرے اس سرکار کو جوان لوگوں کو اٹھا کر ہمارے سر پر بٹھا دیا ہے بس چلے تو مار مار جوتے کھوپڑی گنجی کردیں۔''

گوپال اور ہردیال دونوں اسلام سے متاثر ہوئے سالار کی باتوں نے ان کو پختہ کردیا مگر وہ ظاہر میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکے۔

''دیکھو سالار! میں کبھی ہندو نہیں تھا میں نے کسی بت کو سجدہ نہیں کیا کسی مندر میں کبھی نہیں گیا تم کہہ سکتے ہو کہ میں بے مذہب تھا میں تم سے متاثر ہوا، تمہاری کتابیں میں نے پڑھی ہیں میں اندر سے مسلمان ہوں، نماز بھی میں نے سیکھ لی ہے تم مجھے مسلمان کردو، مگر میں ظاہر نہیں کروں گا اور صرف خدا کی عبادت کروں گا اور کسی کو ہرگز نہیں مانوں گا اور وقت آنے پر ظاہر بھی کروں گا۔ تم یہ بات اپنی حد تک رکھنا تم جانتے ہو، ظاہر ہونے کے بعد کیسا طوفان اٹھے گا مسلمانوں کے خلاف، قصوروار میں ہوں گا مگر سزا بے قصور مسلمانوں کو ملے گی۔'' گوپال نے کہا۔

''میں آپ کی مجبوری سمجھ رہا ہوں میں آپ کی پوری مدد کروں گا آپ نے نیکی کی طرف قدم بڑھایا ہے تو آپ کی غیبی مدد بھی ہوگی۔ آپ ایک سچے ایماندار آدمی ہیں۔ صاحب ایمان ہوجائیں گے تو آپ کا رتبہ اللہ کے پاس ضرور بڑھ جائے گا۔ چاندنی کا کیا حال ہے؟'' سالار بولا۔

''تم کو سن کر خوشی ہوگی کہ چاندنی مسلمان ہوگئی ہے اس نے یہ بات صرف مجھے فون پر بتائی تھی اور کہا تھا کسی کو نہ بتاؤں تم پہلے آدمی ہو جس کو میں بتا رہا ہوں تم کو بتانا اس لئے بھی ضروری تھا کہ اس نے تمہارے بیٹے انوار سے نکاح بھی کرلیا ہے اور شاید دونوں کا ارادہ واپس آنے کا نہیں ہے کیونکہ سرجن ہردیال کی لڑکی کا قدم اس کے باپ کے لئے بہت خطرناک ہوسکتا ہے میرے لئے اور میرے پورے گھر کے لئے اچھا نہ ہوگا۔'' گوپال بولا۔

''انوار نے مجھے نہیں بتایا اس کا دکھ مجھے ہے مگر خوشی بھی ہے کہ اس نے ایک نیک کام کیا ہے۔'' سالار نے جواب دیا۔

''انوار اور چاندنی دونوں کو پتہ ہے کہ مجھے بتانے کا مطلب یہ ہے کہ تم کو بھی پتہ چل ہی جائے گا۔ دوسرے انوار کو ڈر ہو کہ تم ایک ہندو لڑکی سے شادی کرنے سے منع ہی نہ کردو۔ یہ میرا خیال ہے تم یہ بتاؤ کیا تم خوش نہیں ہو۔'' گوپال نے پوچھا۔

''میں بہت خوش ہوں دہری خوشی ہے ایک تو انوار کی شادی دوسری چاندنی کا مسلمان ہوکر شادی کرنا، ابھی اس خبر کو سال دو سال کسی کو پتہ نہ چلے تو اچھا ہوگا۔'' سالار نے جواب دیا۔

''میں تمہارا اشارہ سمجھ رہا ہوں تم جو خدشات رکھتے ہو ان پر میری نظر بھی ہے، سیکولر ہندو ابھی اتنا طاقتور نہیں ہوا کہ ہے کہ تم کو اور مجھ کو برہمن کے ترشول سے بچا سکے ابھی کچھ اور انتظار کرنا ہوگا ابھی کچھ اور قدم جمانا ہوں گے۔'' گوپال نے کہا۔

چاندنی نہیں آئی ہردیال کو اس نے بتادیا ہردیال کے خیالات گوپال سے الگ نہیں تھے روشنی بھی چاندنی کے پاس چلی گئی۔ راجیش اور دنیش دونوں کو تعلیم مکمل کرکے لندن بھیج دیا گیا۔ دونوں بھائی پلان پر کام کررہے تھے مگر دونوں اپنی اپنی فیملی کو بھی محفوظ کرنا چاہتے تھے وقت گزرتا رہا۔

سالار احمد ریٹائر ہوگئے۔ سالار کے بعد گوپال نے بھی ریٹائرمنٹ لے لی۔ حالانکہ اس کی ضرورت سرکار کو تھی مگر اس نے بیماری کا بہانہ کیا اور امریکہ چلا گیا اجالا بھی اس کے ساتھ تھی وہ جلد از جلد ہندوستان کے اس ماحول سے نکلنا چاہتا تھا جس میں وہ نماز بھی چھپ کر پڑھتا تھا۔ چاندنی نے اس کو نماز پڑھتے دیکھا تو وہ حیران رہ گئی۔

''تاؤ آپ بھی۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''تو نے ایک راستہ دکھایا تھا میں نے سوچا دیکھیں اس راستہ پر کیا ہے۔ دو چار قدم چلیں تو مگر دو چار قدم کیا چلے کہ چلتے گئے اب جا کے پتہ چلا کہ اصل تو یہ ہے، ہم تو کاغذی پھول سونگھتے رہے ہیں، اب بہت سکون ملتا ہے، نماز کے بعد دل اندر باہر سے پاک ہوجاتا ہے میں نے ہندوستان چھوڑا صرف اس لئے ہے کہ میں آزادی سے خدا کی عبادت کرسکوں میں یہاں پر مسلمان ہونے کا اعلان کروں گا اور کسی بھی مسلم ملک میں رہ جاؤں گا میرا ارادہ ہندوستان جانے کا نہیں ہے مگر ابھی مجھے ہردیال کا انتظار کرنا ہے اس کے آنے کے بعد میں اعلان کردوں گا۔ راجیش اور دنیش کو لندن اسی غرض سے بھیجا گیا تھا اب صرف ہردیال اور اس کی بیوی ہیں۔'' گوپال بولے۔

''واہ تاؤ آپ نے کمال کردیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''انسان کے اندر جب روشنی پیدا ہوجاتی ہے میرا مطلب ایمان کی روشنی سے ہے پھر وہ اس روشنی کو اور پھیلانا چاہتا ہے نیکی کا عمل محدود نہیں رہتا نیکی کو جتنا پھیلاؤ گے یہ پھیلے گی اور آدمی کو اس عمل کے بدلے خدا نہ جانے کتنے درجات بلند مرتبہ دے گا وہ کسی کے نیک کام کو رائیگاں نہیں کرتا۔ میں یہاں آکر خود کو کتنا ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں اس کا صرف میں اندازہ کرسکتا ہوں۔ سالار کہتا ہے ہم خدا کے بتائے راستے پر آجائیں تو خدا سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہر ضرورت وہ پوری کرتا ہے مگر انسان بے صبرہ ہے اور ضدی ہے وہ اس طرف چلا جاتا ہے جس طرف جانے کو منع کیا گیا ہے اپنے لئے خود مشکلات پیدا کرتا ہے الجھنیں پیدا کرتا ہے اور پھر ٹھوکریں کھاتا ہے مگر زندگی کے کسی موڑ پر اس کو احساس ضرور ہوجاتا ہے کہ وہ غلط تھا اگر قسمت کا اچھا ہوا تو مہلت مل جاتی ہے اور وہ توبہ کرلیتا ہے توبہ کے دروازے تو ہر وقت کھلے ہیں کوئی توبہ کرے تو معافی کا طلب گار ہو تو رحم اور کرم تو وہ کرنے کو تیار ہے کوئی آئے تو۔'' گوپال نے کہا۔

''واہ تاؤ کتنی خوبصورت بات انکل نے آپ کو بتائی ہے۔'' چاندنی بولی۔

''تم نے مسلمان ہوکر نام نہیں بدلہ۔'' گوپال نے کہا۔

''انوار کہتے ہیں یہ بھی غیر اسلامی نام نہیں ہے اور آپ اب تک گوپال شرما ہیں۔'' چاندنی بولی۔

''اب میرا نام یوسف احمد ہے مگر پاسپورٹ پرانا ہے اسی پر سفر کررہا ہوں اس لئے یہ نام چل رہا ہے جب اعلان کروں گا تو پاسپورٹ بھی بدل جائے گا۔'' گوپال بولا۔

''گھپ اندھیرے کو صرف ایک کرن کی روشنی روشن کردیتی ہے اندھیرا کتنا ہی قدیم ہو۔ صرف ایک کرن سے دور ہوجاتا ہے میں نے کب سوچا تھا کہ میں آپ سے مشورہ کرنے آؤں گی اور آپ کے دل میں بھی روشنی کردوں گی یہ انوار احمد کا مشورہ تھا اس سارے ثواب کے حق دار وہی ہیں۔'' چاندنی نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''میں نے اور ہردیال نے صدیوں کے اندھیرے کو دور کرنے کی کوشش کی تھی اس میں ہم دونوں کسی حد تک کامیاب ہوئے تھے مگر اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اندھیرا تو اب دور ہوا ہے روشنی تو اب آئی ہے۔''

''صبح تو اب ہوئی ہے میرے لڑکوں کے خیالات مجھ سے الگ نہیں راجیش تو اسلامی کتابیں پڑھتا رہا ہے۔ یا اللہ مجھے میرے ارادوں میں کامیابی دے۔'' گوپال نے کہا۔

چاندنی بولی۔ ''انشاء اللہ آپ ضرور کامیاب ہوں گے کیونکہ آپ کے ارادے نیک ہیں۔''

وقت کتنی تیزی سے گزر گیا اندازہ نہ ہوسکا۔ چاندنی کے ہاں پہلی خوشی ہوئی اور سالار احمد بنگلور سے بھاگے چلے آئے۔

''مبارک ہو سالار احمد تم دادا بن گئے۔'' گوپال نے کہا۔

''آپ کو بھی مبارک ہو آپ نانا بن گئے۔''

سالار احمد ہنس کر بولے۔
"اب روشنی کے بارے میں سوچنا ہے اس کی تعلیم بھی ختم ہوگئی ہے کوئی مناسب لڑکا ملا تو اس کی بھی شادی کردوں۔" گوپال نے کہا۔
"سر لڑکا تو ہے اب آپ اور میں رشتہ دار بھی ہیں اور دکھ سکھ کے ساتھی بھی میرا لڑکا نور احمد بنگلور میں ایک فیکٹری میں انجینئر ہے آپ نے اس کو نہیں دیکھا اس نے پوری تعلیم انڈیا میں لی ہے مگر اس کے لئے سرجن صاحب کی رائے بھی ضروری ہے۔" سالار نے کہا۔
"درست کہا تم نے ہردیال آخر باپ ہے اور دوسری بے چیدگی بھی موجودگی ہے میری بیوی تو اتنی سمجھدار تھی کہ میرے رجحان کو دیکھ کر اس نے خود کو بھی چیک کیا اور اسلامی کتابیں پڑھنا شروع کردی نماز بھی سیکھ لی اور مسلمان ہوگئی میں نہیں کہہ سکتا کہ ہردیال کا کیا ماحول ہے اور روشنی کے خیالات بھی پتہ نہیں ہیں یہ کام چاندنی کرے گی۔ میں ہردیال سے بات کرتا ہوں میری طرف سے تو ہاں ہے نور احمد تمہارا بیٹا ہے تو ظاہر ہے اچھا ہی ہوگا۔" گوپال بولا۔
"یہ معاملات بہت سخت نظر آتے تھے الجھے نظر آتے تھے۔ مگر انسان نیکی کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو قدرت اس کے لئے آسانیاں پیدا کردیتی ہے۔
ہردیال نے کہا۔" میں آرہا ہوں۔ چاندنی نے بتایا روشنی تو نماز پڑھتی ہے پوری مسلمان ہے۔"
ایک ہفتہ کے بعد ہردیال اور اس کی بیوی آگئے اور آتے ہی اسلامی سینٹر جا کر دونوں باقاعدہ مسلمان ہوگئے پورا گھرانہ خوش تھا راجیش اور دنیش بھی آچکے تھے۔ روشنی پھیل رہی تھی آخر وہ کیوں نہ اس روشنی سے فائدہ اٹھاتے۔
"آج میری زندگی کا حسین دن ہے۔" گوپال نے کہا۔
"ہاں بھائی جان! ہردیال جو کہ اب یونس احمد تھا بولا۔" آج کتنا اچھا دن ہے۔"
"مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے دماغ کے تاریک گوشے بتدریج روشن ہورہے ہیں۔ بھولا ہوا سبق آرہا ہے، پردے ہٹ رہے ہیں، تاریکی دور ہو رہی ہے، روشنی ابھر رہی ہے، میرے ذہن کی موٹی دیوار شگاف ہورہے ہیں اور ذہن کے اندھیرے گوشے روشنی میں نہار ہے ہیں سورج نکل رہا ہے اور میں اس کی روشنی میں ڈوبا ہوا ہوں، مجھے دور تک نظر آرہا ہے شاید میں اپنی ذہنی اور قلبی کیفیت کو پوری طرح بیان نہیں کرسکتا۔"
سالار احمد بولے۔ "آپ نے درست فرمایا سیکڑوں سال کی گرد صاف ہوئی ہے، اندھیرا دور ہوا ہے، آپ کو ایسا ہی لگ رہا ہوگا۔ میرا یقین کامل ہے خدا سے عظیم تر کوئی مالک اور سلطان نہیں وہی ہر شے کا خالق ہے وہی سب کا مالک ہے اسی سے سب کی ابتدا ہے اور رسائی تک سب کی انتہا، وہی سلطان السلاطین ہے سب کچھ اس کی منشاء اور مرضی سے ہوتا ہے آپ کے خاندان کو نیک راہ پر لایا گیا ہے صرف اس لئے کہ آپ دونوں بھائی اس لائق سمجھے گئے، آپ نے انسان بن کر دکھایا، مسلمان وہی ہوسکتا ہے جو انسان ہو۔ آپ دونوں کا رتبہ میرے نزدیک بہت بلند ہے، میں آپ دونوں کو سلام کرتا ہوں۔"
سالار احمد نے کہا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملانے لگے تھے۔ گوپال نے فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر سالار احمد کو گلے لگالیا۔ ہردیال نے بھی سالار کو گلے لگایا۔ پورا گھرانہ خوشیوں سے جھوم رہا تھا۔
صوفے پر بیٹھنے کے بعد ہردیال بولا۔ "میں نے بہت غور کیا ہے اور یہ بات حقیقت ہے کہ دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں ان میں اسلام ہی پکا سچا اور اونچ نیچ سے مبرا مذہب ہے۔ عبادت میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا، کسی بھی بڑے کے لئے کوئی مخصوص جگہ نہیں ہوتی ہر آدمی اپنے عمل کے لحاظ سے بڑا چھوٹا ہے۔ عبادت کے لئے جس کو جہاں جگہ ملتی ہے بیٹھ جاتا ہے سب مل کر صرف ایک ہستی کو سجدہ کرتے ہیں، اور یہ حقیت ہے کہ۔
(جاری ہے)

آسیب زدہ چرچ

صفدر شاہین۔ملتان

نوجوان جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا تو سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا دل حلق میں آگیا کیونکہ منظر تھا ہی اتنا دہشت ناک، ایک ڈھانچہ سامنے موجود تھا اور اس کا سر دھڑ پر موجود نہیں تھا۔

دل ودماغ پر خوف ودہشت طاری کرتی......ایک انوکھی اور دل دہلاتی کہانی

"کسی دور میں یہ چرچ بے حد خوبصورت رہا ہوگا۔" شاویز چرچ کی پرانی اور بلند وبالا عمارت کو دیکھتا ہوا بولا۔
"واقعی......تم نے دیکھا نہیں اب بھی اس کی شان وشوکت وہی ہے جیسی شاید کئی سو سال پہلے ہوگی۔" عالیان اس کی بات پر سر ہلاتا ہوا بولا۔
"تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ چرچ کتنی صدی پہلے تعمیر ہوا ہوگا؟" شاویز نے پوچھا۔
"اب آگئے ہو نا......تو خود بھی پتہ لگا لینا۔" عالیان جھلا کر بولا۔
"ویسے اس کا عقبی حصہ تو بالکل کھنڈر بن چکا ہے۔" شاویز نے کیمرے سے مختلف مختلف زاویے سے تصویریں لینے لگا۔
"یار......یہ تمہارے شعبے میں صرف کھنڈرات

پر ہی کیوں ریسرچ کی جاتی ہے......؟'' عالیان نے پوچھا۔

''ایکچوئیلی...... مجھے شروع سے ہی پرانی چیزوں میں دلچسپی رہی ہے۔'' شاویز مسکرا کر بولا۔

''اچھا...... ذرا جلدی کرو۔ شام ہونے والی ہے......اور یہ چرچ تو ویسے بھی آسیب زدہ مشہور ہے۔''

عالیان کچھ دیر بعد بولا۔

''ایک تو تم بڑے وہمی ہو یار......'' شاویز اکتا کر بولا۔ ''تمہیں تو ہر چیز آسیب زدہ دکھائی دیتی ہے۔''

''صرف مجھے نہیں لگتا۔ یہاں کے سارے لوگوں میں یہ بات مشہور ہے......تم نئے ہو تا اس شہر میں اس وجہ سے نہیں جانتے۔'' عالیان نے کہا۔ ''دیکھا نہیں یہاں کے اردگرد کوئی آبادی نہیں ہے۔ یہ جو اردگرد کی زمینیں ہیں پہلے یہاں کاشت کاری کی جاتی تھی۔ مگر جب سے یہاں جنوں بھوتوں کا بسیرا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی زمینیں بھی چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گئے ہیں۔'' عالیان نے اردگرد کی زمینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جو بنجر پڑی تھیں۔ جہاں صحرائی پودے اگے ہوئے تھے۔

''چلو...... ذرا اندر سے دیکھتے ہیں۔'' شاویز کیمرہ بند کرتے ہوئے بولا۔

''نہ بابا نہ...... میں چرچ کے قریب جانے سے گریز کر رہا ہوں اور تم اندر جانے کی بات کرتے ہو۔'' عالیان خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب...... اندر جائے بغیر کیسے ریسرچ مکمل ہوگی۔'' شاویز حیرت سے بولا۔

''ایسا کرو۔ کل تم صبح صبح آجانا۔ اب شام ہونے والی ہے۔ اب واپس چلو۔'' عالیان اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''خیر، ایک تو تم بے حد ضدی اور ڈرپوک قسم کے آدمی ہو۔'' شاویز بیگ میں سامان رکھتا ہوا بولا۔ اس کے بعد دونوں وہاں سے واپس روانہ ہوگئے۔

وہ بے حد پرانا چرچ تھا۔ تقریباً 1600ء میں وہ تعمیر کیا گیا تھا۔ اس دور میں اس شہر کا وہ سب سے خوبصورت اور بڑا گرجا گھر تھا۔ لیکن اب وہ تقریباً کھنڈر بن چکا تھا۔ وہ چونکہ شہر کے گردونواح میں واقع تھا اس وجہ سے لوگوں کی آمدورفت اس طرف کم تھی اور جب سے وہ آسیب زدہ مشہور ہوا تھا۔ لوگوں نے اس طرف جانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔

شاویز کھنڈرات کے شعبے میں ریسرچ آفیسر تھا اور دوسرے شہر سے اس گرجا گھر پر ریسرچ کرنے کے لئے اسے بھیجا گیا تھا۔ اس شہر میں اس کے کالج کے زمانے کا دوست عالیان رہتا تھا۔ اس وجہ سے شاویز نے ہوٹل کے بجائے عالیان کے گھر رہنا زیادہ مناسب سمجھا۔ عالیان نے اس دن آفس سے چھٹی لی تھی تاکہ شاویز کو وہ چرچ دکھا سکے۔ وہ اسے اچھی طرح سمجھا چکا تھا کہ وہ آسیب زدہ مشہور ہے لوگ دن میں بھی اس کے قریب نہیں پھٹکتے۔ مگر شاویز جنوں اور بھوتوں کا بالکل قائل نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ صرف لوگوں کی اڑائی ہوئی افواہ ہے۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد عالیان تو آفس چلا گیا اور شاویز چرچ جا پہنچا۔ اس وقت تقریباً صبح کے دس بجے تھے آسمان چونکہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اس وجہ سے دھوپ کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ چرچ کا صدر دروازہ بند تھا۔ شاویز اللہ کا نام لے کر آگے بڑھا اور لکڑی کے اس دیوہیکل دروازے پر دباؤ ڈالا تو اس کے پٹ کھلتے چلے گئے۔ اندر بے حد وسیع وعریض ہال کمرہ تھا۔ شاویز اندر داخل ہوا تو لکڑی کا دروازہ خود بخود بند ہوتا چلا گیا۔

باہر چونکہ تیز ہوا چلی ہوئی تھی اس وجہ سے شاویز نے دروازہ بند ہونے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ دروازہ بند ہونے سے کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ شاویز نے جیب سے موبائل فون نکالا اور اس کی ٹارچ آن کر دی۔ اب وہ اس ہال نما کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ کمرہ مٹی اور دھول سے اٹا ہوا تھا جگہ جگہ مکڑیوں کے جالے لگے

تھے اسے کافی سارے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی تو وہ سمجھ گیا کہ یہاں چمگادڑوں کا بھی بسیرا ہے۔ ہال کے سامنے کی دیوار پر حضرت عیسیٰ کا بڑا سا بت نصب تھا ساتھ میں کراس بھی بنا ہوا تھا۔ سامنے بڑا سا چبوترہ تھا۔ چبوترے کے آگے میز اور کرسیاں نصب تھیں جو کہ شاید لکڑی کی تھیں یا لوہے کی۔ مٹی کی بے شمار تہوں کی وجہ سے ٹھیک طرح سے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میز اور کرسیاں کون سی دھات کی ہیں۔

اگر کوئی کمزور دل گردے کا مالک یہاں آتا تو اس پر ہیبت ماحول کو دیکھ کر ہی ڈر جاتا۔ مگر شاویز بہت حد دلیر آدمی تھا۔ اچانک فرش پر موجود لکڑی کے ایک تختے پر شاویز کا پاؤں پڑا اور کھٹاک کی زبردست آواز کے ساتھ ہی وہ تختہ ایک طرف ہٹ گیا اور اس سے پہلے کہ شاویز سنبھلتا وہ اس خلا میں جا گرا جو تختہ ایک طرف ہٹنے سے وہاں پیدا ہوا تھا۔

شاویز خلا سے گزر کر سخت فرش پر جا گرا۔ اچانک گرنے سے اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ خارج ہونے کی دیر تھی کہ وہاں یکدم ایک شور برپا ہوگیا۔ شاویز دہل گیا وہ جلدی سے اٹھا، اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا اس کا موبائل گرنے کی وجہ سے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اس نے موبائل کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو اس کی جلتی ہوئی ٹارچ کی وجہ سے وہ اسے نظر آگیا جو اس سے چند قدم دور پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے موبائل اٹھا کر لائٹ ادھر ادھر ڈالی تو اسے معلوم ہوا کہ وہ کوئی کمرہ ہے۔ چیخ وپکار کا سلسلہ اب بھی جاری تھا یوں لگتا تھا جیسے کافی ساری عورتیں مل کر چیخ رہی ہوں۔

وہ کمرہ اوپر والے ہال کمرے سے قدرے چھوٹا تھا۔ شاویز نے چیخ وپکار کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھنے لگا۔ ابھی وہ دو چار قدم ہی چلا ہوگا کہ اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور زوردار قہقہہ گونج اٹھا۔ قہقہے کی آواز کے گونجتے ہی چیخ وپکار یکدم تھم گئی۔ شاویز نے موبائل کی لائٹ نیچے ڈالی اور پاؤں سے ٹکرانے والی چیز کو دیکھا تو سہم گیا وہ ایک انسانی کھوپڑی تھی اور قہقہوں کی آواز اسی سے خارج ہو رہی تھی۔ شاویز یکدم ہی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اب اسے عالیان کی باتیں درست معلوم ہو رہی تھیں یقیناً وہاں آسیب وغیرہ کا ہی کوئی چکر تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے عالیان کی بات مان لینی چاہیے تھی اور یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ کھڑکھڑاہٹ کی آواز بلند ہوئی اس نے جلدی سے موبائل ٹارچ سیدھی کی اور آواز کی طرف روشنی ڈالی اب اس کی نگاہوں نے جو منظر دیکھا تو وہ واقعی ناقابل برداشت حد تک خوفناک تھا۔ وہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا جو کہ چلتا ہوا اسی کی طرف آرہا تھا اور اس کے چلنے سے بھی کھڑکھڑاہٹ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

اس ڈھانچے کے جسم پر کھوپڑی نہیں تھی وہ بغیر کھوپڑی کے چل رہا تھا۔ شاویز غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کا دل اتنی تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا کہ ابھی اچھل کر باہر جا گرے گا۔ ڈھانچہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا اور زمین پر جھک کر اس نے نیچے پڑی ہوئی کھوپڑی کو اٹھا کر اپنے کندھوں کے درمیان رکھ لی۔ اب وہ مکمل ہو چکا تھا۔

''خوش آمدید۔ مسٹر شاویز۔ میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔'' ڈھانچے کے منہ سے سرد سی آواز نکلی۔

''کک...... کک......کون......کون ہو تم؟'' شاویز خوف سے ہکلاتے ہوئے بولا۔

''میں محافظ ہوں یہاں کا۔ پورے پچاس سال بعد یہاں کوئی زندہ انسان آیا ہے۔'' ڈھانچہ بولا۔

''مم...... میں نہیں آؤں گا۔ مجھے واپس جانا ہے۔'' شاویز نے ڈرتے ڈرتے بولا۔

''ہاہاہا...... ہاہاہا......'' ڈھانچے نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''واپس...... ہاہاہا...... یہاں سے واپس جانا ناممکن ہے۔ تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ تم میرے ساتھ چلو۔''

''مگر تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو

‘‘.......؟’’ شاویز نے جلدی سے پوچھا۔
’’فادر نے تمہیں بلایا ہے......’’ ڈھانچے نے کہا۔
’’کون فادر......’’ شاویز نے دوبارہ پوچھا۔
’’اس چرچ کے فادر نے ...... مطلب پادری نے...... پادری سمجھتے ہونا......’’ ڈھانچہ بولا۔
’’مگر اس نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ ......’’ شاویز اثبات میں سر ہلا کر بولا۔
’’یہ انہی سے جا کر پوچھنا۔’’ ڈھانچہ سختی سے بولا۔ ’’جلدی چلو۔ وہ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔’’
شاویز نہ چاہتے ہوئے بھی ڈھانچے کے ساتھ چل پڑا۔ ڈھانچہ اسے ساتھ لئے کمرے سے باہر نکلا۔ باہر ایک تنگ راہداری تھی۔ وہ اس تنگ اور قدرے لمبی راہداری میں چلتے ہوئے ایک دروازے پر آرکے۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک کمرہ ہے۔ جو کہ پہلے کمرے کی نسبت کشادہ تھا۔ اس کمرے میں سامنے کی دیوار پر حضرت عیسیٰ کی بڑی سی تصویر اور کراس نصب تھا۔ سامنے ایک چبوترے پر بڑی سی کرسی رکھی تھی۔ جس پر ایک ڈھانچہ براجمان تھا۔ کمرے میں کافی سارے طاق بنے ہوئے تھے جس میں دیئے روشن تھے اس وجہ سے کمرے میں روشنی تھی۔
چبوترے کے آگے میز اور کرسیاں رکھی تھیں جن پر کافی سارے ڈھانچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے اندر داخل ہونے پر گردنیں موڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔ شاویز یہاں کا ماحول دیکھ کر خوفزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی تھا۔
ڈھانچہ شاویز کو لئے چبوترے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ شاویز سمجھ گیا کہ چبوترے پر موجود کرسی پر بیٹھا ہوا ڈھانچہ ہی فادر ہے۔
’’اچھا ...... تو یہ ہے وہ انسان......’’ فادر ڈھانچے کے منہ سے بارعب مگر سرد آواز خارج ہوئی۔
’’یس فادر......’’ شاویز کو لانے والا ڈھانچہ جھک کر بولا۔
’’کافی بہادر معلوم ہوتا ہے۔ جو ابھی تک ہوش وحواس میں ہے۔ ورنہ آج سے پچاس سال پہلے آدمی یہاں آیا تھا وہ تو پہلا منظر دیکھ کر ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔’’ فادر نے کہا...... ’’ٹھیک ہے اسے لے جاؤ اور پیچھے کرسی پر بیٹھا دو۔’’
ڈھانچہ شاویز کو ساتھ لئے واپس مڑا اور دوسرے ڈھانچوں کے عقب میں رکھی کرسیوں پر ایک پر اسے بیٹھنے کو کہا۔
’’بارہ بجنے والے ہیں۔ لنچ کا وقت ہونے والا ہے۔’’ فادر نے اونچی آواز میں کہا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ یکدم ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی بچے کی رونے کی آواز آنے لگی۔ شاویز نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ایک ڈھانچہ ہاتھوں میں ایک زندہ انسانی بچہ اٹھائے اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ بچہ تقریباً ایک سال کا تھا اور بری طرح رو رہا تھا۔ شاویز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بچہ یہاں کیسے آ گیا۔
ڈھانچہ اس بچے کو لے کر فادر کے سامنے پہنچ گیا۔ فادر نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر بچے پر پھونک ماری۔ فوراً ہی بچہ خاموش ہو کر سو گیا۔ شاویز سمجھ گیا کہ فادر جادو بھی جانتا ہے۔ ڈھانچے نے بچے کو چبوترے پر لٹا دیا۔ فادر اپنی کرسی سے اٹھ کر چبوترے پر بچے کے پاس آیا تو تمام ڈھانچے اونچی آواز میں بیک وقت کچھ پڑھنے لگے جو کہ شاویز کی سمجھ میں قطعاً نہیں آیا۔
فادر بچے کے قریب دوزانو بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ کا انگوٹھا بچے کی گردن پر پھیرا۔ انگوٹھا پھیرنے کی دیر تھی کہ بچے کی شہ رگ کٹ گئی۔ فادر نے بچے کو جلدی سے ہاتھوں پر اٹھایا اور سر سے ذرا اونچا کر لیا۔ شہ رگ سے خون نیچے گرنے لگا۔ فادر نے جلدی سے اپنا منہ کھولا اور گرتے ہوئے خون کی دھار کو اپنے کھلے منہ میں گرنے دیا۔ شاویز کی خوف سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔
’’اوہ......ایک سالہ معصوم بچے پر کس قدر ظلم......’’ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ نجانے کس کا بچہ اٹھا لائے ہیں اور بچے کے ماں باپ تو یقیناً اس کی

تلاش میں پاگل ہو رہے ہوں گے۔
فادر نے خون پینے کے بعد بچے کو چبوترے پر رکھ دیا اور خود کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے بعد کرسیوں پر موجود ڈھانچوں میں سے ایک ڈھانچہ اٹھا اور بچے کے قریب چلا گیا اس نے بچے کا بازو پکڑ کر زور سے کھینچا بچے کا بازو اس کے ہاتھ میں آ گیا وہ اسے دانتوں سے ادھیڑتا ہوا واپس کرسی پر آ بیٹھا اس کے بعد دوسرا ڈھانچہ بچے کے پاس گیا اس نے بچے کا دوسرا بازو پکڑ کر جسم سے الگ کیا اور اسے کھانے لگا اس طرح باری باری ڈھانچے اٹھتے گئے اور بچے کا گوشت کھانے لگے۔
شاویز نے کراہیت اور خوف سے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس طرح کا منظر تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ اس صدیوں پرانے گرجا گھر میں یہ ڈھانچے کہاں سے آئے؟ کیا یہ صدیوں سے پہلے مرے ہوئے عیسائیوں کے ڈھانچے ہیں؟ مگر یہ زندہ کیسے ہو گئے؟ ایسے ہی کئی سوالات اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔
’’پچاس سال بعد یہاں آنے والے انسان کے اعزاز میں رات کو خصوصی جشن ہو گا۔’’ فادر اونچی آواز میں بولا تو شاویز نے چہرے سے دونوں ہاتھ ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ سب کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔
’’اور اس انسان کو رات بارہ بجے ڈنر کے طور پر آپ سب کے سامنے پیش کیا جائے گا؟’’ فادر بولا۔ ’’اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔’’
اس کی بات سن کر ڈھانچے کرسیوں سے اٹھنے لگے اور دروازے سے باہر جانے لگے۔
’’جوزف۔’’ فادر کے منہ سے آواز خارج ہوئی۔ ایک ڈھانچہ رک کر فادر کی طرف مڑا۔
’’یس ہولی فادر’’ اس ڈھانچے نے جھک کر کہا۔ وہ ڈھانچہ تھا جو شاویز کو یہاں تک لایا تھا۔
’’اس انسان کو لے جاؤ اور ساتھ والے کمرے میں بند رکھو۔’’ فادر نے کہا۔

UPS

3 لڑکے ایک لڑکی سے! ’’پہلا میں تمہیں اپنی جان دے سکتا ہوں۔’’ لڑکی وہ تو سب کہتے ہیں۔
دوسرا۔ ’’میں تمہارے لئے چاند تارے توڑ کر لا سکتا ہوں۔’’ لڑکی! پرانا ڈائیلاگ ہے۔
تیسرا لڑکا۔ ’’میں تمہیں اپنا UPS دے سکتا ہوں۔’’ لڑکی! آنکھوں میں آنسو کے ساتھ، پاگل اتنا چاہتے ہو مجھے۔

(شاہد علی-لاہور)

فادر کی بات سن کر ڈھانچہ نے شاویز کی طرف مڑا اور شاویز جو ابھی تک فادر کی بات سن کر سکتے کے عالم میں تھا کہ اسے رات ڈھانچے ڈنر کے طور پر کھائیں گے، اٹھ کھڑا ہوا۔
’’میرے پیچھے پیچھے آؤ۔’’ جوزف نے کہا۔
شاویز اٹھ کر اس کے پیچھے دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ طاق میں رکھے چراغوں پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ چراغ نہ تھے بلکہ چھوٹی چھوٹی انسانی کھوپڑیاں تھیں جن سے روشنی پھوٹ رہی تھی وہ انسانی کھوپڑیاں سائز میں بہت چھوٹی تھیں۔ شاویز خوف اور حیرانگی سے اس ڈھانچے کے ساتھ باہر آ گیا۔ جوزف ساتھ والے کمرے کے دروازے پر رکا۔ اور دروازہ کھول کر شاویز کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ شاویز خاموشی سے اندر داخل ہو گیا اصل میں وہ اکیلے بیٹھ کر کچھ سوچنا چاہتا تھا تو وہ یہاں سے نکلنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ ڈھانچہ دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔
شاویز نے کمرے کا جائزہ لیا چھوٹا سا کمرہ تھا بغیر کسی فرنیچر کے۔ دائیں بائیں کی دونوں دیواروں میں چھوٹے چھوٹے طاق بنے ہوئے تھے جن میں

چھوٹی چھوٹی کھوپڑیاں روشن تھیں۔ ”انسانی سر اتنے چھوٹے تو نہیں ہوا کرتے۔ نجانے یہ انسانی کھوپڑیاں اس قدر چھوٹی کیوں ہیں؟“ شاویز نے سوچا۔

اس کے ذہن میں بار بار یہی الفاظ گونج رہے تھے کہ میں اب یہاں سے باہر کیسے نکلوں گا۔ عالیان کی بات مان لینی چاہیے تھی مجھے۔ عالیان کا خیال آتے ہی اسے یکدم موبائل فون کا خیال آیا تو فادر والے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے جیب میں ڈال لیا تھا۔ اس نے جلدی سے جیب سے موبائل نکالا اور ٹائم دیکھا تو دوپہر کے دو بجے تھے۔

اس نے اپنا سامان والا بیگ کندھے سے اتار کر نیچے رکھا اور کندھے سہلانے لگا۔ موبائل پر تین مس کالز موجود تھیں جو کہ عالیان کے نمبر سے دی گئی تھیں اس کا موبائل چونکہ سائلنٹ پر تھا اس وجہ سے اسے پتہ نہیں چل سکا تھا۔ عالیان شاید مجھے کال کرتا رہا ہے۔ شاویز نے یہ سوچ کر عالیان کا نمبر ملایا فوراً ہی عالیان نے فون ریسیو کرلیا۔

”ہیلو...... کہاں ہو بھئی......“ عالیان کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”چرچ میں......“ شاویز نے کہا۔

”کیا ابھی تک زندہ ہو......“ عالیان حیرت زدہ آواز میں بولا۔

”نہیں...... میری روح تم سے بات کر رہی ہے۔“ شاویز چڑ کر بولا۔

”واقعی......“ دوسری طرف سے عالیان کا قہقہہ سنائی دیا۔

”میں یہاں مصیبت میں ہوں اور تمہیں قہقہوں سے فرصت نہیں ہے۔“ شاویز غصے سے بولا۔

”مصیبت...... کیسی مصیبت...... تم ٹھیک تو ہونا......“ یکدم ہی عالیان کی سنجیدہ آواز آئی۔

”کاش! میں تمہاری بات مان لیتا۔ عالیان...... یہ چرچ واقعی آسیب زدہ ہے......“ شاویز خوفزدہ لہجے میں بولا۔

”تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کچھ ہوا تو نہیں......“ عالیان یکدم ہی پریشان لہجے میں بولا۔

”فی الحال تو ٹھیک ہی ہوں...... آگے کا پتہ نہیں......“ شاویز نے کہا۔

”کیا مطلب......“ عالیان چونکا۔

شاویز نے شروع سے لے کر آخر تک عالیان کو ساری بات بتائی اور پھر بولا۔ ”یار اب رات بارہ بجے وہ لوگ یقیناً مجھے ذبح کر کے کھا جائیں گے۔“

”اسی وجہ سے میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ مگر تم نے میری ایک نہ سنی...... اب بھگت رہے ہو نا......“ عالیان نے غصے سے کہا۔ شاویز کی بات سن کر وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔

”اب تم ہی بتاؤ...... میں کیا کروں......“ شاویز پریشانی سے بولا۔

”ایسا کرتے ہیں ریسکیو والوں کو لے کر وہاں آتا ہوں۔“ عالیان جلدی سے بولا۔

”ریسکیو والے کیا کریں گے یہاں آ کر۔ میں تمہیں کہہ رہا ہوں نا...... کہ یہاں سب ڈھانچے ہیں۔ زندہ ڈھانچے۔ جو کہ جادو بھی جانتے ہیں......“ شاویز نے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”تو کیا پولیس لے آؤں......“ عالیان نے حیرت سے پوچھا۔

”پولیس...... پولیس والے تو ڈھانچوں کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائیں گے۔“ شاویز بولا۔

”تو پھر کیا کروں......“ عالیان نے حیرت سے پوچھا۔

”یہاں کسی جادوگر یا عامل کا کام ہے...... “ شاویز نے کہا۔

”عامل......“ عالیان چونکا...... ”ایک عامل صاحب ہیں ہمارے جاننے والے...... بڑے مانے ہوئے۔ وہ جو بات کہہ دیں پوری ہو کر رہتی ہے۔“ عالیان نے جلدی سے کہا۔

”بس انہیں لے آؤ یہاں...... مگر پہلے انہیں

تفصیل سے سب واقعات بتا دینا۔“ شاویز نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے......“ عالیان نے کہا۔ ”میں آفس سے چھٹی لے کر روانہ ہوتا ہوں۔“

”ذرا جلدی کرنا! رات بارہ بجے سے پہلے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ورنہ وہ زندہ ڈھانچے......“ شاویز نے خوفزدہ لہجے میں کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”اوکے۔ خدا حافظ۔“ عالیان نے فون بند کردیا۔

شاویز دوبارہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازے کی شاید باہر سے کنڈی لگا دی گئی تھی۔ شاویز مایوس ہو کر واپس فرش پر بیٹھ گیا۔

ادھر عالیان آفس سے چھٹی لے کر موٹر سائیکل پر اس عامل صاحب کے پاس چل دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد۔ اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں ان عامل صاحب کا گھر تھا۔ دوپہر کو وہ گھر پر ہی ہوتے تھے۔ عالیان نے دروازہ بجایا تو ایک لڑکا باہر آیا۔

”جی کون......“ لڑکے نے پوچھا۔

”مجھے عامل صاحب سے ملنا ہے۔“ عالیان نے کہا۔

”مگر وہ تو اس وقت آرام کر رہے ہیں۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

”دیکھو...... مجھے ان سے بے حد ضروری کام ہے۔ تم ان سے جا کر کہو کہ میں کافی دور سے آیا ہوں۔“ عالیان نے کہا۔ تو لڑکا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر آ کر بولا۔

”وہ کہہ رہے ہیں چار بجے آستانے پر آ جانا۔“

”دیکھو ان سے کہو کہ کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ دیر کرنے سے کسی کی جان جا سکتی ہے۔“ عالیان نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اچھا...... میں کہتا ہوں۔“ لڑکا دوبارہ اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد آ کر بولا۔

”آیئے۔“

عالیان اس کے ساتھ اندر داخل ہوا ایک سائیڈ پر بنے ہوئے کمرے میں وہ لڑکا اسے لے آیا۔ اندر عامل صاحب بیڈ پر دراز تھے۔

”السلام علیکم!“ عالیان نے کہا۔

”وعلیکم السلام ......“ عامل صاحب نے کہا۔ ”آؤ۔ بیٹھو۔“

”معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو تکلیف دی۔ دراصل کام اتنا ضروری تھا کہ......“ عالیان نے کہنا چاہا۔

”کوئی بات نہیں......“ عامل صاحب نے بات کاٹ دی اور کہا۔ ”مسئلہ بتاؤ۔“

عالیان نے اسے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بتادی۔

”ہوں...... بہت مشکل کام ہے۔ اس میں جان جانے کا بھی خطرہ ہے۔“ عامل صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں...... میں نے اسے کافی منع کیا مگر اس نے میری بات نہیں مانی۔“ عالیان نے جلدی سے کہا۔

”اس وقت دو بجے ہیں۔ میں کھانا کھالوں ...... پھر روانہ ہوں گے۔“ عامل صاحب نے کہا۔ اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ کر بیٹھے اور وہی لڑکا کھانے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوا۔

”تم نے بھی یقیناً کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ آؤ کھالو۔“ عامل صاحب عالیان سے بولے۔

”بس جناب۔ میری تو پریشانی سے بھوک ہی اڑ گئی ہے۔“ عالیان نے کہا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ مالک ہے۔ آؤ کھالو تھوڑا سا۔“ عامل صاحب نے کہا۔

”میں ضروری تیاری کرلوں۔ تم یہیں بیٹھو۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد عامل صاحب دوبارہ

اندر داخل ہوئے تو وہ کپڑے تبدیل کر چکے تھے اور ہاتھ میں ایک ہینڈ بیگ بھی تھا۔

''سواری ہے تمہارے پاس۔'' عامل صاحب نے عالیان سے پوچھا۔

''جی ہاں...... میرے پاس موٹر بائیک ہے۔'' عالیان نے جواب دیا۔

''تو چلو......'' عامل صاحب نے کہا۔

عالیان اٹھ کر ان کے ساتھ باہر آگیا۔

''کیا ہم دونوں اکیلے وہاں جائیں گے......؟'' عالیان کہتے ہوئے ہچکچایا۔

''دیکھو بیٹا۔ اللہ کا کلام سب چیزوں پر حاوی ہے اور یہ تو تم جانتے ہی ہو گے کہ اللہ شیطان کا ساتھ نہیں دیتا۔'' عامل صاحب نے کہا۔

عالیان نے کوئی جواب دیئے بغیر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور چرچ کی جانب روانہ ہوگیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ دونوں چرچ کے پاس جا پہنچے۔ عالیان نے موٹر سائیکل تقریباً ایک فرلانگ دور ہی روک لی تھی۔

''تم یہیں ٹھہرو گے یا میرے ساتھ اندر آؤ گے۔'' عامل صاحب نے عالیان سے پوچھا۔

''جیسے آپ کہیں۔'' عالیان کے چہرے پر خوف کے تاثرات چھا گئے۔ عامل صاحب نے اس کا چہرہ دیکھا اور بولے۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ تم یہیں ٹھہرو۔'' عامل صاحب مسکرائے اور چرچ کی طرف جانے لگے۔

''عامل صاحب...... میں وہاں سڑک کے پاس ٹھہروں گا۔'' عالیان نے کہا۔

''جیسے تمہاری مرضی......'' عامل صاحب نے مڑے بغیر کہا۔

عالیان نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور وہاں سے تھوڑی دور سڑک کے کنارے آکر کھڑا ہوگیا۔ عامل صاحب چرچ کے پاس پہنچے اور ہینڈ بیگ سے ایک بڑی سی ٹارچ نکال لی۔ پھر وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے اور دروازے کی طرف پھونک ماری۔ پھر ٹارچ روشن کر کے چرچ کا دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہوگئے۔

چرچ کے اندر حسب معمول اندھیرا تھا۔ عامل صاحب نے دروازہ کھلا رہنے دیا۔ دروازہ کھلا رہنے کی وجہ سے اندر روشنی پھیل گئی۔ عامل صاحب نے ایک نظر میں ہی پورے ہال کمرے کا جائزہ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی زبان پر کلام الٰہی بھی جاری تھا۔ انہیں اس لکڑی کے تختے کی تلاش تھی جس پر پاؤں پڑنے سے شاور نیچے تہ خانے میں جا گرا تھا۔ وہ تختہ ہال کمرے کے درمیان میں موجود تھا اور کافی کوشش کے بعد نظر آیا کیونکہ مٹی اور گرد کی وجہ سے وہ تختہ فرش کے ہم رنگ ہوگیا تھا اس وجہ سے آسانی سے دکھائی نہ دیتا تھا۔

چمگادڑوں نے دروازہ کھل جانے اور روشنی اندر آنے کی وجہ سے شور مچا رکھا تھا کبھی وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی ایک طرف چلی جاتیں اور کبھی دوسری طرف مگر عامل صاحب ان سے بے نیاز لکڑی کا تختہ ڈھونڈنے میں مصروف تھے اور آخر وہ تختہ انہیں نظر ہی آ گیا۔ انہوں نے جھک کر تختے پر ہاتھ سے دباؤ ڈالا تو اس تختے کے دونوں پٹ نیچے کی طرف کھل گئے۔ انہوں نے چونکہ احتیاط سے دباؤ ڈالا تھا اس وجہ سے تختہ کھلنے کی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔

عامل صاحب نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک رسی نکالی اور اسی تختے کے کنڈے کے ساتھ اسے مضبوطی سے باندھ لیا رسی کافی لمبی اور مضبوط تھی رسی باندھنے کے بعد انہوں نے ٹارچ کا ہینڈل اپنے دانتوں میں دبایا اور اس رسی کے ساتھ نیچے تہ خانے میں اترنے لگے۔ تہ خانے میں ان کے اترنے کی دیر تھی کہ شور شروع ہوگیا۔ انہوں نے ٹارچ ہاتھ میں لی اور جائزہ لینے لگے ساتھ ہی کلام الٰہی بھی پڑھتے جا رہے تھے۔ کلام الٰہی پڑھنے کے بعد انہوں نے زور سے پھونک ماری۔ پھونک مارنے کی دیر تھی کہ شور تھم گیا۔ عامل صاحب کمرے کا جائزہ لینے کے بعد اس کے خارجی دروازے کی طرف بڑھ گئے مگر اس سے پہلے انہوں نے ہینڈ بیگ کھول کر ایک خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ابھی وہ دروازہ کھولنے بھی نہ پائے تھے کہ دروازہ یکدم ہی کھل گیا اور ایک ڈھانچہ اندر داخل ہوا۔ عامل صاحب نے اس پر پھونک ماری تو وہ آنکھوں کے گڑھوں پر ہاتھ رکھ کر چیختا ہوا واپس بھاگ گیا۔

عامل صاحب بھی اس کے پیچھے بھاگے اور جلد ہی اسے جا لیا۔ وہ راہداری میں چیختا ہوا بھاگا جا رہا تھا عامل صاحب نے خنجر پر کچھ پڑھ کر پھونک ماری اور خنجر ڈھانچے کی طرف تاک کر پھینکا۔ جو سیدھا جا کر اس کی کمر میں پیوست ہوا اور ڈھانچہ ایک زوردار چیخ مار کر نیچے جا گرا اور یکدم ہی اس کا وجود یوں وہاں سے غائب ہوگیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ عامل صاحب نے اپنا خنجر فرش سے اٹھا لیا۔

''اوہ...... تو یہ سب جادو کا کمال ہے۔'' عامل صاحب سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

ڈھانچے کی چیخیں سن کر دوڑتے قدموں کی بے شمار آوازیں بلند ہوئیں جو کہ اس طرف آ رہی تھیں۔ وہ تعداد میں کم از کم آٹھ ڈھانچے تھے جو راہداری میں داخل ہوئے مگر عامل صاحب کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر وہ الٹے قدموں واپس بھاگے۔ اور راہداری کے آخر میں بنے ہوئے کمرے میں داخل ہوگئے۔

عامل صاحب نے کندھے کے ایک طرف لٹکا ہوا اپنا ہینڈ بیگ اتارا اور اس میں سے ایک لوہے کا پائپ نکال کر اس پر ایک پرانا کپڑا باندھ لیا اس کے بعد ایک بوتل نکالی اور اس کپڑے کو اس بوتل میں موجود محلول سے تر کر لیا۔ اس بوتل میں پٹرول تھا کیونکہ جیسے ہی عامل صاحب نے اسے لائٹر کا شعلہ دکھایا تو آگ بھڑک اٹھی۔

عامل صاحب وہ مشعل اور خنجر پکڑ کر دوبارہ اس دروازے کی طرف روانہ ہوئے دروازہ بند تھا عامل صاحب نے خنجر کی نوک سے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ شاید اندر سے بند تھا۔ انہوں نے خنجر کے دستے سے دروازہ زوردار آواز میں بجایا۔ مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ عامل صاحب نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پوری طاقت سے لات دروازے پر دے ماری۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ اندر ڈھانچے موجود تھے۔

جلتی ہوئی مشعل اور خنجر دیکھ کر ڈھانچے آنکھوں کے گڑھوں پر ہاتھ رکھ کر چیختے ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگے اور ''ہولی فادر...... ہولی فادر......'' پکارنے لگے۔

یکلخت ہی کمرے میں بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک کوندی اور ساتھ ہی چبوترے پر رکھی کرسی پر ایک لمبا سا تنومند شخیم ڈھانچہ نمودار ہوا۔ کمرے میں موجود ڈھانچوں کی چیخ و پکار اب ختم ہو چکی تھی شاید وہ فادر کے ڈھانچے کو دیکھ کر خاموش ہوگئے تھے۔ عامل صاحب بھی سمجھ گئے کہ یہ یقیناً وہی فادر ہے جس کا ذکر عالیان نے ان سے کیا تھا۔

فادر کا ڈھانچہ کرسی سے یکدم اٹھا اور اپنی دائیں ہاتھ کی انگلی عامل صاحب کی طرف سیدھی کر کے اونچی آواز میں کچھ پڑھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی انگلی سے شعاعیں خارج ہو کر عامل صاحب کی طرف لپکیں۔ عامل صاحب جو کہ پہلے ہی کلام پاک کا ورد کر رہے تھے انہوں نے فوراً ہی پھونک ماری اور وہ شعاعیں ان کی طرف بڑھنے سے پہلے ہی بجھ گئیں۔ فادر کا ڈھانچہ اپنا حملہ ناکام ہوتے دیکھ کر ہڑبڑا گیا۔ اس نے فوراً ہی اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ ایکدم ہی اس کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی انسانی کھوپڑی آ گئی۔ اس نے وہ کھوپڑی عامل صاحب کی طرف کھینچ کے ماری۔ عامل صاحب نے پھر پھونک ماری تو کھوپڑی بجھ کر نیچے جا گری۔

فادر پریشان ہوگیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا ہر وار ناکام کیوں جا رہا ہے۔ وہ پھر اونچی آواز میں کچھ پڑھنے لگا۔ مگر اس سے پہلے کہ اس کا منتر مکمل ہوتا عامل صاحب نے اس کی طرف زور سے پھونک ماری۔ فادر کو یوں محسوس ہوا کہ اس کا پورا جسم سن ہوگیا ہو اب اس کے جسم کا کوئی حصہ بھی حرکت کے قابل نہ تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کے مدمقابل کوئی عام ہستی نہیں ہے۔ عامل صاحب نے خنجر تاک کر فادر کے ڈھانچے کی طرف پھینکا اور خنجر فادر کے کندھے میں

جا لگا۔ فادر کا ڈھانچہ چبوترے پر پشت کے بل جا گرا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

فادر کے ڈھانچے کو گرتے دیکھ کر دوسرے ڈھانچوں نے پھر چیخنا شروع کردیا شاید وہ جان گئے تھے کہ ان کا فادر بے بس ہوچکا ہے اور وہ انہیں نہیں بچا سکتا۔ وہ ایک نسبتاً اندھیرے کونے میں جمع ہوکر چیخ رہے تھے عامل صاحب نے جلتی ہوئی مشعل ان کی طرف پھینک دی جیسے ہی مشعل کی آگ نے ان کی ہڈیوں کو چھوا وہ غائب ہوگئے کیونکہ وہ جادوئی تھے۔

عامل صاحب ان کا انجام دیکھے بغیر فادر کے ڈھانچے کی طرف لپکے۔ فادر کا ڈھانچہ بے بسی سے چبوترے پر پڑا تھا۔ عامل صاحب نے اس کے کندھے سے خنجر نکالا اور خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ کر بولے۔

"اپنی اصلیت بتاؤ۔ کون ہو تم۔ کیونکہ میں جان گیا ہوں کہ اصلی ڈھانچے نہیں ہو۔ اور یہ سب ڈھانچے بھی تمہارے جادو کی پیداوار تھے۔" بتاؤ۔ ورنہ جان سے ماردوں گا۔" عامل صاحب کڑک دار آواز میں بولے۔

"بب ...... بتاتا ہوں......" ڈھانچہ ہکلا کر بولا۔ "میں...... میں شرت چند ہوں۔......"

"شرت چند...... اوہ...... کیا تم ہندو ہو......" عامل صاحب حیرت سے بولے۔

"ہاں...... میں ایک ہندو یوگی ہوں...... میں آج سے تقریباً ستائیس سال پہلے آیا تھا۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ لوگ اس چرچ کو آسیب زدہ سمجھتے ہیں۔ لیکن جب میں نے اس چرچ کا جائزہ لیا تو مجھے پتہ چلا کہ یہاں کوئی آسیب وغیرہ نہیں ہے۔ یہ صرف لوگوں کا وہم تھا۔ تب میں نے یہیں اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ میں نے جادو سے ہی یہ ڈھانچے وغیرہ بنائے۔ میں چونکہ شروع ہی سے انسانی خون پینے کا شوقین رہا ہوں۔ اس وجہ سے جادو کے زور سے روزانہ ایک انسان اغوا کرکے اس کا خون پیتا تھا۔"

ہندو یوگی شرت چند اپنے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے بولا۔

"ہوں۔ آج تک نجانے کتنی زندگیاں تم نے ختم کی ہوں گی اپنا شوق پورا کرنے کے لئے۔ تمہارا انجام موت ہی ہے۔" عامل صاحب نے کہا اور اللہ کا نام لے کر خنجر اس کے دل کے مقام پر دے مارا۔ ڈھانچے کے منہ سے بھیانک چیخ خارج ہوئی اور وہ اگلے جہان کوچ کر گیا۔ اس کے مرتے ہی اس کا روپ بدلنا شروع ہوگیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک ہڈیوں کے ڈھانچے کے بجائے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی موجود تھا۔ جس کے ماتھے پر تلک کا نشان اسے ہندو ظاہر کررہا تھا۔

عامل صاحب نے اپنی کامیابی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ کمرے میں اندھیرا پھیل چکا تھا کیونکہ ہندو عامل کے مرتے ہی طاقوں میں موجود روشن کھوپڑیاں غائب ہوگئی تھیں۔ عامل صاحب ٹارچ کی لائٹ آن کرکے باہر نکلے۔ کمروں کی تلاشی لینے پر انہیں ایک کمرے سے شاویز مل گیا۔ اسے ساتھ لے کر عامل صاحب اسی رسی کے ذریعے اوپر ہال کمرے میں پہنچے اور پھر وہ دونوں چرچ سے نکل آئے۔ باہر آکر عامل صاحب نے شاویز کو سارا واقعہ بتایا۔ باہر مغرب کا وقت ہوچکا تھا انہیں دور سڑک پر عالیان کھڑا دکھائی دیا۔

وہ دونوں عالیان کے پاس پہنچے اور اسے اپنی کامیابی کے بارے میں بتایا۔ پھر ان دونوں نے عامل صاحب کا بے حد شکریہ ادا کیا اور انہیں ان کے گھر تک چھوڑا۔ دوسرے دن شاویز نے مقامی اخبار میں ہندو عامل شرت چند کے بارے میں خبر لگوائی جس نے چرچ کو آسیب زدہ مشہور کررکھا تھا۔

شاویز کے ساتھ پریس رپورٹر اور کیمرہ مین بھی چرچ میں آئے وہاں سے انہوں نے شرت چند کی لاش اٹھوائی کیونکہ ساتھ ریسکیو کی ٹیم بھی آئی تھی۔ لوگ دور دور سے چرچ کو دیکھنے آرہے تھے۔ اس سے اگلے دن شاویز دوبارہ اپنی ریسرچ مکمل کرنے کے لئے وہاں موجود تھا۔

چمپا

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں خوبرو حسینہ نے نوجوان کا ہاتھ پکڑا وہ دونوں ہوا میں اڑنے لگے۔ آسمان کی بلندیوں پر اڑتے ہوئے جب نوجوان نے نیچے کی طرف دیکھا تو اچانک......

جنم جنم سے سرگرداں چاہت وخلوص کی انمٹ کہانی جو برسوں دماغ سے محو نہ ہوگی

بوسیدہ اور تھکی ہوئی بیل گاڑی پہاڑی راستے پر بری طرح ہچکولے کھاتی چلی جارہی تھی۔ گاڑی کے ایک پہیے کے اوپر لٹکی روشن لالٹین سڑک کے کنارے کھڑی چٹانوں پر عجیب اور خوفناک سائے بنا رہی تھی۔ اندھیرے کی چادر نے ہر چیز پر اپنا سایہ تان رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا پورے جسم میں اپنے پنجے گاڑنا شروع کرچکی تھی۔ سنیل اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ اس نے زیادہ گرم کپڑے اپنے ساتھ کیوں نہیں لئے۔ راستے کے دائیں طرف ہمالیہ کے بلند پہاڑوں کے ہیولے نظر آرہے تھے جھاڑیوں اور درختوں کے سائے ان کے ساتھ مل کر عجیب ڈراؤنی شکلیں ترتیب دے رہے تھے۔

ریل گاڑی اس پہاڑی ریلوے اسٹیشن پر دو گھنٹے کی تاخیر سے پہنچی تھی۔ سنیل کو مزید آدھ گھنٹہ بیل

گاڑی والوں سے مغز کھپائی میں گزر گیا۔ کوئی بھی اس کو منزل مقصود تک پہنچانے کو تیار نہ تھا۔ گاڑی بانوں کا کہنا تھا کہ سڑک بہت خراب ہے اور اس پر رات کے اس پہر سفر زیادہ محفوظ بھی نہیں بلکہ بہت خطرناک ہے۔ سنیل کو ان کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہراتے محسوس ہوئے۔ وہ ہر قیمت پر اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا جو اس ریلوے اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر بلند وبالا پہاڑوں کے بیچ ایک آرکیالوجی سائٹ تھی۔ اس نے وہاں اپنے ساتھیوں سے سیل فون پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس علاقے میں سیل فون کی سروس نہیں تھی اسے یاد آیا کہ یہاں تو صرف سیٹلائٹ فون کام کرتا ہے۔ وہ اس علاقے میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔

ریلوے اسٹیشن اس قابل نہیں تھا کہ وہاں رات گزاری جاسکے بلکہ وہاں ایسا کوئی انتظام بھی نہیں تھا۔ قریب ہی گھاس پھونس سے بنے چند چھپر تھے جو وہاں کام کرنے والے مزدوروں نے بنائے ہوئے تھے۔ قریبی قصبہ اسٹیشن سے تین کلومیٹر سے زیادہ دور تھا اور اسے یقین تھا کہ وہاں بھی کوئی ہوٹل یا رہائش نہیں مل سکے گی۔ لہٰذا اس نے ہر صورت اپنی سائٹ پر پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ جب ریل گاڑی اسٹیشن پر پہنچی تو وہاں دو یا تین بیل گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک بیل گاڑی میں ریل گاڑی سے اترنے والا ایک جوڑا بیٹھ کر چلا گیا۔ سنیل نے بھی ایک گاڑی بان سے بات کی مگر جب اس نے اپنی سائٹ کا ایڈریس بتایا تو وہ گاڑی بان خوف زدہ ہوگیا، اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا اور وہ بغیر کوئی بات کئے اپنی گاڑی بھگا کر لے گیا۔

بالآخر وہ ایک گاڑی بان کو چار گنا زیادہ کرایہ کا لالچ دے کر تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بیل بہت بوڑھا اور سست نظر آرہا تھا۔ گاڑی بان کی بھی یہی کیفیت تھی مگر سنیل کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

گاڑی بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی جس کی وجہ سے سنیل کا جوڑ جوڑ ہل رہا تھا۔ اچانک ایک زور کا جھٹکا لگنے سے یوں لگا جیسے وہ گاڑی سے باہر گر ہی جائے گا۔ بیل ایک دم رک گیا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ گاڑی بان کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا اور اس کا سارا جسم خزاں رسیدہ پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر سنیل کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا......؟'' سنیل نے تشویش زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

''میں نے اسے دیکھا ہے صاحب......'' وہ بری طرح ہکلا رہا تھا۔

''کسے......؟''

''بھوت کو......''

''کیا......؟ بے وقوف مت بنو......'' سنیل چلایا۔

''نہیں صاحب......میرا یقین کرو۔ میں نے اسے سڑک کے بیچوں بیچ دیکھا۔ پھر وہ فوراً ہی غائب ہوگئی......دیکھو، بیل بھی خوف زدہ ہے۔''

سنیل اس ساری صورت حال کو بالکل بھی سمجھ نہ پا رہا تھا۔ وہ بھوتوں یا اس قسم کی چیزوں پر قطعی یقین نہیں رکھتا تھا۔ مگر اس ویرانے کے بیچوں بیچ ایک عجیب قسم کی بے چینی اس کے جسم میں رینگنے لگی تھی۔ بیل اب پرسکون ہوچکا تھا۔ باہر چاروں طرف گھور اندھیرا تھا۔ سنیل نے اپنی ٹارچ نکالی اور سڑک پر اس کی روشنی ڈالی۔ وہاں سوائے پتھروں کے اسے اور کچھ نظر نہ آیا۔

''باہر تو کچھ بھی نہیں......چلو......اب ہمیں چلنا ہوگا۔'' اس نے گاڑی بان کو ڈانٹنے والے لہجے میں کہا۔

گاڑی بان نے بے بسی کے عالم میں سنیل کی طرف دیکھا۔ وہ آگے نہیں جانا چاہتا تھا مگر اسے یہ بھی علم تھا کہ یہاں رکنا زیادہ خطرناک ہوسکتا ہے اور تنہا واپسی......وہ تو اور بھی زیادہ مشکل کام تھا۔ لہٰذا اس نے بیل کو تھپکی دی اور گاڑی دوبارہ رینگنا شروع ہوگئی۔

سائٹ پر پہنچتے پہنچتے رات کے تقریباً گیارہ بج گئے۔ سائٹ بھی کیا تھی......بس تین یا چار بڑے بڑے خیمے جو کھلے میدان میں ایک بہت بڑے پہاڑ کے دامن میں نصب تھے۔ اس کے دوست اس کا بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ سنیل نے اپنا بیل گاڑی کے سفر کا تجربہ ان سے بیان کیا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بھی اس بھوت کے متعلق سنا ضرور ہے مگر کبھی دیکھا نہیں۔ مگر بہت سارے دیہاتیوں کو اس کا تجربہ ہوا ہے۔ گاڑی بان نے سنیل سے التجا کی کہ وہ لوگ اس کو آج رات یہیں بسر کرنے کی اجازت دے دیں کیونکہ وہ اکیلا واپس نہیں جاسکتا۔

سنیل اس لمبے سفر سے بری طرح تھک چکا تھا۔ اس کو رات کا کھانا بھی ٹھنڈا ہی کھانا پڑا کیونکہ کھانا کافی پہلے تیار ہوا تھا جو قریبی قصبے سے آنے والے ایک باورچی کی ذمہ داری تھی اور رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی کھانا پکا کر واپس اپنے گھر جاچکا تھا۔ سنیل کو ایک علیحدہ چارپائی اور بستر مل گیا جو اس بڑے خیمے کے ایک کونے میں تھا اس کے قریب ہی عارضی کچن بنا ہوا تھا۔ چارپائی ملتے ہی وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

سنیل ایک ماہر ارضیات تھا اور ایک پرائیوٹ فرم کے لئے کام کرتا تھا جس کا کام مختلف علاقوں کی مٹی پر ایسی تحقیق کرنا تھی جس سے کوئی نادر ونایاب عنصر اور چٹانی علاقوں میں قدیم تاریخی اثرات دریافت کرسکیں۔ سنیل کی عمر ستائیس سال تھی اور وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس کی ماں اس کے بھائی کے ساتھ کینیڈا میں رہتی تھی جب کہ اس کی فرم اس وقت صوبہ اترانچل کی چٹانی ساخت پر تحقیق کررہی تھی۔ فرم کی طرف سے پانچ ماہر ارضیات اور مطلوبہ مددگار اس علاقے میں تحقیق کی غرض سے متعین کیے گئے تھے، مگر اس علاقے کی پیچیدہ اور ناموافق ساخت کی وجہ سے وہ ابھی تک مطلوبہ پیش رفت نہیں کرپائے تھے۔ ایک دو دفعہ تو شدید طوفانی بارش نے ان کے آلات تباہ کردیئے تھے۔ اب موسم کسی حد تک موافق تھا۔

پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔ سنیل اپنے کام میں پوری طرح مشغول ہوگیا تھا۔ وہ دیہاتیوں کے ساتھ اچھی طرح گھل مل گیا تھا جو ان کے کام میں اس سے تعاون کرتے تھے۔ وہ شام چھ بجے تک اپنے خیمے میں آجاتا، نہاتا دھوتا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ رات کا کھانا کھاتا، کچھ گپ شپ لگتی اور رات گیارہ بجے تک سب سوجاتے۔ سنیل اپنی ماں کے ساتھ صرف سیٹلائٹ فون پر ہی رابطہ کرپاتا۔ وہ کینیڈا میں اس کے لئے فکرمند رہا کرتی تھی۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ خلاف معمول آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کو ایک مانوس سی خوشبو فضا میں پھیلی محسوس ہورہی تھی۔ خیمے کے اندر گہرا اندھیرا تھا۔ وہ بے تاب ہوکر اٹھ بیٹھا اور اپنی ٹارچ کی تلاش میں ہاتھ مارنے لگا جو جلد ہی اس کو اپنے تکیے کے نیچے سے مل گئی۔ جونہی اس نے ٹارچ کا بٹن آن کیا اس کو اپنی چارپائی کے قریب ایک ہیولہ نظر آیا۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

وہ ایک جوان عورت تھی......

وہ بے حس وحرکت کھڑی تھی۔ سنیل کو اپنی رگوں میں خون جمتا محسوس ہوا۔ پورے جسم میں ٹھنڈ کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے فوراً ٹارچ کی پوری روشنی اس ہیولے پر ڈالی۔

مگر......اب وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

سخت سردی کے باوجود اس کا پورا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ فضا میں پھیلی ہوئی مہک غائب ہوچکی تھی۔ اس کو یہ مہک بہت جانی پہچانی محسوس ہورہی تھی مگر یاد نہیں آرہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے گلے سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''دلیپ......''

دلیپ اس کا ساتھی تھا اور وہ اس سے کچھ دور اپنی چارپائی پر سویا ہوا تھا۔

ایمرجنسی لائٹ آن کردی گئی۔ خیمے کے اندر اور باہر ہر جگہ تلاش کیا گیا مگر وہ عورت تو جیسے ہوا میں تحلیل ہوچکی تھی۔

اگلے چند روز وہ لوگ رات کو گیس لیمپ روشن کرکے سوتے رہے۔ کوئی واقعہ نہ ہوا۔ سنیل دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوگیا اور یہ عجیب واقعہ اس کے

دماغ سے محو ہوگیا۔

دو ہفتے گزرے تھے کہ سنیل دوبارہ آدھی رات کو جاگ اٹھا۔ ایک یخ بستہ ہاتھ اس کو اپنے ماتھے پر محسوس ہوا تھا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں، دیکھا تو وہی عورت چارپائی پر اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ماتھے کو ہولے ہولے سہلا رہی تھی۔ اس کے جسم سے وہی مانوس مہک پھوٹ رہی تھی۔ خوف اور دہشت کے عالم میں سنیل ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور چیخنا چاہا مگر اس عورت نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کردیا۔

''نہیں...... چیتن......!'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

سنیل کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی بے ہوش ہوجائے گا۔ سارا خون اس کے چہرے پر جمع ہوگیا۔ وہ گیس لیمپ کی روشنی میں اس عورت کے چہرے کا ایک حصہ دکھ رہا تھا کیونکہ وہ اس کے عقب میں جل رہا تھا۔

اس عورت کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ اس نے ایک کھلا گھلا گھرا پہن رکھا تھا جیسا کہ عموماً پرانی ہندوستانی فیچر فلموں میں عورتوں کو پہنے دکھایا جاتا ہے۔ اس کے سیاہ لمبے بال کھلے ہوئے تھے۔ وہ بے شک بے حد حسین تھی۔

''کون ہو تم......؟'' سنیل بمشکل بول پایا۔

''ہا...... ہا...... ہا......'' اس نے وحشت ناک آواز میں ایک قہقہہ لگایا۔ سنیل کو امید تھی کہ دوسرے لوگ جو آس پاس سوئے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ قہقہہ سن کر بیدار ہوجائیں گے۔ مگر کسی نے کوئی حرکت نہ کی۔ کوئی نہ جاگا۔

''نہیں چیتن......! کوئی بھی میری آواز نہیں سن سکتا سوائے تمہارے......'' وہ یوں بولی جیسے اس کا ذہن پڑھ رہی ہو۔

سنیل اس کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کو یوں محسوس ہورہا تھا جیسے اگلے ہی لمحے اس کی جان نکل جائے گی۔

''خوف زدہ مت ہو...... میں بھلا تمہیں کیسے نقصان پہنچا سکتی ہوں۔ تم تو میرا پیار ہو...... میری محبت ہو......'' وہ پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ''کیا...... میں تمہیں یاد نہیں...... میں ہوں...... تمہاری چمپا......''

سنیل کو اپنا اعتماد بحال ہوتا محسوس ہوا۔

''نہیں...... میں نہیں جانتا تم کون ہو......؟ میں نے پہلے اپنی زندگی میں تمہیں کبھی نہیں دیکھا...... اور نہ ہی میں چیتن ہوں......''

چمپا کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ اس کے گالوں پر آنسو بہنے لگے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ فضا میں تیر رہی ہو۔

''ہاں...... میں جانتی ہوں۔ تم میرے چیتن نہیں ہو...... مگر......'' وہ رکی اور اس کے چہرے کو تکنے لگی...... ''میں برسوں سے تمہاری منتظر تھی۔ جو کوئی نیا شخص اس آبادی میں آتا ہے میں اس کو دیکھتی...... تمہیں تلاش کرتی ہوں......''

سنیل پریشان تھا۔

چمپا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کا ہاتھ برف کی مانند سرد تھا۔

''میرے ساتھ آؤ......'' اس نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

''کہاں......؟'' سنیل نے گھبرا کر پوچھا۔

''فکر نہ کرو...... میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔''

اگلے ہی لمحے اپنی مرضی کے بغیر وہ بھی چمپا کے ساتھ فضا میں بلند ہوگیا۔ وہ خوفزدہ ہوگیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، اس کو اپنا خیمہ اور آبادی دور نیچے نظر آرہے تھے۔

وہ کالے آسمان میں اوپر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کو بجلی کوندتی محسوس ہورہی تھی۔ اس کے حواس کام نہیں کررہے تھے۔ وہ پہاڑوں، دریاؤں، اور جنگلوں کے پار جارہے تھے۔ آہستہ آہستہ تاریکی چھٹنے لگی اور اس کو نیچے کی چیزیں نظر آنے لگیں جیسے دن کی روشنی ہو، اس کو اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کو یوں لگا جیسے سب نظر کا دھوکا ہو......

وہ ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔

اس کو لوگ اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف نظر آرہے تھے، کچھ برتن بنا رہے تھے، کچھ چاقو کی دھار تیز کررہے تھے، چند ایک پیڑوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ عورتیں پانی کے گھڑے اپنی کمروں اور سروں پر اٹھائے گھروں کو واپس جارہی تھیں۔ بچے اپنی جھگیوں کے سامنے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ ان کا لباس اور ماحول ظاہر کررہا تھا کہ یہ 1930ء یا 1940 کا زمانہ ہے کیونکہ ایسی چیزیں اس نے فلموں میں دیکھی تھیں۔ گاؤں کے عقب میں ایک ندی بہہ رہی تھی۔ جس کے کنارے پر ایک مندر تھا اور برگد کا ایک بہت بڑا پیڑ مندر کے صحن میں تھا۔ تھوڑی دور ایک اور پیڑ تھا جو چھوٹے چھوٹے پیلے رنگ کے پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ پورا ماحول ان پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ یہی وہ مانوس خوشبو تھی جو اس کو چمپا کے بدن سے آتی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے چمپا کی طرف دیکھا...... وہ بھی محویت کے عالم میں نیچے کا منظر دیکھ رہی تھی۔ ایک دم وہ چیخی اور اس نے نیچے ایک طرف اپنی انگلی سے اشارہ کیا۔

ندی کے کنارے سے کچھ دور مندر سے ذرا ہٹ کر، مٹی کے گارے سے بنی ایک جھونپڑی سے ایک عورت باہر آرہی تھی۔ وہ چمپا...... تھی۔ اس کے ہاتھ میں گندم سے بھری ایک ٹوکری تھی۔ جو اس نے زمین پر بچھی ایک چٹائی پر دھوپ میں سوکھنے کے لئے پھیلادی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک مرد بھی جھونپڑے سے باہر آیا اور اس نے چمپا کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اس کے انداز میں پیار تھا۔ چمپا نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور مسکرادی۔

سنیل کو اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

یہ مرد...... وہ خود تھا......

''یہ ہے...... میرا چیتن......'' چمپا اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

سنیل نے دوبارہ چیتن کی طرف دیکھا۔ جس نے دھوتی اور کرتا پہن رکھا تھا۔ سنیل کو یوں محسوس ہورہا تھا جیسے یہ سارا ماحول اس کا جانا پہچانا ہو...... وہ خود وہاں موجود ہو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ صرف سنیل ہے، چیتن نہیں...... اس کو یوں لگا جیسے وہ پہلے بھی اس جگہ آچکا ہے۔

''ہاں سنیل...... تم...... میرے چیتن کا دوسرا جنم ہو......'' چمپا کی آنکھیں امید کے ساتھ چمک رہی تھیں...... ''آؤ...... میری خوبصورت دنیا میں میرے ساتھ آجاؤ......'' اس نے اپنے بازو پورے کھول کر سنیل کو اپنی آغوش میں آنے کی دعوت دی۔

''نہیں ں ں ں ں......'' سنیل چلایا۔

ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی۔ سنیل حیرت زدہ تھا کہ اب وہ اپنے بستر پر تھا اور سامنے بانس پر لٹکی گھڑی صبح کے آٹھ بجا رہی تھی۔ دلیپ اور چنٹو کچن میں صبح کے ناشتہ کے لئے چائے بنا رہے تھے۔

کیا یہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ اس کو یقین نہیں آرہا تھا...... وہ اپنے خیمے میں تھا۔

وہ اٹھ بیٹھا...... جب وہ کچن کی طرف بڑھا تو اس کی نظر ایک پیلے پھول پر پڑی جو اس کے بستر کے قریب زمین پر گرا پڑا تھا۔ ایسا ہی پھول گزشتہ رات چمپا کے بالوں میں اس نے لگا ہوا دیکھا تھا۔ ہاں...... یہ حقیقت تھی کہ وہ گزشتہ رات چیتن تھی

اقوال زریں

کسی کا خلوص تمہاری دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔

اپنے دوست کو اپنی محبت دو۔ راز نہ دو۔ کہیں یہ اعتماد تمہیں ناگ کی طرح ڈس لے۔

تین چیزیں محبت بڑھانے کا ذریعہ ہیں۔

۱۔ سلام میں پہل کرنا۔ ۲۔ دوسروں کے لئے محفل میں جگہ خالی کرنا۔ ۳۔ اچھے نام سے پکارنا۔

(گل جمال حقانی۔ لکی مروت)

بوجھل دماغ کے ساتھ وہ اپنے کام پر چلا گیا۔
اس کو یقین تھا کہ چمپا رات کو پھر آئے گی۔ اس نے رات کو چمپا سے اپنی ملاقات اور پیش آنے والے واقعات کا کسی سے بھی ذکر نہ کیا۔ وہ مکمل پریشان تھا۔ وہ من ہی من میں دعا کر رہا تھا کہ اس کو خواب سے نجات مل جائے۔

اگلی رات بغیر کسی واقعہ کے گزر گئی۔ چمپا اس رات نہ آئی۔ مگر سنیل ساری رات نہ سو پایا۔ چمپا کے ساتھ، رات کو اس نے جس مقام کو دیکھا تھا اس کا مبہم ہیولہ اس کے ذہن میں گردش کرتا رہا۔ وہ شاید یقین کر چکا تھا کہ اپنے پچھلے جنم میں وہ چیتن ہی تھا۔ اس کے ذہن میں مبہم خاکے ابھرتے رہے۔ پہلی دفعہ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ چمپا کو دوبارہ دیکھے۔

اچانک اس کو اپنی ماں یاد آگئی۔ جو اپنے گھر میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ جیتا جاگتا انسان تھا کوئی آتما نہیں تھا۔ ساری رات وہ بے چین رہا۔ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ذہن میں اٹھنے والے بے شمار خیالات سے لڑتا رہا۔

پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

وہ جمعہ کی رات تھی۔ آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل گئی، دیکھا کہ چمپا اس کے قدموں میں بیٹھی ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک دم رک گئی۔ پورے جسم میں بجلی کی لہر کوند گئی۔ وہ خاموش بیٹھی اس کو تکے جا رہی تھی۔

سنیل چمپا سے نگاہیں نہیں ملا پا رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”فکر مت کرو...... میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لئے نہیں آئی ہوں...... میں تمہارا انتظار کروں گی...... میں تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی......“

”دیکھو چمپا...... تم ایک آتما ہو...... اور میں ایک جیتا جاگتا، گوشت پوست کا انسان...... میرا تمہارا میل کیسے ہوسکتا ہے۔ اس جنم میں میرے اپنے رشتے دار اور ذمے داریاں ہیں...... تم سمجھنے کی کوشش کرو......“

چمپا بالکل کچھ نہ بولی، وہ تو بس سنیل کو تکے جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا، سنیل کے دل میں خواہش ابھری کہ آگے بڑھ کر چمپا کو گلے لگا لے، اسے تسلی دے۔ وہ آہستہ سے اس کے قریب گیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”چمپا......! مجھے کچھ بتاؤ...... اپنے متعلق...... میرے متعلق...... مجھے اپنے پرانے جنم کی کوئی بات یاد نہیں۔

چمپا آہستگی سے اٹھی اور ہوا میں تیرتی ہوئی خیمے سے باہر چلی گئی۔ سنیل اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ قریب ہی ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے پہنچ گئے۔ چاروں طرف گہری تاریکی کا راج تھا۔ ہلکی ہوا میں چمپا کے کھلے لمبے سیاہ بال لہرا رہے تھے۔ سنیل کو اس سے گہری ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد چمپا یوں گویا ہوئی۔

”چیتن اور میں یہاں سے چند میل دور ”پون پور“ گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ پون پور اور چندی گڑھ گاؤں کے درمیان سے ایراوتی ندی گزرتی تھی۔ پیشہ کے لحاظ سے چیتن ایک کمہار تھا۔ ہم لوگ مٹی کے کچے برتن بناتے تھے اور اس کو فروخت کرنے کی غرض سے ایراوتی ندی کے پار چندی گڑھ گاؤں کے بڑے بازار میں لے جاتے تھے۔ ہم دونوں کے والدین عرصہ پہلے سورگ میں جا چکے تھے۔ ہماری کوئی اولاد نہیں تھی۔ چیتن اور میں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے کہ اتنا کہ ہر کوئی ہمارے پیار کی مثال دیا کرتا تھا، لوگ کہتے تھے کہ ہم دونوں پچھلے جنموں میں بھی میاں اور بیوی ہی تھے۔

چمپا چپ ہوگئی، وہ یادوں میں کھو گئی تھی۔ سنیل اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

یہ برسات کا موسم تھا۔ ایک دن چیتن نے ندی کے پار بڑے بازار میں، برتن بیچنے کے لئے جانے کا فیصلہ کیا۔ ندی کا بہاؤ تیز ہونے کی وجہ سے اس کو پار کرنا بہت مشکل تھا۔ ایراوتی ندی پورے جوبن پر تھی اور منہ زور ہو رہی تھی۔ میں نے چیتن کو جانے سے منع کیا مگر حقیقت یہ تھی کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ برسات کے سبب ہم نئے برتن بھی نہیں بنا سکتے تھے۔ چیتن نے کہا کہ اگر وہ اسی طرح گھر میں بیٹھا رہا تو ہم بھوک سے مر جائیں گے۔ میں اس کو بارش میں برتنوں کی بوری سر پر اٹھائے، جاتے دیکھتی رہی۔

دو دن گزر گئے۔ مگر چیتن نہ لوٹا۔ میں پریشان ہوگئی۔ برسات پورے زوروں پر تھی۔ طوفان بھی چنگھاڑ رہا تھا۔ میں گھر میں دبکی بیٹھی تھی۔ ایک رات جب میں سو رہی تھی تو مجھے احساس ہوا کہ گھر میں پانی بھر رہا ہے۔ میں فوراً اٹھی اور گھر کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ نہ کھلا، شاید بارش کی وجہ سے باہر کسی چٹان کے لڑھکنے کی وجہ کے سبب کوئی پتھر آکر دروازے پر جم گیا تھا جس سے دروازہ بند ہوگیا تھا۔ میں بے یار و مددگار تھی۔ میں بہت چیخی چلائی مگر کوئی مدد کو نہ پہنچا باہر شدید بارش ہو رہی تھی اور آس پاس کے باقی گھر بھی کچھ فاصلے پر تھے کوئی میری آواز نہ سن سکا۔ کچھ ہی دیر میں پانی پورے گھر میں بھر گیا اور میں...... ڈوب گئی۔“

سنیل سن ہو کر رہ گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی، چمپا کی طرف دیکھا جو نیچے وادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”...... اس دن سے لے کر آج تک میں اپنے چیتن کا انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ وہ شاید ندی میں ڈوب گیا ہو۔ مگر میں اس کی منتظر ہوں۔ جب میں نے تمہیں دیکھا میں نے سوچا میرا انتظار ختم ہوگیا۔“ وہ چپ ہوگئی۔

سنیل بھی کچھ نہ بول پایا۔ اچانک وہ مڑی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگی۔

”اگر تم پسند نہ بھی کرو تب بھی کوئی طاقت مجھے تمہیں دیکھنے سے نہیں روک سکتی۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

اس سے پہلے کہ سنیل کوئی جواب دیتا وہ فضا میں تحلیل ہوگئی۔

آنے والے دن سنیل کے لئے بہت تکلیف دہ تھے۔ وہ اپنے کام پر مکمل توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ چمپا ہر رات اس کے پاس آتی۔ وہ اس کے پہلو میں بیٹھ جاتی اور خاموشی سے اس کو تکتی رہتی۔ سنیل اپنی مشکل کسی سے بیان نہیں کر پا رہا تھا۔ اندرونی طور پر وہ خوف زدہ تھا کہ چمپا کوئی خطرناک کام نہ کر دے۔ اس نے چمپا سے کئی بار بات کرنے کی کوشش کی مگر اس کے لبوں پر مہر سکوت ہی ثبت رہی۔ سنیل کو چمپا سے ہمدردی تھی مگر وہ اسے دیکھتے ہی پریشان اور بے چین بھی ہو جاتا۔

ایک شام کو وہ قریبی گاؤں کی طرف چلا گیا۔ گاؤں کے بیچوں بیچ ایک مندر تھا۔ وہ خاموشی سے وہاں پرارتھنا کرتا رہا۔ مندر کا پجاری بہت رحم دل اور رقیق القلب شخص تھا۔ اس کے پاس ویدوں اور شاستروں کا کافی زیادہ علم تھا۔ سنیل نے سوچا کہ وہ مندر کے پجاری کو اپنی اور چمپا کی ساری کہانی بتا دے، مگر پھر نہ جانے کیوں وہ رک گیا اور چپ چاپ واپس آگیا۔

کچھ روز بعد تحقیقاتی ٹیم کو ایک سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں آگے بڑھنے کے لئے ایک بہت بڑی اور سخت چٹان کو توڑنا تھا۔ انہوں نے دھماکہ کرنے کے ماہرین کو طلب کیا تاکہ چٹان کو توڑنے کے لئے بارود کا استعمال کیا جا سکے۔ سنیل اور اس کے فاصلے پر ان ماہرین کو اپنا کام کرتے دیکھ رہے تھے۔ اس چٹان کے دائیں طرف ایک گہری کھائی تھی۔

پھر...... اچانک ایک حادثہ ہوگیا۔ بارود کا دھماکہ کرنے سے پہلے ہی بارود کو آگ لگ گئی اور زوردار دھماکہ ہوگیا۔

اس بڑی چٹان کے ٹکڑے ہوا میں اڑنے لگے۔ ماہرین کے جسم ٹکڑوں میں بٹ کر بکھر گئے۔ دھماکے کے سبب زمین لرز کر رہ گئی۔ سنیل اور اس کے ساتھی جو کچھ دور کھڑے تھے وہ بھی اچھل کر دور جا گرے۔ ان کے قریب ہی گہری کھائی تھی مگر وہ کھائی میں گرنے سے بال بال بچے۔

جب سب لوگ اچھل کر دور جا گرے تو سنیل کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کو کسی نے ہاتھوں سے تھام لیا

ہو۔ کسی نے اسے زمین پر گرنے سے پہلے ہی ہوا میں سنبھال لیا ہو۔ وہ بالکل محفوظ تھا۔ جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ چمپا کی گود میں تھا جو اس کو پیار سے دیکھ رہی تھی۔

اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ہر طرف تباہی مچی ہوئی تھی۔ لوگ دھماکے والی جگہ جمع ہو چکے تھے۔ آس پاس کے لوگ بھاگے آئے اور امدادی کام شروع کردیا۔ لاشیں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ سنیل باحفاظت تھا۔ وہ لاشیں جو کھائی میں گر گئی تھیں ان کو نکالنا ناممکن تھا۔ ان کے عملہ کے صرف چند آدمی زندہ بچ پائے تھے مگر وہ بھی زخمی ضرور تھے۔ سلامت صرف وہی تھے جو پیچھے خیموں میں رہ گئے تھے یا پھر سنیل، اس کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ ان کے زیادہ تر آلات بھی تباہ ہو چکے تھے۔

سنیل نے چمپا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ حسب معمول خاموش تھی۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہ ڈھونڈ پایا۔ چمپا کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

پولیس اور ڈاکٹرز بھی موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے رپورٹ تیار کی اور لاشوں کو وہاں سے لے گئے۔

مرنے والوں کی آتما کی شانتی کے لئے شام کو مندر میں پرارتھنا ہو رہی تھی۔ سنیل بھی وہاں موجود تھا۔ مہا پجاری انسانی زندگی کے عارضی اور فانی ہونے پر بات کررہے تھے۔ جب پرارتھنا ختم ہوئی تو سنیل کوشش کر کے مہا پجاری سے ان کے کمرے میں تنہا ملا۔ اس نے ایک ایک کر کے تفصیل اور ترتیب سے اپنی آمد سے لے کر آج تک کے سارے واقعات ان کے گوش گزار کردیئے۔ پجاری سنتے رہے۔ پھر انہوں نے ایک کتاب نکالی اور اس میں کچھ دیکھا، ایک کاغذ پر کچھ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچیں، وہ ساتھ ساتھ اشلوک بھی بڑبڑا رہے تھے۔

بالآخر وہ بولے۔

''بالک......! اگرچہ آج کے لوگ ان توہمات پر یقین نہیں رکھتے، جن پر ہمارے آباؤ اجداد یقین رکھتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں میں سے بہت حقیقت ہیں۔ ہمارا یہ شریر فانی ہے مگر آتما ابدی ہے۔ نامعلوم وجوہات کی بنا پر کچھ آتمائیں تو ابدی حیات پا کر اپنے مقررہ مقام پرلوک میں چلی جاتی ہیں مگر کچھ بھٹک جاتی ہیں۔ شاستروں کے مطابق موت کے بعد روح کو نئی زندگی پانے کے لئے ایک دریا پار کرنا پڑتا ہے جس کا نام ''ویترانی'' ہے۔ مرنے والی کی آخری رسومات درست طریقے سے ادا کرنا بہت ضروری ہے۔ اس طرح ان کو یہ دریا پار کرنے کی ہمت مل جاتی ہے اور وہ ابدیت کے نئے در میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ''موکشا'' یعنی نجات حاصل کر لیتے ہیں اور اس دنیا میں دوبارہ جنم لیتے ہیں۔ تم نے بھی چیتن کی حیثیت سے اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے بعد دوبارہ جنم لیا ہے۔ مگر چمپا بے چاری ایک آتما کی شکل میں بھٹکتی رہ گئی۔ یوں کہو جب تم مرے تو تمہارے من میں کوئی ادھوری خواہش نہ تھی جو لے کر تم نئی زندگی میں داخل ہوتے۔ مگر چمپا اپنی محبت کی تلاش میں تھی...... وہ تمہارا انتظار کررہی تھی۔ اس کے من میں، آنکھوں میں تمہارا انتظار تھا۔ اس لئے وہ نئی زندگی میں داخل نہ ہو پائی۔

اس لئے ضروری ہے کہ چمپا کی آخری رسومات درست طریقے سے ادا کی جائیں۔ ان پستکوں میں دیئے علم کے مطابق ان حالات میں اب صرف تم ہی اسے مکتی دلا سکتے ہو۔ تمہیں اس کی ہڈیاں تلاش کرنا ہوں گی۔ بال کپڑے ناخن یا اسی طرح کی کوئی اور چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو، اور جہاں تک میری معلومات کا علم ہے جس گاؤں کا تم نے ذکر کیا ہے اور حوالہ دیا ہے یعنی پون پور، وہ یہاں سے تقریباً پندرہ میل دور ہے۔ میرا علم کہتا ہے کہ تم وہاں ضرور کچھ نہ کچھ تلاش کرلو گے حالانکہ بہت پرانا واقعہ ہو چکا ہے اس کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے میں تمہیں بتا دوں گا۔ میرا ایک نائب تمہارے ساتھ جائے گا...... تم فوراً وہاں جاؤ۔

اگلی صبح سنیل نے پون پور جانے کے لئے ایک گھوڑا گاڑی کرایہ پر لی۔ نائب پجاری اس کے ہمراہ تھا۔ پجاری نے آخری رسومات کے متعلق سنیل کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ ان کے پاس پیتل کے ایک برتن میں ابھیشک جل تھا۔ اس کے علاوہ دیوی کے مندر سے حاصل کیے گئے پوتر پوجا کے پھول بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جب وہ پون پور کے قریب پہنچے تو اس کے اپنے من میں عجیب سی خلش کا احساس ہو رہا تھا...... وہ چمپا کے ساتھ یہاں پہلے بھی آ چکا تھا۔

اگرچہ جو منظر اس نے چمپا کے ساتھ فضا سے دیکھا تھا اس کے مقابلے میں موجود منظر بہت زیادہ تبدیل ہو چکا تھا۔ ان کو وہ مقام نہیں مل پا رہا تھا جہاں ان کی معلومات کے مطابق چمپا کا گھر تھا۔ بہت سے لوگوں سے پوچھا مگر معلوم نہ ہوسکا۔ کوشش بسیار کے بعد آخرکار وہ ایک بہت بوڑھے شخص سے ملے جس نے چمپا اور چیتن کو اپنے بچپن میں دیکھا تھا اور وہ اس کو ابھی تک یاد تھے۔ اس کی مدد سے سنیل ندی کے کنارے بوڑھے برگد کے پاس اس جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جہاں کبھی چمپا کا گھر ہوا کرتا تھا۔ وہاں سے کچھ دور ایک قدیم مندر کے کھنڈرات بھی تھے۔

وہ ایک ویران جگہ تھی۔ آس پاس کوئی آبادی نہ تھی۔ صرف چند ایک کھنڈرات تھے جو امتداد زمانہ کا شکار نظر آرہے تھے۔ بوڑھے شخص نے سنیل کو بتایا کہ 1940 میں آنے والے سیلاب نے پورے گاؤں کا صفایا کردیا تھا۔ ہر چیز ملیامیٹ ہوگئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد یہ گاؤں آہستہ آہستہ دوبارہ آباد ہونا شروع ہوا۔ سیلاب کی تباہی میں بچنے والے کچھ خاندان واپس آگئے اور نئے سرے سے آبادکاری شروع کی مگر زیادہ تر دوسرے محفوظ علاقوں کی طرف چلے گئے۔

ایک کھنڈر چمپا کے گھر کے مقام کے قریب ان کو مل گیا۔ اس پر جھاڑیاں، گھاس پھونس اور چھوٹے پودے اگے ہوئے تھے۔ نہایت مشکل سے انہوں نے گھاس پھونس اور جھاڑیوں کو ہٹا کر دروازے تک پہنچنے کا راستہ تلاش کیا۔ جیسا کہ چمپا نے بتایا تھا دروازے کے باہر ایک بہت بڑا پتھر راستہ روکے ہوئے تھا۔ ان کو یقین ہوگیا کہ یہی چمپا کا گھر تھا۔

انہوں نے زور لگا کر اس پتھر کو ایک طرف ہٹایا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر زنگ کے سبب وہ جام ہو چکا تھا۔ قوت آزمانے پر وہ کھلنے کی بجائے اکھڑ کر نیچے گر گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو دیکھا، چھت ایک طرف سے نیچے گری ہوئی تھی۔ اندر بھی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان انہوں نے ایک ٹوٹا ہوا انسانی استخوانی ڈھانچہ دیکھا...... جو مٹی اور گھاس پھونس کے نیچے دبا ہوا تھا۔

جونہی سنیل اس ڈھانچے کی طرف بڑھا، ماحول ایک دم تاریک ہوگیا۔ تیز ہوا چلنے لگی۔ برگد کے پتے خوف سے سرسرانے لگے۔ آسمان سے بجلی کڑکی۔ بوڑھا گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''لگتا ہے طوفان آرہا ہے...... جلدی نکلو یہاں سے......'' خود اس نے وہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کی مگر شکستہ چھت سے لکڑی کا ایک ٹکڑا کڑکڑاتا ہوا عین اس کے سامنے آن گرا اور اس کا راستہ روک دیا۔ بوڑھا بری طرح چیختا ہوا اپنی جگہ رک گیا۔

سنیل اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا اس کو اندازہ تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔

پھر اس کے دائیں ہاتھ...... تھوڑی دور چمپا نمودار ہوئی۔

اس کے چہرے پر بیک وقت غصہ، اور افسردگی کی علامتیں تھیں۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو......؟'' وہ سرسراتی آواز میں سنیل سے مخاطب ہوئی۔

''چمپا......! میں یہ سب تمہاری بھلائی کے لئے کررہا ہوں۔ اس طرح تم تمام دکھوں سے آزاد ہو جاؤ گی پرلوک میں پہنچ جاؤ گی...... میں تم سے درخواست کرتا ہوں اس کی اجازت دے دو......''

''بالکل نہیں...... میں تمہیں اپنی ذات اور اپنے معاملات میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دے

سکتی......تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟......میں نے تمہاری زندگی بچائی، اگر میں تمہیں اس دھماکے میں مر جانے دیتی تو تم قدرتی طور پر میرے پاس آ جاتے۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا......اب تم مجھے ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہو......"

"نہیں چمپا......نہیں......میں تو صرف......تمہیں تمہاری موجودہ حالت سے مکتی دلانے کی کوشش کر رہا ہوں......مجھے تم سے پیار ہے......میں تم سے ابھی بھی محبت کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے سنیل نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

چمپا اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے ناراضگی غائب ہونے لگی۔

نائب پجاری اور بوڑھا حیرت زدہ کھڑے یہ سب منظر دیکھ رہے تھے۔

طوفان تھم گیا، ماحول پرسکون ہو گیا۔ سنیل نے ایک گہری سانس لی اور چمپا کی طرف دیکھا۔

وہ جا چکی تھی۔

گاؤں کے کچھ اور لوگوں کو بلایا گیا اور انہیں ساتھ ملا کر انہوں نے چمپا کے گھر کا وہ ٹوٹا ہوا کمرہ صاف کیا اور وہاں پوجا کا انتظام کیا۔ ابھیشک جل چاروں طرف چھڑکا گیا۔ نائب پجاری نے وہاں فرش پر ایک صاف اور ہموار جگہ تلاش کر کے اس پر ہوما کنتھ اور سواستیکا کا نشان بنایا۔ پھر کچھ منتر پڑھنے کے بعد اس نے گھی، پھول اور صندل کی لکڑی کے ساتھ ہون شروع کیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سنیل سے کہا کہ وہ چمپا کے ڈھانچے کو اس کے قریب لے آئے۔

سنیل نے نہایت احتیاط کے ساتھ چمپا کے ڈھانچے کی ہڈیاں اکٹھا کیں، اس دوران میں وہ اپنے آس پاس چمپا کی موجودگی کو صاف محسوس کر رہا تھا۔

سنیل محسوس کر سکتا تھا کہ چمپا کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں مگر ان میں محبت اور تشکر کا جذبہ چمک رہا تھا۔ سنیل نے تمام ہڈیاں اکٹھی کیں اور لا کر ہوما کنتھ کے قریب رکھ دیں۔

اس سارے عمل کے دوران میں نائب پجاری مسلسل منتر پڑھ رہا تھا۔ اس نے سنیل سے کہا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ان منتروں کو دہراتا جائے اور اپنے ذہن میں چمپا کا "سنکلپ" یعنی شبیہہ اور خیال بنائے اور پوتر جل ان ہڈیوں پر چھڑک دے۔ سنیل نے اس کی ہدایت کے مطابق ایسا ہی کیا۔ پھر اس کو کہا گیا کہ وہ ان ہڈیوں پر گھی ڈالے اور ہڈیوں کو ہوما کنتھ کی پوتر چتا میں ڈال دے۔

جونہی ہڈیاں پوتر چتا کی نذر ہوئیں، اچانک ایک سفید شعلہ ہوما کنتھ سے اٹھا اور آسمان کی طرف لپکا۔ نائب فوراً بولا۔ "آخر کار......چمپا کو مکتی مل گئی۔"

کچھ دیر بعد تمام ہڈیاں جل گئیں تو انہوں نے چتا سے راکھ اکٹھی کی اور اس کو ایک مٹی کے برتن میں جمع کر لیا اور اس کا منہ ایک سرخ کپڑے سے بند کر دیا۔ واپسی کا سفر پرسکون تھا۔ شام تک وہ لوگ مندر واپس پہنچ گئے۔

مہا پجاری ان کا انتظار کر رہے تھے۔

"سنیل......! اس کی ارتھی پوتر گنگا کے پانیوں میں بہا دو......" مہا پجاری نے اگلی ہدایت دی۔

دو دن بعد سنیل نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ اس نے سوچا پہلے وہ الہ آباد جائے گا چمپا کی راکھ کو گنگا میں بہا دے گا پھر وہ کنیڈا میں اپنی ماں کے پاس جائے گا جو اپنے گھر میں اس کا انتظار کر رہی ہے اور اس کے لئے پریشان ہے۔

ٹرین میں بیٹھ کر اس نے وہ برتن اپنے سینے سے لگا رکھا تھا جس میں چمپا کی ہڈیوں کی راکھ تھی۔

جب ٹرین چلی تو سنیل نے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے چمپا وہاں دور کھڑی پہاڑوں کے عقب سے اپنا ہاتھ لہرا کر اسے الوداع کہہ رہی ہو۔

ٹرین اپنا سفر شروع کر چکی تھی......امن......نجات......اور سکون......کے ساحلوں کی طرف......

گمشدہ

عمران قریشی۔کوئٹہ

نوجوان کے قریب گاڑی میں دو بڑے بیگ موجود تھے وہ دونوں بیگ فل بھرے ہوئے تھے بیگوں پر وزن ڈالنے سے گداز پن کا احساس ہوتا تھا اور پھر جب انہیں کھول کر دیکھا تو آنکھیں پتھرا گئیں۔

جسم و جاں کو تھراتی اور رگوں میں لہو منجمد کرتی ایک دہشت ناک اور خوفناک کہانی

لڑکا زخمی حالت میں فارم ہاؤس کے باہر موجود ٹیلے کے پاس بے ہوش پڑا ملا تھا۔ اس کا چہرہ بری طرح زخمی تھا۔ دونوں باپ بیٹی اسے اٹھا کر فارم ہاؤس کے اندر لے آئے۔ لیکن حالت زیادہ خراب ہونے کی بدولت اسے گاڑی میں ڈال کر قریب میں واقع ڈاکٹر آصف اقبال کے گھر کی جانب چل دیئے۔ ڈاکٹر آصف نے لڑکے کی حالت کو دیکھتے ہی آپریشن کی اجازت لی۔ اور گھر میں واقع آپریشن روم میں آپریشن کی تیاریاں کرنے لگے۔ غنی فارم ہاؤس کا تعارف کچھ یوں ہے۔ یہ فارم ہاؤس سرسبز و شاداب ٹیلے کو ہموار کر کے نہایت محنت کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔ یہاں عربی نسل کے گھوڑوں کی افزائش نسل کے بعد قریبی قبائل کے سرداروں کے ہاتھوں منہ مانگی قیمت پر فروخت کر دیا جاتا تھا۔

فارم ہاؤس میں غنی صاحب اور ان کی اٹھارہ سالہ لڑکی حبیبہ تن تنہا رہتے تھے۔ غنی صاحب تنہائی پسند انسان تھے۔ لیکن حبیبہ ان کی فطرت کے برخلاف جلد گھل مل جانے والی لڑکی تھی۔ وہ فارم ہاؤس سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔ لیکن باپ کی فطرت کے آگے اسے ہمیشہ سر جھکانا پڑتا تھا۔

گزشتہ سال جنوری کے اوائل میں غنی صاحب نے اس کی منگنی اس کے کزن جبران کے ساتھ کردی تھی۔ جبران کسی بھی لحاظ سے حبیبہ کے معیار پر پورا نہیں اتر پایا تھا۔ تعلیم کی کمی......شکل وصورت واجبی سی......لہجے کی کرختگی......اور جارہانہ انداز......نہ جانے غنی صاحب کو اس میں کیا نظر آیا۔ جو انہوں نے نرم ونازک اور حسین وجمیل حبیبہ کی منگنی اس کے ساتھ کردی۔ وہ رشتے کے لحاظ سے حبیبہ کا کزن اور مرحوم خالہ کا لڑکا تھا۔ اس کی موجودگی حبیبہ کو زہر سے زیادہ بری لگتی تھی۔

بہرحال غنی فارم ہاؤس کے باہر زخمی حالت میں ملنے والا لڑکے کے متعلق غنی صاحب اور حبیبہ قطعاً نہیں جانتے تھے، کہ وہ کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے؟ اسے زخمی کس نے کیا......؟ لیکن نا جانے لڑکے کے مسخ شدہ چہرے میں ایسی کیا بات تھی، کہ ان دونوں کو لڑکے کی بے چارگی پر اپنا دل پسیجتا محسوس ہوا۔ اور وہ بغیر سوچے سمجھے اسے اٹھا کر اپنے فیملی ڈاکٹر آصف اقبال کے گھر لے آئے۔ اس وقت آپریشن شروع ہوچکا تھا۔ دونوں باپ بیٹی کمرے کے باہر بیٹھے انتظار کررہے تھے۔ رات کے ساڑھے تین بجے آپریشن مکمل ہوا۔ اور ڈاکٹر آصف تولیہ کے ساتھ ہاتھ پونچھتے ہوئے نمودار ہوئے۔ ان کے چہرے پر موجود اطمینان کے تاثرات اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ پھر بھی غنی صاحب نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

''لڑکا کیسا ہے......؟ ڈاکٹر آصف......''

''غنی صاحب لڑکے کا چہرہ بری طرح مسخ ہوچکا تھا۔ کچھ شیشے کے ٹکڑوں نے ناک کے پاس موجود دماغ کی رگ کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے اسے مزید متاثر نہیں ہونے دیا۔ اس کی یادداشت کے متعلق یقینی طور پر کچھ بھی کہنے سے معذرت خواہ ہوں۔ ہوش میں آنے کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ آنکھوں کی پتلیوں کے گرد جھلی بھی شیشے کی کرچیوں کی بدولت متاثر ہوئی تھی۔ اس لئے مجھے آنکھوں کا باقاعدہ آپریشن کرنا پڑا۔ شاید ہفتے بھر کے لئے وہ دیکھ نہ پائے۔ پٹی کھلنے پر معلوم ہوگا کہ آنکھوں کی مزید صورت حال کیا ہے۔''

''کیا بہتر ہوسکتی ہے؟'' غنی صاحب نے ممنونانہ نگاہوں کے ساتھ ڈاکٹر آصف کی جانب دیکھا۔ پر تشکر لہجے میں بولے۔

''ڈاکٹر آصف رات کے اس وقت تکلیف دہی کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ لیکن مجبور تھا۔ لڑکے کی حالت ایسی نہیں تھی۔ کہ صبح کا انتظار کیا جاتا۔ امید کرتا ہوں۔ کچھ محسوس نہیں کروگے۔''

''کیسی بات کررہے ہیں غنی صاحب......'' ڈاکٹر آصف نے غنی صاحب کے دونوں ہاتھوں کو تھامتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر......اس کے علاوہ بھی یہ میرا اخلاقی فرض بنتا ہے۔ کہ میں کسی بھی انسان کی صحت یابی کے لئے رات کے کسی بھی پہر کو نظر انداز کرکے بھاگتا چلا آؤں۔ جو مصیبت میں گرفتار ہو۔ آپ کے ساتھ تو میرے فیملی تعلقات بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک بات پوچھنے کی جسارت کروں گا۔ یہ کون ہے؟ اور زخمی کیسے ہوا؟'' غنی صاحب پریشان لہجے میں بولے۔

''میں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ فارم ہاؤس کے باہر ٹیلے کے پاس بے ہوش حالت میں ہوا ملا۔ حالت تشویشناک تھی۔ اس لئے فارم ہاؤس کے اندر لے آیا۔ وہاں فرسٹ ایڈ کی سہولت لا حاصل تھی۔ اس لئے تمہارے پاس آنا پڑا۔

ڈاکٹر آصف نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور بولے۔

''مہربانی کرکے صبح پہلا کام یہ کیجئے گا کہ پولیس میں رپورٹ لکھوا دیجئے گا۔ تاکہ پتہ چل سکے۔ کہ یہ کون ہے؟ اور اس کا تعلق کہاں سے ہے؟''

غنی صاحب نے اقرار میں سر ہلایا۔ اور لڑکے کے ہمراہ فارم ہاؤس واپس چلے آئے۔

اگلے دن اجنبی کو ہوش آگیا۔ ڈاکٹر آصف نے فارم ہاؤس کا چکر لگایا۔ لڑکے کا چیک اپ کیا اور کچھ ادویات لکھ دیں۔ تاکہ میڈیکل اسٹور سے منگوائی جاسکیں۔ اجنبی کی یادداشت متاثر ہوئی تھی۔ اور وہ اپنے متعلق کچھ بھی بتانے سے قاصر تھا۔ غنی صاحب اجنبی سے بات چیت کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن وہ سوائے ہوں ہاں میں جواب دینے کے علاوہ بات چیت کرنے سے گریز کررہا تھا۔ اس کے چہرے کا زیادہ تر حصہ پٹیوں کی نذر تھا۔ ڈاکٹر آصف نے لڑکے کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے کھانے کا ٹائم ٹیبل اور خوراک مختص کردی تھی۔

باہر دروازے کی گھنٹی بجنے لگی۔ حبیبہ دروازے کی جانب دوڑ پڑی۔ وہ خدا سے دعا مانگ رہی تھی۔ کہ پولیس فارم ہاؤس کا رخ نہ کرے۔ کیونکہ لڑکے کی پراسرار تشدد زدہ حالت اس بات کی جانب نشان دہی کررہی تھی کہ معاملہ پولیس کا ہے۔ لیکن دروازہ کھلنے پر اس نے اپنے منگیتر جبران کو سامنے کھڑے پایا۔ اس کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔ جو حبیبہ کو زہر سے زیادہ بری لگتی تھی۔ حبیبہ کو سامنے کھڑے ہوئے دیکھ کر وہ بولا۔

''آج سورج مشرق سے نکلا ہے یا پھر مغرب سے......ہماری منگنی کو سال ہونے والا ہے۔ لیکن تم نے آج تک میرے لئے دروازہ نہیں کھولا۔ پھر آج بھلا ایسا کیوں......؟''

حبیبہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور سائیڈ پر ہوتے ہوئے اسے اندر آنے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

''انکل کہاں ہیں......؟'' جبران نے اس دفعہ درشت لہجے میں پوچھا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہیں۔'' حبیبہ نے بھی سرد لہجے میں جواب دیا۔ جبران نے مزید بات چیت کرنا مناسب نہیں جانا۔ اور اندر کمرے کی جانب چل دیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی پہلی نظر زخمی لڑکے پر پڑی تو اس نے غنی صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟ اور یہاں کیا کررہا ہے؟''

''بے چارہ زخمی ہے۔'' غنی صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ''باہر ٹیلے کے پاس گرا ہوا تھا۔ میں اور حبیبہ اسے اٹھا کر اندر فارم ہاؤس میں لے آئے۔''

جبران درشت لہجے میں بولا۔

''انکل آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے ایک ایسے آدمی کو اٹھا کر گھر لے آئے ہیں۔ جس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ قاتل بھی ہوسکتا ہے۔ پاگل خانے سے فرار ہوا قیدی بھی ہوسکتا ہے۔ گھر میں جوان لڑکی موجود ہے۔ اسے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کیا آپ نے پولیس میں رپورٹ لکھوائی ہے۔؟''

غنی صاحب نے پریشان کن نگاہوں سے جبران کی جانب دیکھتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیا۔

''کمال کرتے ہیں انکل......آپ کو اسے گھر کے اندر لانے سے پہلے رپورٹ لکھوانی چاہیے تھی۔''

غنی صاحب نے بہانہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

''فارم ہاؤس کا فون دو دنوں سے خراب پڑا ہے۔ اس لئے رپورٹ لکھوانا ممکن نہیں۔'' جبران نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں گھر جاتے ہی رپورٹ لکھوا دوں گا۔ اس وقت میرے یہاں آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں حبیبہ کو اپنے ہمراہ ایک دوست کی شادی میں لے جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو کیا میں اسے ساتھ لے جاسکتا ہوں؟''

''......کیوں......نہیں......'' غنی صاحب فوراً

بولے۔ ''بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ تم حبیبہ سے پوچھ لو۔''

''اس سے پوچھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ وہ بھلا کیوں انکار کرنے لگی۔'' اس نے پیچھے کھڑی ہوئی حبیبہ کی جانب دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

حبیبہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''مجھے شادیوں میں جانا پسند نہیں ہے۔ تمہیں اگر پسند ہے۔ تو اکیلے ہی چلے جاؤ۔'' اس نے جواب سنے بغیر کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور باہر نکل کر اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ اسے اپنے پیچھے جبران کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن حبیبہ نے پرواہ نہیں کی، اور اپنے کمرے میں جاکر جھٹکے کے ساتھ دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ نہایت بدتمیزی کے ساتھ دھڑ دھڑایا گیا۔ اس کے بعد بے تکی باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو چند منٹ جاری رہا۔ لیکن حبیبہ نے پرواہ نہیں کی۔ وہ ان باتوں کی عادی ہوچکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تھک ہار کر واپس چلا گیا۔ حبیبہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور بستر پر بیٹھ گئی۔

دوسرے دن صبح سویرے پولیس غنی فارم ہاؤس کی بیل بجا رہی تھی۔ غنی صاحب کسی کام کے سلسلے میں قریبی گاؤں جاچکے تھے۔ اس لئے دروازہ حبیبہ نے کھولا۔ پولیس والوں نے اسے بتایا۔ ''کسی جبران نے رپورٹ لکھوائی ہے۔ کہ غنی فارم ہاؤس میں ایک ایسا زخمی موجود ہے۔ جس کے وجود کے متعلق وہ شکوک میں مبتلا ہیں۔ اور مکمل رپورٹ کسی بھی اہلکار کے ذریعے لکھوانا چاہتے ہیں۔

''حبیبہ کا چہرہ غصے کے عالم میں سرخ ہونے لگا۔ لیکن اس نے مکمل تحمل مزاجی سے کام لیا۔ اور پولیس والوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر کے واپس بھیج دیا۔ کہ زخمی شخص رات کے کسی پہر خاموشی کے ساتھ فارم ہاؤس کو چھوڑ کر فرار ہوگیا۔''

بہرحال لڑکا نہایت تیزی کے ساتھ صحت مند ہورہا تھا۔ لیکن بات چیت کرنے سے اب بھی احتراز کرتا تھا۔ حبیبہ نہ جانے کیوں اس کے وجود میں دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ اس کے کھانے کا خیال رکھتی۔ وقت پر دوا دیتی۔ حالانکہ لڑکے کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اسے سیر کروانے باہر لے جاتی۔ فارم ہاؤس میں گھماتی پھراتی۔ ان دونوں کی دوستی دن بدن گہری ہونے لگی۔ شاید وہ اسے پسند کرنے لگی تھی۔ صرف شکل وصورت کے لحاظ سے نہیں...... خاموش طبع۔ کم گو اور سنجیدہ چہرے کا مالک وہ لڑکا اسے شروع ہی سے اچھا لگا تھا۔ رہی جبران کی بات...... تو حبیبہ نے کبھی بھی اس کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ نہیں سوچا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اسے ناپسند ہی رہا تھا۔

غنی صاحب اور حبیبہ کی شروع سے یہ عادت رہی تھی کہ وہ دونوں صبح منہ اندھیرے اٹھ جاتے۔ پھر ضروریات زندگی سے فارغ ہونے کے بعد فارم ہاؤس سے باہر کا رخ کرتے۔ ہلکی واک اور مختصر ورزش کے بعد وہ پہاڑی چشمے کے پاس بیٹھ جاتے۔ اور تمام دن کے مسائل پر بات چیت کرنے کے بعد فارم ہاؤس واپس چلے آتے۔ اب وہ لڑکا بھی ان کے ہمراہ ان معمولات میں شامل ہوگیا تھا۔ صبح فجر کے بعد ان تینوں نے فارم ہاؤس کے پاس موجود پہاڑیوں کے گرد لمبی واک کی۔ پھر چشمے کے قریب آبیٹھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

غنی صاحب نے لڑکے کی جانب بغور دیکھا۔ اور کہا۔

''کل تمہاری پٹی کھل جائے گی۔ چہرے کی پٹیاں بھی کم ہوتی جارہی ہیں۔ لیکن میں اور حبیبہ ابھی تک تمہارے نام سے ناواقف ہیں۔ بات کرنے کے لئے مخاطب کا نام جاننا ضروری ہے۔ لیکن یہاں معاملہ مختلف ہے۔ کیا تمہیں اپنا نام بھی یاد نہیں رہا؟''

''مجھے معلوم نہیں......'' لڑکا بولا۔ اس کا لہجہ کچھ شائستہ اور دھیما تھا۔ حبیبہ سوچتی تھی۔ کہ اگر لڑکے کے چہرے پر تھپڑ بھی مار دیا جائے۔ تب بھی وہ شاید معافی مانگ کر ایک جانب ہٹ جائے گا۔ لڑنا تو دور کی بات...... وہ چیخنے چلانے سے بھی احتراز کرتا۔ جبران اور اس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

بہرحال لڑکا بولے چلا جارہا تھا۔

''کچھ بھی سوچنا میرے دماغ پر بوجھ ڈالتا ہے۔ مجھے بعض اوقات الجھن بھی ہوتی ہے۔ نہ جانے میں کون ہوں؟ پہلے کیا کام کرتا تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ کچھ یاد نہیں آتا۔''

لیکن ان انگلیوں میں بعض اوقات الجھن محسوس ہوتی ہے۔ سلائی کڑھائی کے متعلق میری معلومات وسیع ہے۔ شاید لاشعور میں میرے کچھ فنی معمولات پوشیدہ ہیں۔''

''یہ معمولات کس ٹائپ کے ہیں؟'' غنی صاحب نے بات درمیان میں کاٹ کر پوچھا۔

''شاید کپڑے اور کوٹ وغیرہ سینے تک محدود ہیں۔ لیکن دماغ پر زور دینے پر کچھ مزید یاد آتا ہے۔'' اس نے بات کو یکدم بدل دیا۔ اور بولا۔

''سیاہ رنگ کے بیگ کو باہر پھینکتے ہوئے۔ اسٹیرنگ ہاتھوں میں مکمل گھوم گیا۔ گاڑی تیر کی مانند پہاڑی دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی۔ ونڈ اسکرین کے شیشوں کی کرچیاں میرے چہرے کے اوپر آگریں۔ اس کے بعد مجھ کو ہوش نہ رہا۔''

غنی صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر پوچھا۔

''اچھا تو تمہارا ذریعہ معاش درزی کے پیشے سے منسلک تھا۔ کیا صرف مردانہ کپڑے سیتے تھے۔ یا پھر زنانہ بھی؟''

لڑکا حیرت انگیز طور پر آج بات چیت کرنے کے موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ بولا۔

''شاید زنانہ کپڑے...... مجھے کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ زنانہ کوٹ سینا میری فنی صلاحیتوں میں سے ایک تھا۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے بتایا۔ ''انسانی کھال سے بنا ہوا انسانی کوٹ...... عورتیں ان کوٹوں پر ٹوٹ پڑتی تھیں۔''

غنی صاحب نے حیرت بھری نگاہوں سے لڑکے کی جانب دیکھا۔ پھر تفہیمی لہجے میں پوچھا۔

''تم نے کیا کہا۔ انسانی کھال سے بنا ہوا کوٹ...... بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تم شاید بھول رہے ہو کہ۔ وہ انسانی کھال سے نہیں...... بلکہ کسی جانور کی کھال سے بنا ہوا کوٹ ہوگا۔''

لڑکے نے انکار میں سر ہلایا۔ اور بولا۔

''وہ یقیناً انسانی کھال سے بنا ہوا کوٹ ہی تھا۔ کیمل کلر...... گلابی کلر...... آف وائٹ...... اور سیاہ رنگ پر مشتمل انسانی کھال سے بنا ہوا کوٹ...... اگر آپ کو کوئی بھی رنگ پسند ہو۔ تو ہماری خدمات حاصل کریں۔''

اسے اپنی فنی زندگی کی بہت سی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ اور وہ اب طوطے کی طرح بات چیت کررہا تھا۔ حبیبہ اور غنی صاحب حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک بہترین سیلزمین کی طرح بات چیت کررہا تھا۔

''ہم ہر سائز اور ہر ڈیزائن کے کوٹ سیتے ہیں۔ ہماری فرم کا نام یاد رکھئے۔ احمد فیبرکس مارٹ اینڈ ٹیلرنگ...... میرا نام احمد ہے۔ اور اس بوتیک کا مالک ہوں۔''

غنی صاحب نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''تو تمہارا نام احمد ہے۔ اور شہر میں شاید تمہاری بہت بڑی بوتیک اور ان سلے کپڑوں پر مشتمل کاروبار ہے۔ یہ ایک اچھا کیو ہے۔ میں کل ہی اپنے چند دوستوں کو بوتیک کی تلاش کی ہدایات دیتا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی تمہارے گھر والوں کے متعلق بھی معلومات حاصل ہوجائیں گی۔''

احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔ حبیبہ کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ لیکن اس نے بات چیت کی کوشش نہیں کی۔

سورج نکل آیا تھا۔ اس لئے تینوں اٹھ کر گھر کی جانب چل دیئے۔ گھر کے سامنے جبران کی اسپورٹس

کار کھڑی تھی۔ حبیبہ کے چہرے پر الجھن کے تاثرات مزید گہرے ہونے لگے۔ اور اس نے آگے بڑھ کر احمد کے ہاتھ کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیا۔ جبران وسیع وعریض ٹی وی لاؤنج کے درمیان میں بیٹھا ٹی وی پر مار دھاڑ پر مشتمل کوئی فلم دیکھنے میں مصروف تھا۔ غنی صاحب اور حبیبہ کو احمد کے ہمراہ اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔ اور وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"یہ لڑکا ابھی تک فارم ہاؤس میں موجود ہے۔ یعنی پولیس والوں سے جھوٹ بولا گیا۔ کہ یہ فارم ہاؤس سے جا چکا ہے۔ مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" یکلخت اس کی نگاہ حبیبہ اور احمد کے ہاتھوں پر پڑی۔ حبیبہ نہایت بے تکلفی کے ساتھ احمد کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئی تھی جبران کا خون کھولنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر احمد کو گریبان سے تھاما۔ اور زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ لیکن حبیبہ نے پھرتی کے ساتھ اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ جبران نے ہاتھوں کو چھڑوانے کی کوشش کی۔ غصے کی شدت کی بدولت حبیبہ کی گرفت نہایت مضبوط تھی۔

غنی صاحب نے بمشکل جبران کو حبیبہ کے ہاتھوں سے چھڑوایا۔ پھر حبیبہ کو ڈانٹتے ہوئے اپنے کمرے میں جانے کا حکم دیا۔ حبیبہ نے پاؤں پٹختے ہوئے خونخوار نگاہوں سے جبران کو دیکھا۔ پھر اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔ جبران کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔ اسے اور تو کچھ نہیں سوجھا۔ اس نے ایک جانب موجود فون کے ریسیور کو اٹھایا۔ اور پولیس ہیڈ کوارٹر کے نمبر ملانے لگا۔ وہ غصے کے عالم میں بڑبڑا رہا تھا۔

"اس پاگل لڑکی نے ایک ایسے انسان کی خاطر میرے ہاتھوں کو تھامنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے متعلق وہ جانتی بھی نہیں ہے کہ وہ انسان بھی ہے...... یا پھر بھیڑیا ہے۔ اس نے یکلخت غنی صاحب کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

"معاف کرنا انکل...... لیکن آپ یہ اچھا نہیں کر رہے۔ آپ کو اسے سمجھانا چاہیے تھا۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے آپ بھی حبیبہ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ یقیناً آپ کچھ دنوں کے بعد ہماری منگنی توڑنے کی بات چیت بھی کریں گے۔ اس سے پہلے میں اس منحوس کو پولیس کے حوالے کردوں گا۔"

پولیس کے نام پر احمد کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور وہ یکلخت دیوار کو تھامے ٹی وی لاؤنج سے باہر کی جانب چل دیا۔ ٹیلی فون خراب تھا۔ جبران نے غصے کے ساتھ ریسیور کریڈل پر پھینک دیا۔ اور چلاتے ہوئے بولا۔ "میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔ اب انتہا ہو چکی ہے۔ اس گھر میں یا تو لڑکا رہے گا۔ یا پھر میں......؟"

غنی صاحب نے اس کے ہاتھوں کو تھامنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے جھٹکے کے ساتھ بازوؤں کو چھڑایا۔ اور ٹی وی لاؤنج سے باہر اپنی گاڑی کی جانب چل دیا۔ احمد کار پورچ کے ساتھ موجود لان میں بیٹھا ہاتھوں کی انگلیوں پر لگی ہوئی کالک کو صاف کر رہا تھا۔ جبران نے اسے کھا جانے والی نظروں کے ساتھ دیکھا۔ پھر دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور گاڑی کو گیٹ سے باہر نکالتا چلا گیا۔

گاڑی کے نیچے کی اس زمین پر موبل آئل گرا ہوا تھا۔ غنی صاحب نے آگے بڑھ کر گیٹ کو بند کر دیا۔ حبیبہ ٹی وی لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اور کوئی بھی بات کئے بغیر لان میں بیٹھے احمد کی جانب چل دی۔ غنی صاحب نے اسے کن انکھیوں کے ساتھ دیکھا۔ پھر بات کرنا مناسب نہ جانتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

احمد بھی اپنے ہاتھوں پر موجود کالک کو صاف کرنے میں مگن تھا۔

حبیبہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے ہاتھوں کو کیا ہوا؟ یہ کالک کیسے لگی؟"

احمد بولا...... "بوتیک سے پہلے میں گاڑیوں کا کام بخوبی کر لیتا تھا۔ میرے ہاتھوں میں اتنا ہنر موجود تھا۔ کہ رات کی تاریکی میں بھی گاڑی کے پرزے کھول کر دوبارہ لگا سکتا تھا۔ آج بھی بغیر آنکھوں کے میں نے کام کر لیا۔" وہ لاشعوری کے عالم میں بات کر رہا تھا۔ "تم یقین جانو کبھی کبھی میری انگلیوں میں کرنٹ سا آ جاتا ہے۔ فارغ بیٹھنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اور میں فارغ بیٹھتا بھی نہیں ہوں۔"

"لاؤ میں تمہارے ہاتھ دھلوادوں۔" حبیبہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور اٹھ کر حبیبہ کے ہمراہ کمرے کی جانب چل دیا۔ حبیبہ نے صابن کے ساتھ اس کے ہاتھوں پر لگی ہوئی کالک کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کالک اترنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کافی دیر رگڑ رگڑ کر دھونے کے بعد ہاتھ کسی حد تک صاف ہو گئے۔ حبیبہ نے ہاتھوں پر کریم لگائی۔ اور اس کے ہمراہ کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ احمد کے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں۔ دودھ کی طرح سفید رنگت اور انگلیاں مخروطی...... کسی فنکار کی مانند پتلی اور لمبی...... نا جانے اس کے اندر کتنی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ اور دوسری جانب جبران کے چوڑے اور بھدے ہاتھ...... جن میں ہنر کے بجائے لڑنا جھگڑنا لکھا ہوا تھا۔ حبیبہ کو اچانک کچھ یاد آیا۔ اور وہ پرجوش لہجے میں احمد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"احمد کیا تم مجھے سلائی کڑھائی سکھا سکتے ہو۔ مجھے بچپن سے اس کا بہت شوق رہا ہے۔ لیکن یہاں سکھانے والا کوئی نہیں......" احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور بولا۔ "اگر سلائی کڑھائی کے لوازمات موجود ہوں۔ تو میں بخوبی سکھا سکتا ہوں۔"

"لوازمات بھلا کیا ہو سکتے ہیں؟" حبیبہ نے پوچھا۔ احمد نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔

"سلائی مشین۔ قینچی۔ سوئی دھاگہ۔ فیتا اور کٹنگ کے لئے کپڑا......"

حبیبہ نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولی۔

"اور یہ سب کچھ میرے پاس موجود ہے۔ میں لے کر آتی ہوں۔" اور اٹھ کر کمرے کی جانب بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور کچھ دیر کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہو کر احمد کے سامنے بیٹھی ہدایات کی منتظر تھی۔ وہ تمام دن کٹنگ کرتے اور سلائی کرتے ہوئے گزر گیا۔ شام کو خوبصورت پنک گلابی رنگ کا سوٹ حبیبہ کے چہرے کے سامنے دھرا پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا خوبصورت اور مکمل سوٹ بھی خود تیار کر پائے گی۔ لیکن حقیقتاً سوٹ سامنے موجود تھا۔ اس نے سوٹ اٹھایا۔ اور غنی صاحب کے سامنے لے کر رکھ دیا۔

وہ حیرت بھرے لہجے میں بولے۔

"اتنا خوبصورت اور نفیس سوٹ کہاں سے لائی ہو؟"

"یہ میں نے خود تیار کیا ہے؟" حبیبہ چہکتے ہوئے بولی۔ "احمد نے مجھے ہدایات دیں۔ اور میں نے سلائی مشین پر اسے تیار کیا۔"

غنی صاحب افسردہ لہجے میں ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔

"احمد ایک باصلاحیت اور ہنرمند لڑکا ہے۔ مجھے حیرانگی ہوتی ہے کہ اتنی چھوٹی عمر میں اتنے وسیع وعریض کاروبار کا مالک بھلا کیسے بن گیا؟ لیکن افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ میں نے تمہاری بات چیت کرنے میں بہت جلدی کر دی۔ جبران نا صرف عمر میں تم سے بڑا ہے۔ بلکہ کسی بھی لحاظ سے تمہارے قابل نہیں ہے۔ مجھے اس فیصلے پر ہمیشہ افسوس رہے گا۔"

حبیبہ نے کوئی بھی جواب دیئے بغیر سوٹ اٹھایا۔ اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے دن صبح سویرے ڈاکٹر آصف نے احمد کی آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ احمد نے پہلی دفعہ اپنے محسنوں کے چہروں کا تفصیلی جائزہ لیا۔

اٹھارہ سالہ حبیبہ کی آنکھیں شربتی رنگ کی۔ ناک ستواں۔ ہونٹ سیب کی کٹی ہوئی قاشوں کی مانند اور بال کندھوں تک کٹے ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر نہایت حسین وجمیل اور کم عمر تھی۔ لیکن رنگت سانولی اور تانبے کی مانند تھی۔ اس لئے پرکشش بھی تھی۔

ڈاکٹر آصف نے چند ڈراپس آنکھوں میں ڈالنے کے لئے لکھے۔ لڑکے کی یادداشت کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ بہتر ہوتی جائے گی۔ پھر وہ اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہوگئے۔

غنی صاحب اور حبیبہ نے احمد کو صحت یابی کی مبارک باد دی۔ اور آنکھوں کے متعلق احتیاط کا کہہ کر اپنے کمروں کی جانب چل دیئے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ حبیبہ نے دروازہ کھولا۔ تب باہر جبران کے نوکر کو کھڑے ہوئے پایا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اور جسم میں بے چینی کی لہر دوڑتی محسوس ہورہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ پریشان لہجے میں بولا۔

"بی بی جی...... جبران صاحب کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے، اور وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ آپ کے گھر کا فون خراب تھا۔ اس لئے میں بس کے ذریعے اطلاع دینے آیا ہوں۔"

حبیبہ کو اپنے سر پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کیا کہہ رہے ہو۔ بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ ابھی کل تو وہ یہاں آیا تھا۔ اور ٹھیک ٹھاک واپس گیا تھا۔" نوکر بولا۔

"یہاں سے واپس جاتے ہوئے ان کی گاڑی کے بریک فیل ہوگئے۔ اور گاڑی نیچے کھائی میں جاگری۔ ان کی موت موقع پر ہی واقع ہوگئی۔"

حبیبہ کو پچھلے دنوں کی چند باتیں یاد آنے لگیں۔ احمد کے ہاتھوں پر لگی ہوئی کالک...... کار پورچ میں موبل آئل کا گرا ہونا...... اور احمد کا اقرار کرنا کہ اسے گاڑیوں کے کام میں مہارت حاصل ہے۔ تمام کڑیاں یکلخت آپس میں ملنے لگیں۔

حبیبہ کا چہرہ مسرت کی بدولت کھلنے لگا۔ وہ آزاد ہوچکی تھی۔ جبران کے منحوس وجود کو مزید برداشت کرنا اس کے لئے مشکل ترین ہوتا چلا جارہا تھا۔ لیکن قدرت نے اسے یکلخت جبران کے وجود سے نجات دلا دی تھی۔ وہ خوشی کے مارے غنی صاحب کے کمرے کی جانب بے تحاشا دوڑ پڑی۔ جب اس نے غنی صاحب کو جبران کی موت کے متعلق بتایا۔ جب ان کا ردعمل بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ حبیبہ کا...... لیکن انہوں نے فوراً کپڑے تبدیل کئے۔ اور نوکر کے ہمراہ فارم ہاؤس سے کچھ دور جبران کے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔

غنی صاحب کے فارم ہاؤس سے باہر نکلتے ہی حبیبہ احمد کے کمرے کی جانب بھاگ کھڑی ہوئی وہ بیڈ پر بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ حبیبہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی خوشی کے ساتھ چلاتے ہوئے کہا۔

"وہ مرگیا ہے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ یہ سب کچھ تم نے کیا ہے۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھلا پاؤں گی۔"

احمد کے چہرے پر تاثرات مفقود ہی رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ بولا تب بھی ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کنوئیں کی گہرائی سے آواز آرہی ہو۔

"وہ بھی مرگئی تھی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ ایسا ہی چاہتی تھی۔ ہمیشہ امر ہونا۔ میں نے اسے امر کردیا۔ ہمیشہ کے لئے محفوظ کرکے......"

حبیبہ نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا پھر پوچھا۔

"احمد تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا...... یہ کیا اول فول بک رہے ہو۔" لیکن احمد نے اب بھی حبیبہ کی باتوں کی جانب توجہ نہ دی۔ اور بولتا چلا گیا۔

"احمد فیبر کس کو منظر عام پر لانے کے لئے کتنے جتن کرنے پڑے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اور یہ آسان مشکل نہیں تھا۔ لیکن کپڑوں کی دنیا میں چھا جانا ناممکن تھا۔ ان دنوں میرے پاس کپڑوں کا کام نا ہونے کے برابر تھا۔ احمد فیبر کس کا نام ونشان نہیں تھا۔ کام صرف احمد ٹیلرنگ تک محدود تھا۔ مارکیٹ پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے ضروری تھا۔ کہ کسی بھی ایسی تخلیق کو منظر عام پر لایا جاتا۔ جو آج سے پہلے نا تو دیکھی گئی ہو۔ اور نا ہی سنی گئی ہو۔ تب انسانی کھال پر مشتمل کوٹ کا آئیڈیا میرے دماغ کے پردے پر نمودار ہوا۔ انسانی کھال نہایت نازک اور نفیس ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس سے تیار کردہ کوٹ بھی نفیس ہوتا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کھال کہاں سے حاصل کی جائے؟ اس گھمبیر مسئلے کو خدا نے حل کردیا۔

میری خالہ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد وفات پاگئیں۔ میں نے پہلی دفعہ تجربے کے طور پر ان کی کھال کو گوشت سے علیحدہ کیا۔ مختلف محلولات کے ذریعے دھویا۔ پھر خشک کرنے کے بعد اپنی خالہ کی سرخ وسفید کھال سے ایک نہایت دیدہ زیب ودلفریب زنانہ کوٹ بنالیا۔ اب اسے فروخت کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ ان دنوں میری دکان مختصر تھی۔

میں نے دوکان کے فرنٹ شیشے پر کوٹ لٹکا دیا۔ دوسرے دن ہی میری ایک مستقل گاہک کو کوٹ پسند آیا۔ اور وہ منہ مانگے داموں کوٹ خرید کے لے گئی۔ ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا۔ کہ وہ عورت دوبارہ دوکان پر آئی۔ اور اس نے مزید تین کوٹوں کا آرڈر دیا۔

میں نے حامی بھر لی۔ حالانکہ انسانی کھال میرے پاس موجود نہیں تھی۔

میرے گھر کے پاس امیر لوگوں کا قبرستان تھا۔ چوکیدار کے ساتھ میری جان پہچان تھی۔ میں نے اسے اپنے راز میں شامل کیا۔ اور معقول معاوضہ دینے کے بعد ایسی لاشیں لانے کی ہدایات دیں۔ جو اسی دن دفن کی گئی ہوں۔

کام معقول طریقے کے ساتھ چل نکلا۔ لاش کی دستیابی کے فوراً بعد میں کھال کو گوشت سے علیحدہ کرتا۔ یہ ایک نہایت حساس اور تکلیف دہ عمل ہوتا تھا۔ لیکن فوراً ایسا کرنا پڑتا تھا گوشت کو کفن میں باندھ دیتا۔ اور چوکیدار کے حوالے کردیتا۔ چوکیدار کفن میں پوشیدہ گوشت کے ملغوبے کو دوبارہ قبر میں منتقل کرکے اسے برابر کردیتا۔ کام بہ احسن وخوبی انجام پانے لگا۔ اور میرا کام بھی خوب سے خوب تر پھیلنے لگا۔ میں نے چھوٹی دوکان کاریگروں کے حوالے کی۔ اور شہر کے درمیان میں ایک وسیع وعریض دوکان خرید کر نہایت اعلیٰ پیمانے پر بوتیک کا آغاز کردیا۔ نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کا تانتا بندھ گیا۔ کام سنبھالنا میرے لئے مشکل ہوگیا۔ پیسوں کی بھرمار تھی۔ پیسے بارش کی طرح برسنے لگے۔ ایسے معاملات میں انسان لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بننے لگتا ہے۔ میں نے حتی الوسیع کوششیں کیں۔ کہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز نہ بنوں۔ لیکن ناکام رہا۔ قبرستان کا چوکیدار جسے میں معقول معاوضہ دے رہا تھا۔ اسے یہ احساس ہوچکا تھا کہ اگر میں کروڑ پتی نہیں...... تو لکھ پتی تو خود بن چکا تھا۔ علاوہ ازیں اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں ناجائز سرگرمیوں میں بھی ملوث تھا۔ مجھے کچھ دنوں سے اس کے تیور بھی خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔"

اس نے سانس لینے کے لئے کہانی کے سلسلے کو منقطع کیا۔ حبیبہ مکمل انہماک کے ساتھ کہانی سننے میں مگن تھی۔ وہ اسے حقیقت تصور نہیں کررہی تھی کہ بلکہ لفاظی پر مشتمل ایک دماغی اختراع سے تشبیہہ دے رہی تھی۔ اور ڈاکٹر آصف کا کہنا بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ لڑکے کا دماغی توازن درست نہیں۔ احمد نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

"اس رات بارش طوفانی انداز میں برس رہی تھی۔ بوتیک میں تمام دن کام رہا۔ اس لئے سرشام میں نے بوتیک کو بند کردیا۔ پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی جانب چل دیا۔ گاڑی کو گیرج میں بند کرنے کے بعد جب میں نے گھر میں قدم رکھا۔ تب چوکیدار کو اپنا منتظر پایا۔ مجھے حیرت تو بہت ہوئی۔ لیکن میں حیرت زدہ ہونے کے لئے کچھ دنوں سے تیار تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا۔ پھر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر

میں بند قبروں کو کھود کر مردے باہر نکال سکتا ہوں۔ تو بند گھروں میں داخل ہونا بھی میرے لئے کوئی بڑی بات نہیں۔"

میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے فریج کو کھولا۔ اور کولڈ ڈرنک باہر نکال کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر طنزیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب بتاؤ کہ تم بن بلائے میرے گھر میں اس وقت کیا کر رہے ہو؟"

چوکیدار نے قہقہہ لگایا۔ پھر آگے بڑھ کر فریج کھول کر بوتل باہر نکالی۔ اور ڈھکنا کھول کر ایک ہی سانس میں حلق سے نیچے اتار لی۔ بوتل کو میرے سامنے میز پر رکھنے کے بعد وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ زیادہ نہیں......صرف دس لاکھ......؟ مجھے امید ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے......؟"

اس نے بوتل کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"اگر میں انکار کردوں تب......؟"

"میں پولیس کو سب کچھ بتادوں گا۔" چوکیدار حتمی لہجے میں بولا۔

"لیکن ایسی صورت میں تمہاری مستقل آمدنی یکدم بند ہوجائے گی۔ میرے جیل چلے جانے کے بعد تمہیں مردوں کو قبر سے باہر نکالنے کے لئے رقم کون دے گا۔"

چوکیدار لمبا سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"لیکن مجھے واقعی رقم کی ضرورت ہے۔ اگر نہیں دو گے۔ تب میں یقیناً پولیس کو بتادوں گا۔ رقم حاصل کرنے کا آخری ذریعہ میرے پاس تو صرف تم ہو۔ اور میں اس ذریعے کو استعمال کر کے ہی رہوں گا۔"

میں نے بوتل کا آخری گھونٹ بھرا۔ اور اسے میز پر رکھ دیا۔ پھر چوکیدار کی جانب دیکھتے ہوئے مطمئن لہجے میں بولا۔

"جب چیونٹی کے پر نکلنے لگتے ہیں۔ تب اس کے موت کے دن قریب ہوتے ہیں۔ میں چند دنوں سے تمہارے رویئے میں تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ اور مجھے معلوم تھا۔ کہ تم اپنی اوقات سے باہر نکلنے کی کوششیں کرو گے۔ اس لئے سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے کھال کی ضرورت تو ہمیشہ ہی پڑتی رہتی ہے۔ اس بات سے مجھے کوئی سروکار نہیں کہ کھال زندہ انسان کی ہے یا پھر مرے ہوئے کی۔ مجھے صرف کھال سے مطلب ہے۔ اگر یہ کھال تمہاری بھی ہو۔ تو مجھے اعتراض نہیں۔"

میں نے بات کے درمیان ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کو باہر نکال لیا۔ اور اس کی نال کا رخ چوکیدار کی جانب کردیا۔ چوکیدار کے چہرے پر تذبذب کے آثار پیدا ہوئے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے موقع دیئے بغیر گولی چلا دی۔ یہ خیال ضرور رکھا کہ گولی اس کے جسم کے کسی بھی حصے کو نہ لگنے پائے۔ یعنی ہدف اس کا سر تھا۔ کیونکہ مجھے اس کی کھال سے کوٹ تیار کرنا تھا۔ وہ لہرا کر زمین پر گر گیا۔ میں نے تمام رات اس کی کھال کو گوشت سے علیحدہ کیا۔ کھال کو محفوظ کرنے کے بعد بقایا جات کو بڑے تھیلے میں بھر کر گاڑی میں رکھا۔ اور شہر سے دور بہنے والی نہر میں پھینک دیا۔ معاملہ ختم ہوگیا۔

معمولات دوبارہ ڈگر پر آگئے۔ لیکن لاشوں کی دستیابی کا سلسلہ یکلخت منقطع ہوگیا۔ ان دنوں اموات کا سلسلہ بھی نا ہونے کے برابر تھا۔ میں نے کسی بھی گھر میں ماتم نہیں دیکھا تھا۔ میرا کام متاثر ہونے کا خدشہ بڑھنے لگا۔ اس مسئلے کا حل میں نے یوں نکالا۔ کہ اپنے گھر سے کچھ دور واقع ایک ایسے گھر کا انتخاب کیا۔ جہاں ایک نوجوان جوڑا رہائش پذیر تھا۔ میں آدھی رات کو ان کے گھر میں داخل ہوا۔ انہیں سوتے ہوئے رسیوں کے ساتھ باندھا۔ پھر کمرے میں جلتے ہوئے ہیٹر کو بند کر کے گیس کو مکمل کھول دیا دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے میں خود ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

ایک گھنٹے کے بعد جب میں کمرے کا رخ کیا۔ تب کمرہ گیس سے پوری طرح بھر چکا تھا۔ اور میاں بیوی عالم بالا کو سدھار چکے تھے۔ میں نے ان کے ہاتھ پاؤں کو رسیوں سے آزاد کیا۔ کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کر کے خود کھڑکی کے ذریعے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر کھڑکی کو بھی میں نے اچھی طرح بند کردیا۔ گیس کو میں نے دوبارہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔

دوسرے دن محلے میں میاں بیوی کی موت کا ہنگامہ برپا ہوا۔ ہر شخص موت کا ذمہ دار میاں بیوی کی لاپرواہی کو گردان رہا تھا۔ اور موت کی وجہ گیس بھر جانے کو دیا جا رہا تھا۔ دوپہر کے قریب دو جنازے محلے سے اٹھے۔ دونوں میاں بیوی کے عزیز واقارب روتے دھوتے انہیں قبرستان میں لے جا کر دفن کیا۔ اور اپنے گھروں کی جانب چلے گئے۔

رات تین بجے کے قریب میں نے قبروں کو دوبارہ کھودا اور مردوں کو باہر نکال کر گھر واپس آگیا۔"

حبیبہ حیرت بھری نگاہوں سے احمد کی جانب دیکھتے ہوئے یہ دہشت ناک کہانی سننے میں مگن تھی۔ احمد کے چپ ہوتے ہی بولی۔

"تم ایک اچھے قصہ خواں ہو۔ اگر اخباروں میں لکھو۔ تو یقیناً کامیاب ہوگے۔ لیکن تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا۔ کہ پولیس تمہارے پیچھے کیسے لگی۔ جس سے بچنے کے لئے تم فارم ہاؤس تک چلے آئے۔"

احمد نے طویل سانس لیا۔ اور بولا۔

"ان دنوں میرے بوتیک پر ایک لڑکی کا بہت آنا جانا تھا۔ اس کا نام مجھے صحیح طور یاد نہیں۔ شاید صدف تھا۔ بہرحال وہ مجھ میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اور میں اس کی کھال میں......بہت ملائم اور سانولی رنگ کی کھال تھی۔ لڑکی کے ہمراہ اس کا ایشین کتا بھی ہوتا تھا۔ جو مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ لیکن لڑکی کی بدولت مجھے اسے برداشت کرنا پڑتا تھا۔

بہرحال کچھ ہی دنوں میں بات چیت آگے بڑھی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ انجام کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حدوں کو پھلانگ گیا۔ لیکن دل نہیں بھر سکا۔ تب میں نے اسے شہر سے باہر موجود کوٹھی پر بلایا۔ اور رات کو گلا دبا کر مارنے کے بعد کھال اتار لی۔

پروسیسنگ کا عمل شروع ہوا۔ پھر کٹائی کے بعد سلائی ہوئی۔ نہایت خوبصورت اور دلفریب کوٹ بن کر بوتیک کی زینت بنا لیکن ناجانے اس منحوس کتے کو کیسے علم ہوگیا کہ لڑکی کی گمشدگی میں میرا ہاتھ موجود ہے۔ وہ مجھے بوتیک کے اردگرد گھومتا دکھائی دینے لگا۔ اس نے بوتیک کے اندر آنے کی کوششیں کی۔ صرف بوتیک کے شیشوں سے مزین دروازے کے باہر بیٹھا۔ اس کوٹ کی جانب دیکھتا رہتا تھا۔ جو اس کی مالکن کی کھال سے تیار کردہ تھا۔ لڑکی کے گھر والوں نے پولیس میں رپورٹ لکھوا دی۔ پولیس نے تفتیش کا آغاز کیا۔ لڑکی کے ملنے جلنے والوں کی فہرست حاصل کی۔ اس فہرست میں اول میرا نام تھا۔

حیرت انگیز طور پر جب پولیس والوں نے پوچھ گچھ کے لئے میری بوتیک کا رخ کیا۔ تب شیشے کے دروازے کے کھلتے ہی باہر بیٹھے ایشین کتے نے چھلانگ لگائی۔ اور پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر نسواری رنگ کے اس کوٹ کو دبوچ لیا۔ جس سے اسے اپنی مالکن کے جسم کی بو آتی تھی۔

پولیس نے مجھ سے کتے کے متعلق دریافت کیا۔ تب میں نے نہایت معصومیت کے عالم میں لاعلمی کا اظہار کردیا۔ لیکن بوتیک کے مختصر عملے نے انہیں لڑکی کے متعلق بتادیا۔ کتا کوٹ کو زمین پر رکھے اسے چاٹنے میں مصروف تھا۔ پولیس والے شکوک میں مبتلا ہوگئے۔ لیکن ثبوت کی عدم موجودگی کی بدولت مجھے کچھ بھی کہے بغیر کوٹ اور کتے کو ہمراہ لئے بوتیک سے باہر چلے گئے۔ میرا وجود ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔ اور انہوں نے خفیہ طریقے سے میری نگرانی کا کام شروع کردیا۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے بالکل بھی خبر نہ ہوسکی کہ میری نگرانی کی جارہی ہے۔ میں نے اس واقعہ کے بعد کچھ عرصے کے لئے اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کو ترک

کردیا۔ لیکن حالات ساز گار ہوتے ہی دوبارہ سرگرمیوں کا آغاز کردیا۔ اس دفعہ میری توجہ کا مرکز ایک ایسی لڑکی بنی جس کی رنگت دودھ کی مانند سفید تھی۔ وہ میرے بوتیک کے سامنے والی بلڈنگ میں کسی آفس میں اسٹینو ٹائپسٹ تھی۔ میں ان دنوں نئے ماڈل کی مہنگی گاڑی کی تلاش میں مگن تھا۔ موجودہ گاڑی کو میں نے اونے پونے فروخت کردیا تھا۔

اس لڑکی کے پاس پرانی ٹیوٹا کار تھی۔ سرشام بوتیک کو بند کرکے جب میں باہر نکلا۔ تب وہ بھی باہر جانے کے لئے نکل رہی تھی۔ شاید کچھ دنوں سے میری پرکشش شخصیت اس کی دلچسپی کا باعث بن رہی تھی۔ تبھی اس نے مجھے اپنے ہمراہ گھر جانے کی دعوت دے دی۔ جسے میں نے بخوشی قبول کرلیا۔ یوں بات چیت کا آغاز ہوا۔ اور ملاقاتوں کا نا ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔

ایک رات اس نے مجھے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانا کھانے کے بعد مختصر بات چیت کرتے ہوئے اس نے الماری کے خفیہ خانے سے شراب کی بوتل باہر نکالی۔ اور مجھ سے معذرت کرنے کے بعد اوپر تلے تین چار گلاس حلق میں انڈیل لئے۔ میں اس کے مدہوش ہونے کا منتظر تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب وہ ہوش وحواس کی دنیا کو خیر باد کہہ چکی تھی۔ تب میں نے گلا دبا کر اسے ماردیا۔ میں فلیٹ میں آنے سے پہلے کیل کانٹے سے لیس ہو کر آیا تھا۔ اس لئے نہایت اطمینان کے ساتھ میں نے پہلے گوشت کو کھال سے علیحدہ کیا۔ اور کھال کو بیگ میں احتیاط کے ساتھ رکھنے کے بعد گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے انہیں دوسرے بیگ میں ڈالنے کے بعد باہر کی جانب چل دیا۔ میں کھال اتارنے میں ماہر ہوتا جارہا تھا۔ اس تمام عمل میں مجھے بمشکل ایک گھنٹہ لگا۔

بہرحال باہر جانے سے پہلے میں نے چہرے کو فلسطینی رومال سے اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ لڑکی کی ٹیوٹا گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اردگرد نگاہ دوڑائی۔ تب پہلی دفعہ میں نے دو مشکوک آدمیوں کو چوک کے پاس کھڑی ہوئی کار کے کھڑے ہوئے دیکھا۔ ان کی چال ڈھال نے بخوبی اندازہ لگالیا۔ کہ وہ دونوں پولیس کے ہیں۔ میں نے پھرتی کے ساتھ دونوں بیگوں کو سیٹ پر رکھا۔ اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے گاڑی شہد سے باہر کی جانب کردیا۔ میرے اندازے مطابق میرے وہاں سے روانہ ہونے کے فوراً بعد دونوں میں سے ایک نے میرا تعاقب شروع کر جب کہ دوسرے نے لڑکی کے فلیٹ کی تلاشی لی۔ ہے وہاں سے اسے کوئی بھی ثبوت حاصل نہیں ہوا ہوگا۔ شاید اس کے حساس ناک نے خون کی بو محسوس کرلیا ہو۔ لیکن یہ بو فریج میں رکھے ہوئے گوشت کی بھی ہوسکتی ہے۔ میں نے فلیٹ سے باہر نکلنے پہلے فرش کو اچھی طرح دھونے کے بعد پنکھا مکمل کے ساتھ چلادیا تھا۔ یقیناً اسے مقصد میں ناکامی ہوئی ہوگی۔ فلیٹ کو خالی پاکر اس نے اپنے دوسرے ساتھی کو وائرلیس کے ذریعے بتایا ہوگا۔ کہ فلیٹ ہے۔ یہاں کوئی بھی موجود نہیں۔ نا ہی لڑکی اور نا آدمی جس کی نگرانی کی جارہی تھی۔ اس رپورٹ کے پولیس والوں کی توجہ کا مرکز وہ نیلے رنگ کی ٹیوٹا جسے میں ڈرائیو کررہا تھا۔

رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا۔ پولیس کی کار مجھ سے کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ ویرانے میں تعاقب جاری رکھنے کے لئے شاید اس نے یہ صورت اختیار کی تھی تب میں نے نہایت رفتار کے ساتھ گاڑی کرتے ہوئے پیچھے موجود گوشت والے بیگ کو قریب سے گزرتے ہوئے دریا میں پھینک دیا میں اسٹیرنگ کو سنبھال نہ پایا۔ اور گاڑی سڑک سے اتر کر ایک کھائی میں جاگری۔ ونڈ اسکرین کا شیشہ ٹوٹ کر مجھ پر آگرا۔ میں وقتی طور پر بے ہوش ہوگیا میں آتے ہی مجھے شدت کے ساتھ تکلیف کا احساس ہوا۔ چہرہ خون سے تر تھا آنکھیں پھٹ چکی تھیں مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جیسے جیسے

اخراج میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ ویسے ویسے میری یادداشت بھی کم ہوتی چلی جارہی تھی۔ نہ جانے کب اور کیسے میں خود کو گھسیٹتا ہوا یہاں فارم ہاؤس تک چلا آیا۔ پھر بے ہوش ہو کر زمین پر گرگیا۔'' احمد خاموش ہوگیا، حبیبہ محویت کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ طویل سانس لے کر بولی۔

''جبران کی گاڑی کے بریک تم نے ڈھیلے کئے تھے۔'' اور اس نے اثبات میں سرہلادیا۔

''کیوں......؟'' حبیبہ نے پوچھا۔ ''کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اور کیا وہ تمہاری محبت میں دیوار بن رہا تھا۔ یا پھر صرف پولیس والوں سے پوشیدہ رہنے کے لئے تم نے اسے ختم کردیا۔ تاکہ وہ تمہاری یہاں موجودگی کا پردہ فاش نہ کرسکے۔''

''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' احمد نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔

''تم میری محسن ہو۔ میری زندگی تمہاری مرہون منت ہے۔ میں زندگی بھر تمہارا غلام بن کر رہنا چاہتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ وہ میرے اور تمہارے درمیان دیوار بن رہا تھا۔ اس لئے میں نے دیوار کو گرادیا۔ لیکن مجھے پولیس سے کبھی بھی خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ ثبوت کی عدم موجودگی کی بدولت مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی اس وقت تمام حالات تمہیں تفصیلاً اور سچائی کے ساتھ بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں مجرمانہ زندگی کو ترک کرنے کے بعد شریفانہ زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے تمہارے حتمی فیصلے کا منتظر ہوں۔''

حبیبہ نے اثبات میں سرہلایا۔ اور گھمبیر لہجے میں بولی۔

''حتمی فیصلہ ابو کریں گے۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔''

''جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی......'' غنی صاحب کو دونوں کی مرضی کے آگے سرجھکانا ہی پڑا۔ لیکن غنی صاحب سے احمد کی مجرمانہ زندگی کو مکمل طور پر پوشیدہ رکھا گیا۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ...... مختصر سی تقریب کے دوران دونوں رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔

حبیبہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ ہنستے بولتے احمد کے اردگرد تتلی کی مانند اڑتی پھر رہی تھی۔ لیکن یہ خوشی بھی عارضی وقتی ثابت ہوئی۔ احمد کی یادداشت مکمل طور پر واپس نہیں آئی تھی۔ یہ بات حبیبہ کو اس صبح معلوم ہوئی۔ جس صبح اٹھتے ہی احمد نے کسی انجانے نام سے حبیبہ کو مخاطب کرنا شروع کیا۔ وہ لگاتار کہے جارہا تھا۔

''بینا کہاں ہے؟ مجھے اس کا اپینڈکس کا آپریشن کروانا ہے۔ ڈاکٹر نے تاریخ دے دی ہے۔ وہ کہاں ہے؟ اسے کہو...... کہ وہ تیاری کرے۔ علی کی فکر نہ کرے۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔'' حبیبہ نے حیرت بھری نگاہوں سے احمد کی جانب دیکھا۔ پھر پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

''بینا اور علی کون ہیں؟ کیا تمہاری پچھلی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا پھر موجودہ زندگی کا کوئی کردار ہیں؟''

احمد نے حیرت بھری نگاہوں سے حبیبہ کی جانب دیکھتے ہوئے بتایا۔

''بینا میری بیوی کا نام ہے۔ اور علی ہمارا اکلوتا بیٹا۔ جس کی عمر پانچ سال ہے۔''

حبیبہ کو اپنے سر پر پہاڑ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ جسے کم سن لڑکا سمجھ رہی تھی۔ وہ پکا مرد نکلا تھا ایک بچے کا باپ جس کی یادداشت کا یہی عالم تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ اسے بہت سی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ اگر یادداشت کے مکمل ہونے کے بعد وہ حبیبہ اور غنی صاحب کو بھلادیتا۔ تو کچھ مضائقہ نہیں ہوتا۔ اسے اپنا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا تھا۔ ماتھے پر سوچوں کی لکیریں پھیلنے لگیں۔ اپنے رشتے کے بچانے کے لئے وہ انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرنے لگی۔ پھر حتمی لہجے میں بولی۔

''احمد میری جانب دیکھو۔ میں تمہاری بیوی ہوں۔ تم اپنی پچھلی زندگی کا سودا کرچکے ہو۔ اب اسے یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پھر بھی اگر تم نے یاد کرنے

کی کوشش کی۔ تب میں پولیس کو تمہارے متعلق سب کچھ بتادوں گی۔ کہ تم ناجانے کتنی معصوم اور بے گناہ لڑکیوں کے قاتل ہو۔ ایک دفعہ پولیس کے ہتھے چڑھ گئے۔ تب تمہیں پھانسی پر چڑھنے سے کوئی نہیں روک پائے گا۔ بہتری اسی میں ہے کہ پچھلی زندگی کو بھلا کر موجودہ زندگی میں دلچسپی لینے کی کوشش کرو، بصورت دیگر حالات کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔"

احمد کے چہرے پر خوف کے تاثرات جنم لینے لگے۔ اور وہ پریشان لہجے میں بولا۔

"لیکن ان دونوں کا میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

حبیبہ نے بات درمیان میں کاٹ دی۔ اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

"میرا بھی تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ میں بھلا تمہارے بغیر کیسے زندہ رہوں گی؟ تم دو کشتیوں کے سوار رہ کر سمندر میں سفر نہیں کر پاؤ گے۔ تمہیں ایک کشتی کا انتخاب کرنا ہوگا۔ لیکن انتخاب کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا۔ ایک جانب زندگی ہے۔ اور دوسری جانب موت ہے۔ تمہاری بیوی اور بچہ تمہیں موت سے بچا نہیں پائیں گے۔ فیصلے کا اختیار تم پر چھوڑتی ہوں۔ مجھے کل صبح حتمی جواب چاہیے۔ اگر نہیں دو گے تب پرسوں پولیس کو تمہارے متعلق بتادوں گی۔ اگر تم میرے نہیں ہوسکتے۔ تب اپنی پہلی بیوی کے بھی نہیں ہو پاؤ گے۔" حبیبہ نے پاؤں پٹختے اور غصیلی نگاہوں کے ساتھ احمد کی جانب دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

احمد پریشان نگاہوں سے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ نادانستگی میں اسے اپنی بہت سی کمزوریوں کے متعلق بتا چکا تھا۔ یقیناً اس وقت وہ حبیبہ کے جال میں مکمل طور پر پھنس چکا تھا۔ لیکن اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ دینا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ تمام دن انہی سوچوں کے دوران گزر گیا۔ لیکن وہ کسی بھی فیصلے پر نہیں پہنچ پایا۔ رات بھی بے چینی کے عالم میں گزری۔

صبح مطلع ابر آلود تھا۔ اس نے رات کو پیک کیا ہوا سامان گاڑی میں رکھا۔ اور شہر جانے کے لئے الوداعی نگاہوں سے غنی فارم ہاؤس کی جانب دیکھا۔ وہاں اداسی کا راج تھا۔ حبیبہ کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور وہ یہ جاننے کے باوجود منتظر تھا۔ کہ وہ اب اس کی جانب کبھی بھی نہیں دیکھے گی۔ لیکن پھر بھی شاید اس کے دل میں رحم آجائے۔ اور وہ تڑپ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہو۔ اسے شہر جانے سے روک لے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ کھڑکی خالی رہی۔ بوندا باندی کا آغاز ہوگیا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور اندر بیٹھنے کے بعد شیشے اوپر چڑھا لیے۔

فارم ہاؤس میں اب کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ سب کچھ ان دونوں بیگوں کے اندر موجود تھا۔ جو اس کے ہمراہ گاڑی کی اگلی سیٹ پر پڑے تھے۔ اس نے پہلے بیگ کی زپ کھول دی۔ وہاں کھال کا ڈھیر پڑا تھا۔ نسواری اور سفید کھال...... یہ نایاب تھی۔ احمد نے زپ کو دوبارہ بند کردیا۔ دوسرے بیگ میں تانبے کے رنگ پر مشتمل کھال بھری ہوئی تھی۔ دور کہیں پہاڑوں پر بجلی گری۔ اور احمد نے طویل سانس لیتے ہوئے بیگ کی زپ کو جھٹکے کے ساتھ بند کردیا۔ پھر افسردگی کے عالم میں بڑبڑایا۔

"تم میرے راستے کی دیوار بن چکی تھیں۔ لیکن دیوار بننے سے پہلے یہ بھول گئی تھیں کہ ایسی کئی دیواروں کو پھلانگ کر میں یہاں تک آیا تھا۔ اس دیوار کو پھلانگنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ اور یہ بھی تمہاری بھول تھی کہ میں یہاں رک جاؤں گا۔ رک جانا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ شہر میں کچھ اور لوگ میرے منتظر ہیں۔ جن کے لئے میں ہر دیوار کو پھلانگ سکتا ہوں۔" اس نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ اور پہلے گیئر میں ڈالنے کے بعد فارم ہاؤس کی عمارت سے باہر کی جانب چل دیا۔ بارش طوفانی انداز میں برسنے لگی۔

بدنیت

شہاب شیخ

مردہ جسم میں انجکشن لگاتے ہی مردہ نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر وہ ہوا میں اڑتا ہوا آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا لیکن پھر اچانک پلٹا اور اس نے تباہی مچادی۔

وہ چاند ستاروں کو بھی اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا تھا، ایک عجیب و عبرتناک کہانی

موسم سرد تھا۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے تک بارش ہوتی رہی تھی۔ اب بھی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پروفیسر مارٹن اور عامل رام داس دو منزلہ عمارت کے اوپر والے حصے میں بنے ہوئے گلاس روم میں بیٹھے گرما گرم کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ عمارت نیویارک کے مضافاتی علاقے میں واقع تھی۔ پروفیسر مارٹن ملک بھر کے لئے ایک قابل احترام نام تھا۔ اس کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے بڑی خدمات تھیں جس کی وجہ سے اسے حکومت نے ہر طرح کی سہولیات فراہم کردی تھیں اور یہ عمارت بھی اس کی فرمائش پر بنوا کر دی تھی جسے وہ اپنی لیبارٹری کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس کے من پسند لوگ بھی اس کے ساتھ ہی رہتے تھے جو عملیات یا سائنس ٹیکنالوجی کے شعبوں سے وابستہ تھے۔ ان ہی

میں عامل رام داس بھی شامل تھا۔ اس کا تعلق انڈیا سے تھا۔ اس کا شمار بڑے اور خطرناک ترین عاملوں میں ہوتا تھا۔ جادو کے ساتھ ساتھ وہ ہپناٹزم اور مسمریزم پر بھی دسترس رکھتا تھا۔ پروفیسر مارٹن اور اس کی عمریں ساٹھ سال کے قریب تھیں لیکن دونوں کی صحت قابل رشک تھی، وہ جوانوں کی طرح طاقتور اور چاق و چوبند تھے۔

آج کل وہ دونوں ایک ایسے انسان کی تیاری میں مصروف تھے جو روحانیت اور سائنس و ٹیکنالوجی کا شاہکار ہو۔ وہ اسے مریخ پر بھیجنا چاہتے تھے۔ وہ اسے بغیر کسی راکٹ وغیرہ کے بھیجنے کے خواہش مند تھے۔

"ہم کافی تیزی سے کامیابی حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ ٹائیگر جلد ہی تیار ہو جائے گا۔" پروفیسر مارٹن نے رام داس سے کہا۔

"ہاں...... لگتا تو ایسا ہی ہے۔" رام داس بولا۔ لیکن اس کے لہجے میں اعتماد کی کمی واضح تھی۔ جسے پروفیسر مارٹن نے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے، تم کچھ زیادہ پر امید نظر نہیں آ رہے؟"

رام داس نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم اس پر جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے کام کر رہے ہو بلاشبہ وہ اطمینان بخش ہے لیکن میں اپنے شعبے سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"کیا مطلب؟" پروفیسر مارٹن کی سوالیہ نظریں اس پر مرکوز تھیں۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں نے کل رات بھی جو عمل کیا اس سے میری مطلوبہ روح میرے قابو میں نہ آ سکی۔ میں اس کے بجائے ابھی ایک اور روح سے کام چلا رہا ہوں لیکن یہ اتنی طاقتور نہیں ہے۔" رام داس نے جواب دیا۔

"تو کیا یہ روح مطلوبہ نتائج سامنے نہیں لائے گی؟" پروفیسر مارٹن نے سوال کیا۔

"نتائج آ تو جائیں گے لیکن مجھے اسے بہت سنبھالنا پڑے گا اور کہیں بھی کسی غلطی کا امکان ہے۔" رام داس سوچتے ہوئے بولا۔

"لیکن رام داس، میں چاہتا ہوں کہ کام بالکل سو فیصد ہو، تم کسی طرح اپنی مطلوبہ روح کو قابو کرو۔" پروفیسر نے اس کی بات سے کچھ بے چین ہو کر کہا۔

"میں کوشش تو کر رہا ہوں لیکن بڑا مشکل ہو رہا ہے اسے قابو کرنا۔" رام داس بولا۔

"تو پھر کہیں ہم ناکام ہی نہ ہو جائیں۔" اب پروفیسر مارٹن کے لہجے میں بھی کچھ ناامیدی تھی۔

"فکر نہ کرو، میں اس روح کو قابو کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گا اور اگر ناکام رہا تو اس روح سے بھرپور کام لوں گا۔" رام داس نے امید دلائی۔

"تمہاری باتوں سے میں کچھ بے چین ہو گیا ہوں۔" پروفیسر مارٹن سر کھجاتے ہوئے بولا۔

رام داس اپنی لمبی داڑھی کے بالوں میں انگلیاں ڈالتے ہوئے بولا۔ "تم فکر نہ کرو میں آج رات پھر اسے قابو کرنے کے لئے عمل کروں گا۔"

"بس کسی بھی طرح قابو کرو رام داس۔ ہمیں ہر طرح سے مضبوط ہو کر کام کرنا ہے۔" پروفیسر مارٹن زور دے کر بولا۔

"ٹھیک ہے۔" رام داس پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھتا ہوں اس بات کی فکر نہ کرو ہم مضبوط ہو کر کام کریں گے۔"

ان دونوں نے کافی کے مگ اٹھا لئے اور چسکیاں لیتے ہوئے سوچوں میں گم ہو گئے۔

☆......☆......☆

ٹائیگر کا جسم ٹیبل پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ جب زندہ تھا تو مضبوط و توانا جسم کا آدمی تھا۔ اس کا نام میکس تھا اس نے کئی قتل کئے تھے اور اسے پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ پروفیسر مارٹن نے حکومت سے اپیل کی تھی کہ میکس کی لاش اسے دے دی جائے تا کہ وہ ملکی و قومی مفاد میں اس پر تجربات کرے۔ میکس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا اس لئے اس کی لاش پر کوئی دعویٰ بھی نہیں ہوا اور یوں لاش پروفیسر مارٹن کے حوالے کر دی گئی تھی جس پر وہ گزشتہ ایک ماہ سے تجربات کر رہا تھا۔ اس کے کئی معاونین تھے لیکن سب سے بڑا معاون رام داس تھا۔ پروفیسر مارٹن لاش پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے کام کر رہا تھا اور رام داس کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ لاش کو روحانی طور پر طاقتور بنا دے۔

"میں نے ٹائیگر کے گوشت میں ایسے کیمیکل شامل کر دیئے ہیں کہ اس پر نہ تو کوئی زمینی موسم اثر کرے گا اور نہ ہی خلائی۔" پروفیسر مارٹن نے رام داس سے کہا۔ وہ دونوں اس وقت ٹائیگر کی ٹیبل کے ساتھ ہی کھڑے تھے۔

"تم نے یہ بڑا کمال کیا ہے۔" رام داس بولا۔ "اب تک روس اور امریکہ وغیرہ کے جتنے بھی خلا باز خلاء میں گئے ہیں انہیں تو خلا بازی کا لباس پہن کر جانا پڑا لیکن ٹائیگر کو کسی ایسے لباس کی ضرورت نہیں ہو گی۔"

"ہاں...... اسے نہ تو بھوک پیاس لگے گی اور نہ ہی اس کے جسم میں خون گردش کرے گا۔ لوگوں کو دکھانے کے لئے میں نے اس میں ایک ایسا سسٹم لگایا ہے کہ یہ سانس لیتا ہوا دکھائی دے گا جبکہ درحقیقت اسے سانس لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" پروفیسر مارٹن بولا۔

"تم اپنے کام میں پکے جا رہے ہو پروفیسر۔" رام داس نے تعریفی انداز میں کہا۔ "فکر نہ کرو، میں بھی آج رات کسی نہ کسی طرح اس روح کو قابو کر کے اپنا کام بھی پکا کر دوں گا۔"

"ضرور ضرور۔" پروفیسر بے چینی سے بولا۔ "تم اگر یہ کام کر لو تو ہم ضرور سو فیصد کامیاب ہو جائیں گے۔"

"فکر نہ کرو، میں اپنی پوری پوری کوشش کروں گا کہ وہ روح میرے قابو میں آ جائے۔" رام داس نے تسلی دی۔

"اب میں ٹائیگر کو ایک اور انجکشن دوں گا جس کے بعد میں اسے خاص ریموٹ سے کنٹرول کروں گا اور تم دیکھنا کہ یہ ہوا میں اڑے گا۔" پروفیسر مارٹن نے کہا۔

"اوہ۔ زبردست۔" رام داس جوش سے بولا۔ "کیا تم اسے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ہی خلاء میں بھیجو گے؟"

"ہاں......" پروفیسر مارٹن نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور ہم یہاں کمپیوٹر پر اسے دیکھ بھی سکیں گے۔"

"بہت خوب۔" رام داس بولا۔

پروفیسر مارٹن نے ایک جانب موجود ٹیبل پر سے سرنج اٹھائی اور پھر اس میں سرخ رنگ کی دوا بھرنے کے بعد وہ انجکشن ٹائیگر کو لگا دیا۔ پھر اس نے اسی ٹیبل پر سے ایک ریموٹ اٹھایا اور اس کے کچھ بٹن دبائے۔ ذرا ہی دیر بعد ٹائیگر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ عام انسانوں کی طرح حرکت کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔

پروفیسر مارٹن نے ریموٹ کے کچھ اور بٹن دبائے تو ٹائیگر ہوا میں کسی پرندے کی طرح اڑنے لگا۔ پروفیسر مارٹن اسے ریموٹ کے ذریعے ہی کنٹرول کر رہا تھا۔ ٹائیگر لیبارٹری میں ایک چکر لگانے کے بعد داخلی دروازے پر آ گیا۔ پروفیسر مارٹن یہاں پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور کچھ بٹن دبائے جس سے ٹائیگر دروازے سے باہر چلا گیا۔

پروفیسر مارٹن اور رام داس بھی تجربہ گاہ سے باہر آ گئے اور پھر وہ چھت کے وسط میں آ گئے۔ "اب دیکھو! میں اسے کہاں بھیجتا ہوں۔" پروفیسر مارٹن نے رام داس سے کہا اور ریموٹ کے کچھ بٹن دبائے۔ ٹائیگر جو کہ اب تک ہوا میں معلق تھا، سیدھا آسمان کی طرف جانے لگا اور پھر وہ ایک نقطہ بن کر غائب ہو گیا۔

"کہاں گیا وہ؟" رام داس نے پروفیسر مارٹن سے پوچھا۔ پروفیسر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بولا۔

"مجھے تو وہ نظر آ رہا ہے۔"

"وہ کیسے؟" رام داس نے الجھن سے پوچھا۔

"میں نے خاص قسم کے لینس آنکھوں میں لگا رکھے ہیں۔ ان سے میں خلاء میں دیکھ سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا۔" رام داس حیران ہوا۔ "کیا میں بھی دیکھ سکتا ہوں؟"

''ہاں ضرور۔'' پروفیسر مارٹن نے جیب سے ایک ڈبیہ نکال کر کھولی۔ اس میں سے دو لینس نکال کر رام داس کی آنکھوں میں لگا دیئے۔ رام داس نے آسمان کی طرف دیکھا اور جوش سے بولا۔

''واقعی! مجھے تو خلاء میں سب کچھ نظر آ رہا ہے اور ٹائیگر بھی نظر آ رہا ہے، وہ سیدھا اوپر کی طرف جا رہا ہے۔''

''اب میں اسے واپس لاتا ہوں۔'' پروفیسر مارٹن نے کہا اور ریموٹ کے کچھ بٹن دبائے جس سے ٹائیگر کا رخ بدلا اور پھر وہ زمین کی طرف واپس آنے لگا۔

''اس کی رفتار کسی بھی راکٹ سے چار گنا تیز ہے۔'' پروفیسر نے رام داس کو بتایا۔

''مریخ پر یہ کتنے عرصے میں پہنچے گا۔'' رام داس نے پوچھا۔

''اس رفتار سے اسے سات آٹھ ماہ لگیں گے لیکن میں اس کی رفتار پر بھی کام کر رہا ہوں اور اس کے جانے کے وقت کو میں کم سے کم کرنے کی کوشش کروں گا۔'' پروفیسر مارٹن نے جواب دیا۔

''کتنا کم کر لو گے؟'' رام داس نے تجسس سے پوچھا۔

''میں اس دورانیے کو صرف چوبیس گھنٹوں پر لانا چاہتا ہوں۔'' پروفیسر مارٹن نے جواب دیا۔

''اوہ...... زبردست!'' رام داس جوش سے بولا۔

کچھ دیر بعد ٹائیگر واپس ان کے پاس پہنچ گیا۔ پروفیسر مارٹن نے ریموٹ کے ذریعے اسے واپس لیبارٹری میں لا کر ٹیبل پر لٹا دیا۔

''واہ...... میں تمہاری کارکردگی سے بے حد متاثر ہوا ہوں پروفیسر۔'' رام داس نے تعریفی انداز میں کہا۔

''تھینک یو۔'' پروفیسر مارٹن مسکرا دیا اور ٹائیگر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

دس دن گزر گئے۔ پروفیسر مارٹن نے ٹائیگر کو پوری طرح تیار کر دیا تھا۔ رام داس نے بھی اپنی مطلوبہ روح کو قابو کر کے ٹائیگر کے جسم میں داخل کر دی تھی۔

اس وقت وہ دونوں گلاس روم میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ وہ شام کے وقت یہیں بیٹھتے ہیں۔ ''اب ٹائیگر خلاء میں بھیجے جانے کے لئے بالکل تیار ہے۔'' پروفیسر مارٹن نے رام داس سے کہا۔

''ٹھیک!'' رام داس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی پروفیسر!''

''وہ کیا؟'' پروفیسر مارٹن نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''دوسرے ملکوں کی سیٹلائٹس خلاء میں لگی ہیں، وہ لوگ بھی ٹائیگر کو دیکھ سکتے ہیں۔ کیا یہ بات کسی طرح ہمارے لئے خطرناک نہیں ہوگی؟'' رام داس نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''یہ تم نے اچھا سوال کیا۔'' پروفیسر مارٹن ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''پہلے تو میں نے اسے تجرباتی طور پر خلاء میں دو تین مرتبہ بھیجا اس وقت واقعی اسے دیکھا گیا لیکن اس وقت تک میں ایک تجربے میں مصروف تھا اور مجھے کنفرم نہیں تھا کہ تجربہ ناکام ہوگا یا کامیاب، بہرحال وہ تجربہ کامیاب ہو گیا اور اس کی وجہ سے اب میں ٹائیگر کو ایک اور ایسا انجکشن دوں گا جس سے وہ غائب ہو جائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اسے کیسے دیکھیں گے تو اس کے لئے بھی میں نے اس کے جسم میں خاص شعاعیں داخل کی ہیں جن کی فریکوئنسی صرف میں سیٹ کر سکتا ہوں اس طرح صرف ہم ٹائیگر کو دیکھ سکیں گے۔''

''واقعی تمہارے دماغ کی داد دینی پڑتی ہے۔'' رام داس نے جوش سے کہا اور پروفیسر مارٹن مسکرا دیا۔ رام داس نے پوچھا۔ ''اب کب ٹائیگر کو روانہ کرنا چاہتے ہو؟''

''کل ہی کریں گے۔'' پروفیسر مارٹن نے جواب دیا۔

''ٹھیک۔'' رام داس بولا۔

''صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ پروفیسر مارٹن رام داس اور ان کے دیگر ساتھی عمارت کے وسیع لان میں موجود تھے۔

''دوستو! آج ہمارے لئے بے حد خوشی کا دن ہے

کہ ہم اپنے خواب کو عملی جامہ پہنانے جا رہے ہیں۔ ہمارا تیار کردہ ٹائیگر خلاء میں جا رہا ہے۔ بلاشبہ اب ہمارا ملک دنیا کا طاقتور ترین ملک بن جائے گا لیکن میں نے جو یہ انسان تیار کیا ہے اس کے پیچھے میری یہ سوچ کارفرما ہی ہے کہ ہم ساری انسانیت کی بھلائی کے لئے کام کریں۔ اگر ہم مریخ اور دوسرے سیاروں تک رسائی حاصل کرتے ہیں تو ہم وہاں انسانوں کے فائدے کے مواقع تلاش کریں گے۔ اب ہم سب اپنی اس تخلیق ٹائیگر کو روانہ کرتے ہیں اور اپنی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہیں۔'' پروفیسر مارٹن نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''ہم کامیابی کے لئے دعا گو ہیں۔'' سب لوگوں نے ایسا ہی اظہار خیال کیا۔

کچھ دیر بعد پروفیسر مارٹن نے ٹائیگر کو روانہ کر دیا۔ پروفیسر نے اپنی آنکھوں پر مخصوص لینس لگا رکھے تھے جن سے وہ ٹائیگر کو براہ راست دیکھ رہا تھا۔ باقی لوگوں کی آنکھوں سے وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگ اسے کمپیوٹر اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔

دس منٹ گزر گئے۔ وہ سب دیکھ رہے تھے کہ ٹائیگر خلاء کی وسعتوں میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن پھر اچانک وہ پلٹا اور تیزی سے واپس زمین کی طرف آنے لگا۔

''یہ واپس کیوں آ رہا ہے؟'' رام داس نے کمپیوٹر اسکرین پر نظریں رکھتے ہوئے ساتھ کھڑے پروفیسر مارٹن سے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خود ٹائیگر کی اس طرح واپسی پر بے حد پریشان تھا اور جلدی جلدی ریموٹ کے بٹن دبا کر اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر اسے اچانک خیال آیا کہ اس نے ٹائیگر کو ایک انجکشن غلطی سے دو مرتبہ لگا دیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ نہ صرف پریشان بلکہ کافی حد تک خوف زدہ بھی ہو گیا کہ نہ جانے اب ٹائیگر واپس آ کر کیا کرے گا؟ مارٹن کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا کہ آخر کس طرح ٹائیگر کو قابو میں کیا جائے۔ اس نے ٹائیگر کو جو انجکشن دو مرتبہ لگا دیا تھا اس میں بے شمار ایسے کیمیکلز تھے

جو ٹائیگر کو بے حد طاقتور، خودسر کرسکتے تھے۔
"پروفیسر!...... آخر یہ واپس کیوں آرہا ہے؟ رام داس نے تشویش کے ساتھ پروفیسر مارٹن سے کہا۔
"فکر نہ کرو، یہ میرے تجربے کا حصہ ہے۔" پروفیسر مارٹن نے جھوٹ بول کر اسے تسلی دی۔
"لیکن آخر یہ واپس آکر کیا کرے گا۔ یہ اوپر کی طرف کیوں نہیں جارہا ہے؟" رام داس کے لہجے کی الجھن اب بھی برقرار تھی۔
"ابھی جائے گا۔" پروفیسر مارٹن نے پھر جھوٹ بولا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ اب ٹائیگر کیا کرے گا۔ وہ ریموٹ کے ذریعے اسے تیزی سے کنٹرول کرنے کی کوشش کررہا تھا۔
کچھ دیر بعد ٹائیگر مزید قریب آگیا۔
"یہ تو قریب ہی آتا جارہا ہے۔" رام داس مزید پریشان ہوکر پروفیسر مارٹن سے بولا۔ مارٹن بھی پریشان تھا۔ اس وقت اسے یہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ سب لوگوں کو نیچے جاکر چھپ جانے کا کہے اور پھر وہ بلند آواز میں بولا۔
"سب لوگ نیچے تہہ خانے میں جاکر چھپ جائیں۔ ٹائیگر کی طرف سے خطرات ہیں۔ میں اکیلا اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"
اس کا حکم پاتے ہی سب لوگ دوڑے لیکن رام داس وہیں کھڑا رہا اور پروفیسر مارٹن سے بولا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔ میں اسے اپنی پراسرار قوتوں سے قابو کرنے کی کوشش کروں گا۔"
"اوکے!" پروفیسر مارٹن بولا۔ اس کی نظریں ٹائیگر پر تھیں اور ہاتھ ریموٹ کنٹرول پر مصروف تھے اور پھر اسے کچھ کامیابی ہوگئی۔ اس نے ٹائیگر کی رفتار کم کردی اور ذرا ہی دیر میں یہ رفتار انتہائی کم ہوگئی۔ پروفیسر مارٹن کو کچھ سکون ہوا لیکن بہرحال خطرہ ابھی پوری طرح ٹلا نہیں تھا۔ ٹائیگر ان کی طرف آرہا تھا۔
رام داس ذہین آدمی تھا۔ وہ پروفیسر مارٹن کے تاثرات کا مسلسل جائزہ لیتا رہا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ مارٹن کافی پریشان ہے۔ "پروفیسر! لگتا ہے کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے؟" اس نے مارٹن سے کہا۔
"کیا مطلب؟" پروفیسر مارٹن چونکا۔
"ٹائیگر کے معاملے میں یقیناً کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ وہ تمہارے قابو سے باہر لگتا ہے۔" رام داس بولا۔
پروفیسر مارٹن نے سوچا کہ اب جھوٹ بولنا فضول ہے، رام داس ساری بات سمجھ چکا ہے لہٰذا وہ بولا۔ "تم نے درست اندازہ لگایا لیکن میں ہر حال میں اسے کنٹرول کرلوں گا۔"
"میرا خیال ہے کہ تم اسے کنٹرول کرنے کی کوشش تو کرسکتے ہو لیکن حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تم اسے قابو کرلو گے۔" رام داس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
"ہاں...... تم نے درست کہا لیکن بہرحال اسے قابو کرنا ہے۔" پروفیسر نے ہتھیار ڈال دیئے۔
"مسئلہ کیا ہے آخر؟" رام داس نے سوال کیا۔
پروفیسر مارٹن نے اسے ساری حقیقت بتادی۔
"اوہ...... یہ تو معاملہ خاصا گڑبڑ ہے۔" رام داس نے کہا۔
"ہاں...... اب اس کا کچھ کرنا ہے۔" پروفیسر مارٹن بولا۔
"ٹھیک ہے، تم اپنی کوشش کرو، میں اپنی کوشش کرتا ہوں۔" رام داس نے کہا۔
"اوکے" پروفیسر مارٹن بولا۔
کچھ دیر بعد ٹائیگر ان کے کافی قریب آگیا۔ پروفیسر نے رام داس سے کہا۔ "اب یہ کافی حد تک میرے کنٹرول میں آگیا ہے۔"
"اچھی بات ہے۔" رام داس بولا۔
"لیکن بہرحال یہ اپنی من مانی کرسکتا ہے۔" پروفیسر مارٹن نے اسے خطرے سے آگاہ کردیا۔
"ٹھیک ہے، میں بھی کوشش کررہا ہوں اسے قابو کرنے کی، تم بھی کرتے رہو، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" رام داس نے کہا۔
"اوکے اوکے۔" پروفیسر مارٹن نے اثبات

میں سر ہلایا۔ پھر ٹائیگر کو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے چھت کے ایک کونے میں اتار لیا اور اسے جام کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور ٹائیگر آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھنے لگا۔
"کیا تم اسے قابو نہیں کرپار ہے ہو؟" رام داس نے پروفیسر مارٹن سے پوچھا۔
"میں اسے پوری طرح قابو کرنے میں ناکام ہوں۔" پروفیسر مارٹن نے جواب دیا۔
"میری پراسرار طاقتیں بھی اسے روکنے میں ناکام ہیں، ہم نے اسے طاقتور ہی اتنا بنادیا تھا کہ اب یہ ہمارے قابو میں نہیں آرہا ہے۔" رام داس نے کہا۔
"کوشش کرتے رہو۔" پروفیسر مارٹن بولا۔
"ہاں وہ تو کررہا ہوں۔" رام داس نے کہا۔
ٹائیگر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا مسلسل ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بھی ان کی طرف پھیلا دیئے تھے جیسے انہیں دبوچنا چاہتا ہو۔ جب وہ ان کے قریب آگیا تو پروفیسر مارٹن نے قدرے پریشان لہجے میں رام داس سے کہا۔ "اب ہمیں خود کو محفوظ رکھنے کے لئے اس سے دور ہونا پڑے گا۔ پیچھے ہٹتے جاؤ۔"
"ٹھیک ہے۔" رام داس بولا۔
ٹائیگر ان کی طرف بڑھتا رہا اور وہ پیچھے ہٹتے رہے حتیٰ کہ وہ سیڑھیاں اترتے گئے۔
وہ گراؤنڈ پر آگئے اور برآمدے میں الٹے قدموں چلنے لگے۔ ٹائیگر ان کی طرف آرہا تھا۔
"کیا یہ کنٹرول میں نہیں آرہا ہے۔" رام داس نے پروفیسر مارٹن سے پوچھا۔
"نہیں کوشش کررہا ہوں، تم بھی ناکام ہو اب تک؟" پروفیسر مارٹن بولا۔
"ہاں......" اگر یہ قابو میں نہ آیا تو کیا کچھ کرسکتا ہے پروفیسر؟" رام داس نے پوچھا۔
"بہت کچھ کرسکتا ہے۔" پروفیسر مارٹن نے جواب دیا۔
"کیا ہماری زندگیاں بھی خطرے میں ہیں۔" رام داس نے مزید پوچھا۔
"ہاں......"
"یہ تو تشویش ناک بات ہے۔"
"ہاں ہے تو سہی۔"
"تو کیا ہم بھاگ چلیں؟"
"اس سے بھاگنا ممکن نہیں۔"
"تو پھر اسے تباہ کردو کسی طرح۔"
"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"
"سوچو نہیں کر ڈالو۔"
"لیبارٹری میں الٹے ہاتھ کی طرف کالے شیلف میں ایک چھوٹی گن رکھی ہے، وہ لے آؤ۔" پروفیسر مارٹن نے اس سے کہا۔ اس گن سے ایسی شعاعیں خارج کی جاسکتی تھیں جس سے دنیا کی ہر چیز کو پگھلایا جاسکتا تھا۔
رام داس، پروفیسر مارٹن کی ہدایت پاتے ہی تیزی سے پلٹ کر بھاگا۔
ذرا دیر بعد اس نے گن لاکر پروفیسر مارٹن کو دے دی۔ مارٹن نے اس کی نالی کا رخ ٹائیگر کی طرف کیا اور ٹریگر دبادیا۔ نالی میں سے رنگ برنگی شعاعیں نکلیں جو ٹائیگر سے جاکر ٹکرائیں لیکن یہ امر پروفیسر مارٹن کے لئے پریشانی کا سبب بن گیا کہ ان شعاعوں کا ٹائیگر پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔
"ان شعاعوں سے کیا ہوگا پروفیسر؟" رام داس نے پوچھا۔
"میں پریشان ہوں۔" پروفیسر مارٹن بولا۔
"کیوں؟"
"گن ناکام ہوگئی ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"اس گن سے نکلنے والی شعاعیں دنیا کی ہر چیز کو پگھلا سکتی ہیں لیکن یہ ٹائیگر پر اثر نہیں کررہیں۔"
"اوہ......" رام داس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ "آخر ایسا کیوں ہوا ہے؟"
"ٹائیگر جو بے حد طاقتور ہوگیا ہے۔" پروفیسر

مارٹن نے بتایا۔

""پھر اب کیا کرو گے؟" رام داس نے فوراً پوچھا۔

"اپنی سی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ قابو آ جائے۔ پروفیسر مارٹن نے ریموٹ کنٹرول کے بٹن دباتے ہوئے جواب دیا۔

رام داس ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

کچھ دیر مزید گزر گئی لیکن صورت حال نہ بدلی۔ رام داس اور پروفیسر مارٹن الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار کے قریب پہنچ گئے۔

"اس طرف آ جاؤ، پروفیسر مارٹن نے لان کی طرف اشارہ کر کے رام داس سے کہا اور وہ دونوں تیزی کے ساتھ لان میں آ گئے۔ ٹائیگر ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ دونوں کافی دیر تک ادھر ادھر ہوتے رہے لیکن ٹائیگر ان کی طرف بڑھتا رہا۔ وہ اسے قابو کرنے یا مار دینے میں بھی ناکام رہے تھے۔

اچانک ٹائیگر بجلی کی سی تیزی سے کے ساتھ اچھلا اور اس نے رام داس کو اٹھا کر ایک طرف اچھال دیا۔ رام داس فضاء میں اڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا اور وہیں گر گیا۔

وہ کراہتا ہوا اٹھا اور پروفیسر مارٹن کی طرف دیکھ کر بولا۔ "پروفیسر! اب اسے کسی طرح کنٹرول کرو ورنہ یہ ہم سب کو مار ڈالے گا۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں۔" پروفیسر مارٹن نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔

"ٹائیگر اب پروفیسر مارٹن کی طرف بڑھنے لگا۔ مارٹن کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ ٹائیگر کسی بھی لمحہ اس پر حملہ کر سکتا ہے۔ وہ ریموٹ کنٹرول کے مختلف بٹن جلدی جلدی دبا کر اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رام داس اٹھ کر اب لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کا رخ پروفیسر مارٹن کی طرف تھا لیکن اب وہ مارٹن سے کچھ دور رہنا چاہتا تھا کیونکہ اس وقت ٹائیگر کی توجہ مارٹن کی طرف تھی اور اگر رام داس اس کے قریب جاتا تو ٹائیگر ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔

اچانک ٹائیگر نے جست لگائی اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اڑتا ہوا پروفیسر مارٹن پر جا گرا۔ مارٹن اس صورت حال کے لئے تیار تھا اس کے باوجود وہ ٹائیگر کے تیز ترین حملے سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ اب وہ نیچے گھاس میں گرا ہوا تھا اور ٹائیگر اس کے سینے پر سوار تھا۔ ریموٹ کنٹرول پروفیسر مارٹن کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ رام داس تیزی سے اس طرف لپکا۔ اس نے ریموٹ کنٹرول اٹھا لیا اور پروفیسر مارٹن کی طرف دیکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ریموٹ کنٹرول پروفیسر مارٹن کو دے دے۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ ٹائیگر نے مارٹن کی گردن دبوچ لی۔

'کیا میں کوئی بٹن دباؤں ریموٹ کنٹرول کا؟"

رام داس نے بلند آواز میں پروفیسر مارٹن سے پوچھا۔ مارٹن جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ ٹائیگر سے نبرد آزما تھا۔ رام داس اپنے جنتر منتر جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ٹائیگر روحانی اور ٹیکنالوجی کے طور پر بہت زیادہ طاقتور تھا۔ اس کی طاقتیں پروفیسر مارٹن نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنی تھیں۔ اب صورت حال بدل چکی تھی۔ ٹائیگر اپنی طاقتیں پروفیسر مارٹن اور رام داس پر استعمال کر رہا تھا۔

پروفیسر مارٹن کی جدوجہد جاری تھی اور پھر وہ کامیاب بھی ہو گیا۔ دھینگا مشتی میں اس نے خود کو ٹائیگر کی گرفت سے آزاد کروا لیا اور تیزی سے اٹھ کر بھاگا۔ ٹائیگر بجلی کی سی تیزی سے اڑا اور اسے دبوچ کر پھر گرا لیا۔

رام داس تیزی سے بھاگا۔ اس نے پروفیسر مارٹن کے سینے پر سوار ٹائیگر کو دھکا دیا۔ ٹائیگر ٹس سے مس نہ ہوا۔ رام داس نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے ایک بار پھر اسے دھکا دیا۔ صورت حال پہلے جیسی رہی۔ ٹائیگر پروفیسر مارٹن کا گلا دبا رہا تھا۔ مارٹن کی آنکھیں باہر آ رہی تھیں۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ رام داس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر شعاعوں والی گن پر پڑی۔ وہ گھاس میں ایک طرف پڑی تھی۔ جب ٹائیگر نے پہلی بار مارٹن پر چلائی تھی۔ تو یہ گن بھی ریموٹ کے ساتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ رام داس نے تیزی سے بھاگ کر وہ گن اٹھائی اور اسے پلٹ کر اس کی نالی کا رخ ٹائیگر کی طرف کیا۔ ٹائیگر کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ رام داس نے ٹریگر دبا دیا۔ اسے امید تو نہ تھی کہ کچھ نتیجہ برآمد ہوگا۔ وہ گھبراہٹ میں یہ سب کچھ کر رہا تھا۔

شعاعیں گن سے نکل کر ٹائیگر سے ٹکرائیں اور پھر اچانک ناقابل یقین صورت حال سامنے آ گئی۔ ٹائیگر ایک ربی کے ساتھ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور ادھر ادھر بکھر چکا تھا۔ اس کی گردن کے پچھلے حصے میں ایک جگہ چھوٹا سا جوڑ تھا۔ شعاعیں وہاں سے اس کے فولادی جسم کے اندر داخل ہوئیں اور اس کے اندرونی حصے میں موجود الیکٹرونک سسٹم میں آگ لگی جس سے سارا سسٹم درہم برہم ہوا اور یوں ٹائیگر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔

"تم خیریت سے ہو؟" رام داس نے جلدی سے پروفیسر مارٹن کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔ مارٹن جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی گردن کافی ادھڑ چکی تھی اور سینے کی دو پسلیاں بھی ٹوٹ چکی تھی۔

رام داس نے جلدی سے اٹھایا۔ وہ اسے لیبارٹری میں لے آیا اور مرہم پٹی کرنے کی کوشش کی۔

"رہنے دو۔" پروفیسر مارٹن نے بڑی مشکل سے کہا تو رام داس نے رک کر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ مارٹن نے مزید کہا۔ "اب میں نہیں بچ سکتا۔ ٹائیگر کے ہاتھوں کے کیمیکلز اور کچھ دیگر زہریلے ذرات میرے جسم میں جا چکے ہیں۔"

"لیکن ...... تم ...... تمہیں زندہ رہنا ہے۔" رام داس پریشان لہجے میں بولا۔

"نہیں ...... اب میرے زندہ رہنے کے امکانات نہیں ہیں۔" پروفیسر نے بمشکل کہا۔

"تم زندہ رہو گے۔" رام داس بے اختیار بولا۔

"نہیں ......"

"میں کچھ کرتا ہوں۔" رام داس نے فرسٹ ایڈ باکس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم صرف میری بات سن لو، میرے پاس وقت کم ہے۔ میں دل پر بوجھ لے کر نہیں مرنا چاہتا۔" پروفیسر نے کہا۔ رام داس رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے مزید کہا۔ "میرا انجام صحیح ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟" رام داس نے سوالیہ اور الجھی ہوئی نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں۔

"میری نیت خراب تھی۔" پروفیسر نے انکشاف کیا تو رام داس چونک کر بولا۔

"کیا مطلب؟"

"میں ٹائیگر کے ذریعے پوری دنیا، چاند، مریخ اور دیگر ستاروں پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔" پروفیسر مارٹن نے جواب دیا۔

"اوہ......" رام داس کے منہ سے نکلا۔ "یہ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ممکن ہے۔" پروفیسر مارٹن بولا۔ "میں نے شروع میں نیک نیتی سے کام کیا۔ مجھے دولت اور شہرت ملی تو مجھ میں غرور و تکبر آنے لگا۔ میرے خیالات منفی ہونے لگے۔ میں نے اپنے ایسے خیالات کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی۔ ایسے خیالات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پھر ٹائیگر کا مشن سامنے آیا۔ اس وقت میری نیت پوری طرح خراب ہو چکی تھی۔ بس یقیناً یہ اس غلط سوچ اور بد نیتی کا نتیجہ ہے کہ میں موت کے دہانے پر پہنچ چکا ہوں۔"

"لیکن......" رام داس مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ پروفیسر مارٹن نے خون کی الٹی کر دی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ رام داس ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا دل بھی یہی کہہ رہا تھا کہ "پروفیسر مارٹن کو اس کی بد نیتی کی سزا ملی ہے۔"

رام داس بوجھل قدموں سے چل پڑا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب واپس انڈیا چلا جائے گا اور زندگی کے باقی دن وہیں گزارے گا۔

سنہری تابوت

ایم اے راحت

قسط نمبر:6

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

شہنشاہ حبشہ زرقون بن زیان کے دربار میں جب مصر بھیجے جانے والے قاصد کی لاش پہنچی اور اسے معلوم ہوا کہ فرعون مصر نے نہ صرف اس کی بیٹی شیرانہ سے شادی سے انکار کردیا ہے بلکہ مزرک کو واپس نہ کرنے اور قاصد کو ہلاک کرنے کا جرم بھی کیا ہے تو اس کے سارے وجود میں آتش بھڑک اٹھی۔ اس نے کھڑے ہوکر اعلان کیا۔

”قسم ہے خاکستر کردینے والی آگ کی۔ اخناطوس باخت کو اس عمل کی اتنی بڑی سزا دوں گا کہ اس کی نسلیں یاد رکھیں گی۔“ اس کے مشیر خاص نے اس سے سوال کیا۔

”عالی نسب کے کیا ارادے ہیں؟“

”ہم تخت مصر کو کھنڈر بنادیں گے۔“ زرقون نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”فرعون کی فوجی قوت بہت زیادہ ہے۔“

”ہاں میں جانتا ہوں۔ لیکن جب بادشاہ قوت کے نشے سے مغلوب ہوکر عقل و دانش کھو بیٹھتے ہیں تو انہیں زیر کرنا مشکل نہیں ہوتا۔“

”میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“

”مشیر خاص تو بول کیا مشورہ ہے تیرا؟“

”طول و عرض حبش میں کئی وحشی قبائل بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ لوٹ مار کرکے زندگی گزارتے ہیں۔ دہشت خیزی قتل و غارت گری ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ انہیں لوٹ مار کی ترغیب دے کر اپنے ساتھ ملایا جاسکتا ہے۔“

شہنشاہ حبش نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ انتقام کی آگ میں جھلتے ہوئے اس نے وحشی قبائل کا لشکر جمع کیا اور مصر کی طرف کوچ کردیا۔

ظالم، بے رحم، خود پسند، مغرور فرعون مصر کو جب معلوم ہوا کہ حبش کی فوجیں مصر کی سرحدوں کے قریب پہنچ رہی ہیں تو اس نے اپنی افواج کو تیاری کا حکم دے دیا۔ وہ خود بھی اس جنگ میں براہ راست حصہ لینے کے لئے تیار ہوگیا اور آخری وقت میں زرہ بکتر سے لیس ہوکر سب سے پہلے مزرک سے رخصت ہونے پہنچ گیا۔

مزرک اسے دیکھ کر احترام سے کھڑی ہوگئی۔

”کیا کسی جنگ کی تیاری ہے؟“

”ہاں۔“ شاہ حبش نے مصر پر حملہ کردیا ہے۔

”اوہ۔“ مزرک نے آہستہ سے کہا۔

”اس کی وجہ تمہیں معلوم ہے ملکہ مصر......؟“

”ہاں...... جانتی ہوں......“ مزرک نے سوچ

زدہ لہجے میں کہا۔ اور فرعون چونک پڑا۔
"کیا جانتی ہو......؟"
"زرقون نے مجھے طلب کیا ہوگا۔"
"صحیح سوچا تم نے، ایسا ہی ہے۔"
"اگر مجھے اس کے حوالے کردیا جائے تو جنگ کے شعلے سرد پڑ سکتے ہیں۔" مزرک نے کہا تو فرعون تڑپ گیا۔
"یہ کیا کہا تم نے ملکہ مصر......"
"میں غلام زادی ہوں صرف ایک کنیز جو جنگ کے شعلے بجھانے میں کام آجائے تو اس کی خوش بختی ہوگی۔"
"تم اب غلام زادی نہیں بلکہ ملکہ مصر ہو۔ ہاں جنگ پر جانے سے پہلے میں اپنی ایک خواہش پوری کرنے کی آرزو رکھتا ہوں۔"
"خواہش......؟" مزرک نے کہا۔
"ہاں۔ جنگوں میں زندگی کی ہار جیت ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے میں زرقون کے ہاتھوں مارا جاؤں۔ بس ایک آرزو ہے دل میں جس کے بعد میں بخوشی موت کو گلے لگا سکتا ہوں۔"
"کیا......؟" مزرک نے بے اختیار پوچھا۔
فرعون نے اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "صرف اتنا کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ میں آتش بن جاؤں گا اور پھر کوئی مجھے شکست نہیں دے سکتا۔"
مزرک کا چہرہ بجھی ہوئی قندیل بن گیا۔ یہ الفاظ میکال کی نفی ہوتے۔ اسے موت کی قیمت پر بھی یہ گوارہ نہ تھا۔ اب تک فرعون نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ فرعون نے جبر وقہر کی علامت تھا۔ لیکن مزرک کے ساتھ اس کا سلوک بے حد پیار بھرا تھا۔ لیکن مزرک دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ یہ الفاظ میکال کے لئے تھے۔ صرف میکال کے لئے۔
فرعون نے اسے دیکھا اس کے حسرت زدہ چہرے اور اشک بار آنکھوں نے اس کا دل شیشے کی طرح فرعون کے سامنے رکھ دیا۔ اور شاید مصر کی تاریخ نے پہلی بار کسی نے فرعون کی آنکھوں میں آنسوؤں کا دیدار کیا۔ لیکن فرعون نے جلدی سے آنسو خشک کر لئے اور بولا۔
"دستور جنگ یہ ہے کہ بادشاہ جنگ پر جانے سے پہلے اپنی ملکہ سے اس کی خواہش پوچھتا ہے۔ تیرے دل میں کوئی خواہش ہے تو مجھے بتا......"
جواب میں مزرک آنسو بہاتی اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ فرعون نے کہا۔
"ملکہ مصر...... اپنی خواہش بتا۔"
مزرک نے اسے دیکھا۔ پھر بولی۔
"میرے دل میں کوئی خواہش نہیں ہے آقا۔"
"ایک بار پھر کہتا ہوں۔ جو کچھ تیرے دل میں ہے کہہ دے۔"
"کوئی خواہش نہیں ہے میرے دل میں۔"
"سچ کہتی ہے؟"
"ہاں......"
"میں چاہتا ہوں تو جھوٹ نہ بولے۔ تیرے دل کی خواہش تیری آنکھوں سے جھانک رہی ہے۔"
فرعون کے ان الفاظ پر اس نے گھبرا کر دیکھا۔ تو فرعون پھر بولا۔ "وہ خواہش جسے کہنے کی ہمت تیرے اندر نہیں ہے۔ مگر میں اسے پورا کرنے کی ہمت رکھتا ہوں۔"
یہ کہہ کر فرعون مصر نے کاغذ کے ایک پرزے پر لکھا۔ داروغہ قید خانہ۔ میکال کو فوراً باعزت رہا کروے فوری طور پر۔ یہ کہہ کر اس نے اس کاغذ پر اپنی انگشتری سے مہر لگائی اور پھر ایک محافظ کو طلب کر کے رقعہ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "اس کاغذ پر تحریر یہ ہے کہ میکال کو فوراً رہا کردیا جائے۔" ان الفاظ کو کہتے ہوئے اس کے لہجے میں صدیوں کا ٹھہراؤ اور آسمان کی بلندی تھی۔
مزرک سکتے میں رہ گئی تھی۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ فرعون کے پیروں کو چوم لے۔ لیکن فرعون مڑ کر واپس نکل گیا۔
مزرک کو ایک نیا تجربہ ہوا تھا۔ اس کے دل میں

بے اختیار خواہش مچلی تھی کہ وہ فرعون کو روک لے۔ اس کے سینے سے لگ جائے۔ لیکن اس کے ہونٹ سل گئے۔
میدان جنگ میں دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ زرقون انتہائی خونخوار قبائل کا لشکر لایا تھا جو بہتے خون کے رسیا تھے تو دوسری طرف فرعون بھی اپنے بہترین سپاہ کو لے کر آیا تھا۔ خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ گردنیں شانوں سے جدا ہو کر زمین بوس ہونے لگیں۔ میدان جنگ لاشوں سے بھر گیا۔ یہ جنگ کئی دن جاری رہی اور کوئی ہار ماننے کے لئے تیار نہ ہوا۔
پھر ایک صبح زرقون کی فوج کا ایک سالار میدان جنگ میں آیا۔ اور اس نے باآواز بلند کہا۔
"ہمارے بادشاہ کا مصر سے جنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ جنگ صرف ایک معمولی کنیز کے لئے لڑی جارہی ہے۔ اگر اب بھی وہ کنیز ہمارے حوالے کردی جائے تو ہم جنگ نہ کر کے واپس لوٹ جائیں گے۔"
فرعون نے یہ سنا تو قہر وغضب سے بولا "اخناطوس، خناس بے حمیت زرقون کے اس مطالبے کو لعنت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ اس کنیز کے لئے نہیں بلکہ اپنی بیٹی شیرانہ کے ٹھکرائے جانے کی جنگ لڑ رہا ہے۔ وہ جسے ایک معمولی کنیز کا نام دیتا ہے، جس کے قدموں میں ہزار سورماؤں کی قربانی دی جاسکتی ہے۔"
جب یہ جواب زرقون نے سنا تو وہ شدت غضب میں گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے لے آیا اور نیزہ لہرا کر بولا۔ "اگر تو اتنا ہی بہادر ہے تو سپاہیوں کو کٹوانے کے بجائے خود آگے آ اور فیصلہ کر۔ سپاہیوں کے بل پر جنگ کرنا بہادری نہیں ہوتی۔"
فرعون نے اس للکار کو قبول کیا اور فوجوں کو جنگ کرنے سے روک کر دونوں ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔ دونوں ہی بہترین جنگ جو تھے۔ وہ جنگ دیکھنے میں آئی کہ دیکھنے والے دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ گئے۔ کوئی بھی پسپا نہیں ہو رہا تھا۔ وقت تھا کہ پر لگا کر دوڑ رہا تھا۔ سورج خوب بلند ہو رہا تھا۔
اچانک فرعون نے ایک عجیب کھیل کھیلا۔ اس نے تلوار اور ڈھال زمین پر پھینکی اور زرقون کے گھوڑے پر چھلانگ لگا دی۔ یہ حملہ عجیب تھا۔ زرقون زمین پر گر پڑا۔ لیکن اس کے باوجود وہ فرعون کے حملوں سے بچا اور اس نے گھبرا کر فوجوں کو لڑنے کا اشارہ کردیا۔ حبشی تلواریں سونت کر فرعون پر جھپٹے لیکن فرعون نے وہ جنگ لڑی کہ دیکھنے والے سکتے میں آگئے۔ اس نے دشمنوں کو کاٹ کر پھینک دیا اور وہ ان کے نرغے سے صاف نکل گیا لیکن ایک حبشی قبائلی نے اچانک اس پر پشت سے وار کیا اور تلوار فرعون کی پشت سے آر پار کردی۔
فرعون جو دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوگیا تھا اس وار سے پست ہوگیا اور گھوڑا لے کر دریائے نیل کی طرف سرپٹ ہوگیا۔ یہ گویا مصری افواج کی شکست تھی۔ چنانچہ مصری فوجوں نے پسپائی اختیار کی اور قلعہ بند ہوگئیں۔
خود زرقون بھی کافی زخمی ہوگیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے قاصدوں کا ایک وفد قلعہ مصر بھیجا۔ جسے چھان پھٹک کے بعد اندر آنے کی اجازت دے دی گئی۔ وفد کے سربراہ نے کہا۔
"شاہ حبش نے فاتح ہونے کے باوجود مصر کی عوام کے خلاف کوئی عمل نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ شاہ مصر مر گیا ہے لیکن تنازعہ برقرار ہے۔ اہل مصر ہماری کنیز مزرک کو ہمارے حوالے کردے۔ محاصرہ ختم کر کے واپس چلے جائیں گے۔ بصورت دیگر جنگ جاری رہے گی۔
امراء وزراء آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ملکہ مصر دشمن کے حوالے کردی جائے اس سے زیادہ شرم کی کوئی بات نہیں تھی تاہم مشورہ کے بعد بڑے وزیر نے کہا۔
"اس بات کا فیصلہ ملکہ مصر کرے گی۔ کیونکہ بادشاہ کی موت کے بعد وہی مصر کی حکمران ہے۔"
ابھی یہ الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ مزرک شاہی پوشاک میں تاج مصر سر پر رکھے ہوئے نمودار ہوئی اور سب اس کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔
"میں یہ فیصلہ اہل مصر کے مشورے سے کرنا چاہتی ہوں۔ انہیں فصیل کے نیچے جمع ہونے کی ہدایت

کی جائے۔ اور اس حکم پر عمل ہوا خلقت مصر فصیل کے نیچے جمع ہوگئی جب ان لوگوں کو حقیقت معلوم ہوئی تو سب شور مچانے لگے اور بولے۔"

"ہمیں ملکہ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ایک عورت کی خاطر اپنے لاکھوں سپاہی نہیں کٹوا سکتے۔"

"ہم لڑنا نہیں چاہتے۔"

"ایک کنیز کے لئے ہمیں خونریزی منظور نہیں۔"

"ملکہ کو زرقون کے حوالے کردو۔"

تبھی مزرک فصیل میں آئی اور مدہم لہجے میں بولی۔ "مصر کے بیٹو۔ میں تمہارے جذبات سمجھتی ہوں۔ ان کی قدر کرتی ہوں میں نے دل سے چاہا تھا کہ جنگ نہ ہو...... میں نے فرعون اعظم کو مشورہ دیا تھا کہ مجھے زرقون کے حوالے کردیں۔ مگر وہ تیار نہیں ہوئے اور یوں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ بہرحال میں خود کو شاہ حبش کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔ اور جانتی ہوں کہ یہی میرا مقدر ہے۔"

مزرک نے سر جھکا لیا اور پھر وہ فصیل سے نیچے آگئی اور زرقون کے ایلچیوں کے روبرو کھڑی ہوئی ماحول پر سوگوار سناٹا چھا گیا...... سب جانتے تھے کہ اس حسین ملکہ کا انجام کیا ہوگا۔ زرقون اسے بدترین سزا دے گا۔

ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا کہ دفعتاً ایک نوجوان مجمع کو چیرتا ہوا آیا اور ایک مقام پر کھڑا ہوگیا۔ اس کا جسم زخموں سے چور تھا اور صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی زرقون کی فوجوں سے جنگ کرتا رہا ہو۔

یہ میکال تھا جو آزادی ملتے ہی خود فوجوں میں جا شامل ہوا تھا اور زرقون کی فوجوں کے خلاف اس نے مصر کے لئے بھرپور جنگ کی تھی۔ اس کی گرجدار آواز ابھری۔

"مصر کے غیور بیٹو! تمہیں اندازہ ہے کہ تم اپنی زندگی کے لئے مصر کی روایتوں کو پامال کررہے ہو۔ آنے والی نسلیں تمہیں کیا کہیں گی کہ تم دشمن کے سامنے سر جھکا رہے ہو۔ یہ عورت جو پہلے بے شک کنیز تھی لیکن اب ملکہ مصر ہے۔ تمہارے بادشاہ کی بیوی، تمہاری عزت، تم اپنی عزت دشمن کے حوالے کرنے کو تیار ہو۔ تمہیں یہ ذلت گوارہ ہے۔ بولو۔ تمہیں یہ ذلت گوارہ ہے۔"

یہ الفاظ نہیں تھے آگ تھی جو ہر دل میں سرایت کرگئی۔ بجلی تھی جو سینے میں کوند گئی۔ اور مجمع کا نظریہ بدل گیا۔

"نہیں...... ہم ملکہ کو دشمن کے حوالے نہیں کریں گے۔"

"ہم اپنی ماں کو دوسروں کو نہیں دیں گے۔"

"ہم مصر کے بیٹے ہیں۔"

"مزرک! ہماری ماں ہے۔"

"ایلچیوں کو آگے آنے دو۔"

"ہم زرقون سے جنگ کریں گے۔"

"نہیں...... قاصد بے قصور ہوتے ہیں۔ انہیں یہ پیغام دے دو کہ ہماری تلواریں اب غیرت کی جنگ لڑیں گی۔ ہم جنگ کے لئے تیار ہیں۔"

ایلچی چلے گئے۔ مجمع جوش کے ساتھ منتشر ہوگیا...... تب مزرک کی نگاہ، میکال سے ملی۔ دونوں کے دل دھڑکنے لگے۔ لیکن مزرک اب بدل چکی تھی وہ مصر کی ملکہ تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اب تک کنواری تھی اور آج بھی میکال کے قدموں کی خاک تھی۔ لیکن یہ موقع ایسا تھا کہ وہ اسے قریب بلانے پر مجبور تھی۔

بڑے وزیر نے میکال سے کہا۔

"اے نیل کے بیٹے۔ میں تیری جرأت، تیری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ تو نے مصر کی لاج رکھ لی۔ میں آنے والے وقت کے لئے تجھ سے مشورہ چاہتا ہوں۔ اب بتا ہم کیا کریں۔"

"اپنی قوت کو مجتمع کرکے بھرپور حملہ۔"

"تو کیا زرقون؟"

"ہاں۔ اس کے ایلچیوں نے اسے صورت حال

سے آگاہ کردیا ہوگا۔ اب وہ دوبارہ حملہ کرنے کے لئے تیاری کررہا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل جائے ہم اس پر حملہ کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" وزیر نے تائید کی اور دوسری صبح قلعہ کے دروازے کھول دیئے گئے مصر کی فوجیں بڑی جوش کی مانند باہر نکلیں اور خونخوار شیروں کی طرح زرقون کی فوجوں پر ٹوٹ پڑیں۔ وحشی قبائل نے اب بھی بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ لیکن میکال موت کا فرشتہ بنا ہوا تھا۔ اس کا جوش، ولولہ مصر کی فوجوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ اور سب اس کی جنگ دیکھ کر انگشت بدنداں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام ہونے تک زرقون کی فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور مصریوں کو شاندار فتح نصیب ہوئی۔

سارے مصر میں جشن کا سماں تھا۔ کوئی مصری گھر کے اندر نہیں تھا۔ پھر بڑا وزیر، مزرک، اور میکال کو ایک کمرے میں لے گیا۔ اس نے میکال سے کہا۔

"میکال۔ تو نے مصر میں ایک نئی تاریخ رقم کی ہے جسے دنیا بھی نہیں بھول سکے گی۔ میں اپنی ایک خواہش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔"

"حکم دیں وزیراعظم......" میکال نے ادب سے کہا۔

"یہ بات میں خلوت میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تیرا اور مزرک کا عندیہ لے لوں۔ اس کے بعد اہل مصر کے سامنے اپنی تجویز رکھوں۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"جیسا کہ میں نے کہا کہ تو نے اور تیری اولوالعزمی نے اہل مصر کو ہاری ہوئی جنگ جتائی ہے اور تو نے ہمیں سرخرو کیا ہے تو میری تجویز یہ ہے کہ تو مصر کے تاج و تخت کو قبول کر۔"

میکال حیرت سے چونک پڑا۔

"میں۔" بمشکل اس نے کہا۔

"ہاں......"

"لیکن میں...... میں اس قابل نہیں ہوں۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔"

"بے شک ہے۔ لیکن......"

"کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں معزز بزرگ......"

"ہاں...... بول......"

"اگر میری کاوش کو قابل انعام سمجھا گیا ہے تو مجھے ایک انمول انعام سے نوازا جائے۔"

"انمول انعام......؟"

"جی......"

"اپنی خواہش بیان کر۔"

"میری محبت مجھے مل جائے۔" میکال نے کہا۔

"تیری محبت......؟"

"جی......"

"وہ کون ہے......؟" وزیر کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔

تبھی میکال نے پیار بھری نگاہوں سے مزرک کو دیکھا۔ وزیر نے کہا۔

"تیری محبت کون ہے......؟"

"مزرک......" میکال نے کہا۔ اور وزیر مسکرا دیا۔ اس نے میکال کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"شیر دل نوجوان۔ تو وزیر زادہ ہے۔ امور سلطنت سے واقف، اور مزرک آج بھی ہماری ملکہ ہے وہ اگر قبول کرلے تو کسے انکار ہوگا۔ اس کے علاوہ فرعون کا انتخاب بھی ملکہ ہی کرے گی۔ وہ جسے بادشاہ اور شوہر منتخب کرے۔"

"اس کا جواب تو مزرک ہی دے سکتی ہے۔"

"ہاں...... لیکن بھرے دربار میں۔ پورے اہل مصر کے سامنے۔ اور اس کے لئے میں ایک مبارک دن کا انتخاب کروں گا۔"

فتح کی مسرت سے سرشار اہل مصر خود بھی منتظر تھے کہ جلد ہی فرعون کا انتخاب ہو۔ وہ بڑے وزیر کے اعلان کا انتظار کررہے تھے۔ آخر وزیر نے شہر میں منادی کرادی کہ فلاں دن فرعون کا انتخاب ہوگا۔

یہ تاریخی دن قریب آگیا۔ اور آخر مصر کی خلقت اس عظیم الشان میدان میں جمع ہوئی جس کے

ایک سرے سے دوسرا سرا نظر نہیں آیا تھا۔ سروں کا سمندر تھا جو موجزن تھا ان کے علاوہ اکابرین سلطنت اور عمائدین شہر بھی اپنی جگہیں سنبھالے ہوئے تھے۔ ہر چہرہ پر تجسس اور خوشی سے سرشار تھا اور سب سوچ رہے تھے کہ ان کا بادشاہ کون ہوگا۔

ایک......ایک بزرگ کاہن نے تقریب کا آغاز کیا۔

"فاتحین مصر، اور دانش ورو" قانون کے مطابق نئے فرعون کے انتخاب سے پہلے سابق فرعون کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا۔ اگر وہ نیک ثابت ہوا تو اس کے حق میں دعائیں پیش کی جائیں گی اور اگر بد ہوا تو اس کے لئے کلمہ بد ادا کئے جائیں گے۔ یہی دستور مصر ہے جو صدیوں سے رائج ہے۔"

"بالکل ٹھیک" مجمع نے تائید کی۔

اس وقت غلغلہ بلند ہوا۔ اور ملکہ مصر دوشیزاؤں کے جلو میں وارد ہوئی اور تمام اکابرین سجدے میں گر گئے۔ پھر ملکہ مصر کرسی پر بیٹھی تو سب سیدھے ہو گئے۔ مغنیوں نے ملکہ کی شان میں مدح سرائی شروع کر دی اور دعائیہ گیت گائے۔ ملکہ کے برابر دوسری مرصع کرسی بھی رکھی گئی تھی جو نئے فرعون کے لئے تھی۔

کچھ لمحوں کے بعد بڑا وزیر کھڑا ہوا اور اس نے آغاز کیا۔

"مصر کے خوش نصیب لوگو! میری خوش نصیبی ہے کہ نئے فرعون کے انتخاب میں، مجھے ملکہ کی مدد کرنے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ فرعون کا انتخاب ملکہ کی فراست پر ہے کہ وہ جسے چاہے فرعون مصر منتخب کرے۔ اور جسے چاہے شوہر ہونے کا اعزاز عطا کرے۔ لیکن اس سے قبل سابق فرعون......اخناطوس باخناس کے اعمال کا محاسبہ ہوگا۔ اس کے ستائے ہوئے اور مظالم کا شکار لوگ اس کے حق میں بددعائیں کریں گے جس کے ساتھ اس نے اچھا سلوک کیا وہ اس کے لئے دعا کریں گے۔ اب وہ آگے آئیں جن کے ساتھ ظلم ہوا۔"

"تب بے شمار تباہ حال عورتیں سامنے آئیں اور لوگ انہیں دیکھنے لگے۔

"تم کون ہو......؟" وزیر نے کمال نرمی سے پوچھا۔

"ہم وہ بدنصیب ہیں جن کے شوہروں نے خزانے کی نئی عمارت بنائی تھی۔"

"اچھا......پھر......؟"

"عمارت کی تکمیل کے بعد ان سب کو فرعون نے تیل میں غرق کر دیا۔"

"انہیں ہلاک کر دیا گیا۔"

"ہاں......" عورتوں نے روتے ہوئے کہا۔

"کیوں......؟"

ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے بڑی جانفشانی سے خزانے کی عمارت کی تعمیر کی تھی۔"

"لیکن بادشاہ نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟"

"اس لئے کہ وہ خفیہ تہ خانوں کے راستے جانتے تھے۔" عورتوں نے کہا اور زار و قطار رونے لگیں۔ ہر طرف سے آہ و زاری کی آوازیں ابھرنے لگیں۔

ان کے خاموش ہونے کے بعد وزیر نے کہا۔

"اور کوئی ستم رسیدہ......؟"

"مجمع میں انتشار ہوا اور بہت سے مفلوک الحال بچے سامنے آئے۔ ان کے ساتھ ایک عمر رسیدہ باریش بوڑھا تھا۔ جو بے حد ضعیف تھا۔

"یہ کون ہیں محترم بزرگ......؟"

"یہ وہ بچے ہیں جن کے سرپرستوں کے سر فرعون نے قلم کرا کر انہیں یتیم کر دیا۔"

"کیوں......؟"

"کیونکہ وہ مصر کے دولت مند ترین لوگ تھے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"فرعون نے اپنے خزانے بھرنے کے لئے ان سے ان کی دولت مانگی تھی۔"

"ہوں......پھر؟"

"اور انہوں نے اسے اپنی دولت دینے سے پس و پیش کیا تھا۔ چنانچہ انہیں تہہ تیغ کر دیا تھا۔ ایسے ایسے دلدوز واقعات سننے کو ملے تھے کہ ہر آنکھ اشک بار ہو گئی۔ بڑے وزیر نے گھبرا کر مزرک کو دیکھا پھر بولا۔

"بس بس......یہ ثابت ہو گیا کہ فرعون کے مظالم کی فہرست بہت طویل ہے۔ خوشی کے اس موقع پر غم کی یہ داستانیں کلیجہ چیرتی ہیں۔ لگتا ہے مصر کا ہر شخص فرعون کے ظلم کی چکی میں پس چکا ہے، اور اس کے لئے ہر طرف سے کلمہ بد سنائی دے رہا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کوئی ایسا بھی ہے جو اس کے حق میں کلمہ خیر کہنا چاہتا ہو۔"

"ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ بہت دیر گزر گئی۔ کوئی کچھ نہ بولا تو......وزیر نے کہا۔

"گویا اس کے بارے میں کوئی اچھا لفظ دینے کے لئے تیار نہیں؟"

وزیر کے اس بات پر بھی خاموشی چھائی رہی۔

تب وزیر نے کہا۔

"تب میں یہی کہوں گا کہ لعنت ہو اس شخص پر......"

"ٹھہرو......رک جاؤ......اچانک مزرک اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اور چاروں طرف سے حیرت کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ ہر آنکھ ملکہ کی نگراں ہو گئی۔

"مصر کے لوگو! میں فرعون کے حق میں ہوں......"

لیکن اچانک مجمع میں شور بلند ہو گیا۔

"نہیں ملکہ فرعون۔ تم اس کی بیوی تھیں۔ تم جو بھی کہو گی اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔"

"وہ غلط ہوگا۔"

"وہ جانبداری ہوگی۔"

"ہم اسے نہیں مانیں گے۔"

"وہ ظالم تھا۔"

"وہ بدکار تھا۔"

"اس نے سب کی آہیں لی ہیں۔"

"لیکن اس نے میرے ساتھ بھلائی کی۔ اس نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا۔ اس نے اس کے بدلے میرے محبوب کو آزاد کر دیا۔" مزرک نے کہا۔ لیکن اس کی آواز لوگوں کے شور میں دب گئی جو اتنے مظلوموں کی داستانیں سن کر سخت غضبناک ہو گئے تھے۔

بڑے وزیر نے بمشکل انہیں خاموش کیا۔ اور بولا۔ "لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ ملکہ فرعون کے حق میں کلمہ خیر نہیں کہہ سکتیں۔ اور کوئی ہے جو فرعون کے حق میں کلمہ خیر کہنے کو تیار ہو۔"

"کوئی جواب نہیں ملا۔ تو بڑے وزیر نے اس بزرگ سے کہا جو مقدس کاہن تھا۔ "آپ فرعون کے بارے میں روایت کے مطابق حکم بد کہیں۔" بزرگ کاہن نے کھڑے ہو کر کہا۔

"تو......فرعون ظالم تھا۔"

"ہاں......وہ تھا۔" مجمع نے تائید کی۔

"بے انصاف تھا۔"

"اس نے آسمانی طاقتوں کو جھٹلایا۔"

"ان کے غضب کو دعوت دی۔"

"اس کا برا حال ہوا۔"

"اس کی لاش تک کا پتہ نہیں۔ اور اگر لاش مل بھی گئی تو اسے دریائے نیل میں پھینک دیا جائے گا۔ اور وہ مچھلیوں کا خوراک بن جائے گا۔"

"اسے ملعون قرار دیا جاتا ہے۔"

"مصر کی تاریخ میں اسے بدنما باب کہا جائے گا۔"

"اس کی روح ہمیشہ بے تاب اور مضطرب رہے گی۔"

فرعون سے نفرت کرنے والے، کاہن کی آواز پر لبیک کہہ رہے تھے۔ لیکن مزرک کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ فرعون کی مرہون منت تھی۔

بڑے وزیر نے اسے دیکھا اور بولا۔ "اے مصر کی حسین ملکہ، غیبی ہاتھوں نے تجھے پتھر سے گوہر بنا دیا۔ خود پر قابو رکھ اور اس کے لئے آنسو نہ بہا جس نے ہر شخص پر ظلم کیا۔ تیار ہو جا کہ اب تو مصر کا نیا فرمانروا منتخب کرے گی۔ اور یہ معمولی کام نہیں ہے جو تجھے سرانجام دینا ہے۔ اٹھ جا اور اپنا فرض انجام دے۔"

"مزرک کھڑی ہو گئی۔ اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ پھر اس نے ہجوم

کی طرف دیکھا اور سریلی آواز میں بولی۔
"مصر کے بہادر بیٹو۔ مجھے بتاؤ تمہیں ہاری ہوئی جنگ کس نے جتائی۔ کس نے تمہارے ناموس کو یعنی مجھے بدترین وقت سے بچایا......؟"
"بہادر میکال نے۔" مجمع نے پرجوش لہجے میں کہا۔
"مزرک ایک دم خوش ہوگئی۔ اس نے کہا۔" تو پھر کیوں نہ میں اسے ہی فرعون منتخب کروں۔"
مجمع ایک دم مسرت سے چیخ اٹھا۔ "ملکہ مصر! مقدس طاقتیں تجھے سلامت رکھیں۔ تو نے مصر کو بہترین فرمانروا دیا ہے۔"
"شادیانے بجنے لگے۔ فضا میکال زندہ باد، مزرک زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی۔ بڑے وزیر نے تاج پوشی کی رسم ادا کی اور جشن برپا ہوگیا۔
"اس منور اور روشن رات کو میکال اور مزرک محل کے جھروکے سے باہر کی مسرور ریت کے روشن اور رنگین ماحول کا نظارہ کررہے تھے۔ انہیں گزرے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ یاد آرہا تھا دونوں تجدید محبت کررہے تھے۔ مزرک کہہ رہی تھی۔
"ہماری محبت لازوال تھی۔ ہمارا ساتھ اب کبھی نہ چھوٹے گا۔"
ادھر یہ گفتگو جاری تھی اور پھر محل کی ڈیوڑھی میں ہزاروں لوگ نادر اور بہترین کھانے سے لطف اندوز ہورہے تھے جس کا انتظام شاہی حرم میں کیا گیا تھا۔ سب خوش تھے انہیں لوگوں میں ایک شخص داخل ہوا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ زخم تھے۔ جن پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور نہایت غلیظ تھے۔
پہرے داروں نے نفرت سے ناک سکوڑ کر اسے روک دیا۔
"کون ہے تو......کہاں گھسا چلا آرہا ہے......؟"
"نووارد کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ مشکل سے اس نے اپنی حالت پر قابو پایا اور بولا۔
"تو مجھے نہیں جانتا۔"
"نہیں......تو بھوکا ہے۔ تو یہ لے اور بیٹھ جا۔ کھانا کھالے۔"
"آنے والے کے چہرے پر شدید کرب کے آثار پیدا ہوگئے۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔
"بدبخت غور سے دیکھ مجھے۔ غور سے دیکھ۔"
"کون ہے تو؟ آخر کون ہے؟"
"میں مصر کا فرعون۔ اخناطوس باختاس ہوں۔"
"دھت تیرے کی۔ نشے میں ہے شاید۔
"پہرے دار نے ناک سکوڑ کر کہا۔
"میں نشے میں نہیں ہوں۔" لیکن۔ نووارد بولا۔ پہرے دار نے چیخ کر اوروں سے کہا۔
"ذرا دیکھو۔ یہ فرعون اخناطوس۔"
"بہت سے منچلے اس کے پاس جمع ہوکر اس کا مذاق اڑانے لگے۔ ایک فقیر نے اس کے پیٹ میں لکڑی چبھو کر کہا۔ "شہنشاہ اعظم تیرا تاج کہاں ہے؟"
نووارد نے جواب میں اس پر ایسی حسرت بھری نگاہ ڈالی جو پتھر میں سوراخ کرسکتی تھی۔ منہ سے کچھ نہ کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔
ایک دوسرے فقیر نے اپنا پیالہ اس کے سر پر الٹ دیا اور قہقہہ لگا کر بولا۔ "یہ ہے اس کا تاج۔ نووارد نے سر پر رکھے پیالے کو ہاتھ سے چھوا۔ اس کے رخساروں پر پیالے کا شوربا بہہ رہا تھا۔
اسی وقت بڑا وزیر باہر آیا۔ نووارد اسے دیکھ کر دیوانہ وار آگے بڑھا اور بڑے وزیر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ نووارد کو دیکھ کر پتھرا گیا تھا۔ اس نے اخناطوس کو پہچان لیا تھا۔ تب ہی اس کی آواز ابھری۔
"فرعون معظم......!"
ہاں......میں ہی ہوں۔ مگر یہ سب کیا ہورہا ہے۔ کوئی مجھے نہیں پہچان رہا۔ یہ جشن کیسا برپا ہے۔"
"بڑے وزیر نے تاسف اور ندامت سے کہا۔
"سب کچھ ہوچکا ہے فرعون معظم۔ آپ کی موت کا تعین کرلیا گیا تھا چنانچہ ملکہ مصر نے مصر کے دستور کے مطابق نئے فرعون کا انتخاب کرلیا۔

"نیا فرعون......؟" اخناطوس نے کرب سے کہا۔
"ہاں......"
"کسے نیا فرعون بنایا گیا......؟"
"میکال......وزیر خزانہ کے بیٹے کو......"
"آہ......یہ کیا کیا تم لوگوں نے......اتنی جلدی کیوں کی۔ میری موت کا تعین کیوں کرلیا۔ میری تو لاش بھی نہیں دیکھی تھی تم نے۔"
"فرعون اعظم۔" بڑے وزیر نے لاچاری سے کہا۔
"میں تو بس زخمی ہوا تھا۔ میرا وفادار گھوڑا مجھے نیل کے کنارے لے گیا تھا۔ میں بہت وقت بے ہوش رہا۔ اور جب ہوش آیا تو یہاں چل پڑا۔ لیکن تم سب نے یہ کیا کر ڈالا۔ میری مزرک کہاں ہے؟"
"وہ میکال کی بیوی بن گئی ہے۔"
"آہ۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ اہل مصر اب بھی مجھے اپنا بادشاہ مان لیں گے۔"
"ایسا کبھی نہیں ہوا۔ نہ ہوسکتا ہے اور پھر انہوں نے تجھے ملعون و مردود قرار دے دیا ہے۔ تو اب بادشاہ نہیں بن سکتا۔"
"مگر مزرک میری بیوی ہے۔ بے شک مجھے مصر کی سلطنت واپس نہ ملے مگر میری مزرک تو مجھے مل جائے۔"
بڑا وزیر سوچنے لگا اور پھر بولا۔ "ہاں۔ مصریوں کے قانون میں اس کی گنجائش ہے وہ تیری جائز بیوی ہے اور تو اس کا شوہر زندہ ہے۔"
اخناطوس خوشی سے جھوم اٹھا۔ "بس بس۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔ مزرک مجھے مل جائے۔ میری مزرک مجھے مل جائے۔ وہ میری بیوی ہے۔"
بڑا وزیر اخناطوس کو محل میں لے آیا۔ پھر اس جگہ جہاں میکال اور مزرک۔ محبت بھری باتیں کررہے تھے۔ مزرک نے اخناطوس کو دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چراغ کی طرح بجھ کر میکال کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ اس کے دل کی حرکت، رکنے لگی۔ ادھر اخناطوس مزرک کو دیکھتے ہی چیخا۔
"میری مزرک مجھے دے دو۔ یہ میری بیوی ہے۔"
میکال نے حیرت سے اخناطوس کو دیکھا۔ پھر وہ چیخا۔ "کیا بکواس ہے۔ یہ مردود کہاں سے آیا۔ اور یہ کیا کہہ رہا ہے......؟"
بڑے وزیر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔
"نہیں شاہ معظم۔ یہ جو کہہ رہا ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مزرک اس کی بیوی ہے۔ اور مزرک کا شوہر زندہ ہے۔ وہ اس کی زندگی میں کسی دوسرے کی بیوی نہیں بن سکتی۔ مزرک کو اس کے حوالے کردے۔"
دونوں بری طرح بدحواس ہوگئے۔ انہیں حالات کی سنگینی کا احساس ہوگیا تھا۔ میکال اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے تاج اتار کر فرعون کے قدموں میں رکھ دیا اور بولا۔
"تیری سلطنت تجھے مبارک۔ لیکن مزرک میری ہے۔"
"ہرگز نہیں۔ میں مزرک پر سو سلطنتیں قربان کرسکتا ہوں۔ مجھے بس میری مزرک چاہیے۔"
"ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اخناطوس۔" "مزرک کبھی تجھ سے محبت نہیں کرسکتی۔"
"باہر زبردست ہنگامہ برپا تھا۔ سب کو فرعون کی زندگی اور واپسی کا پتہ چل گیا تھا۔ ہر طرف ایک ہی سوال تھا۔
"اب کیا ہوگا؟"
تبھی، انہوں نے میکال اور مزرک کو باہر آتے دیکھا۔ انہیں پتا تھا کہ اخناطوس اب مصر کا فرعون نہیں رہا۔ میکال اور مزرک کو ساتھ آتے دیکھ کر وہ خوش ہوئے۔ اور انہوں نے فرعون کی زندگی کے نعرے لگائے۔
لیکن اسی وقت میکال کی آواز ابھری۔
"اے مصر کے لوگو! اب میں فرعون نہیں رہا۔ فرعون، تمہارا پہلا حکمران اخناطوس ہے۔ مزرک میری ہے......میں نے سلطنت واپس کرکے مزرک لے لی ہے۔"

مجمع غضبناک ہوگیا۔
"ہمارے لئے وہ مرچکا ہے۔"
"ہمارا فرعون میکال ہے۔"
"یہ ظالم ہم پر دوبارہ مسلط نہیں ہوسکتا۔"
"میکال تونے ہم سے غداری کی۔"
"تونے فرعون سے سودا کرکے مصر بیچ دیا۔"
"تونے لمحوں میں ہماری خوشی لوٹ لی۔"
"تونے اس ظالم کو پھر سے ہم پر مسلط کردیا۔" میکال نے آگے بڑھ کر کہا۔
"مزرک میری محبت ہے۔ ہم پیار کے مجرم ہیں۔تم ہمیں سزا دے سکتے ہو۔"
"تجھے سزا ملے گی۔تو ہمارا مجرم ہے۔"
"انہیں سنگسار کردو۔"
"ہلاک کردو انہیں۔" مشتعل ہجوم بے قابو ہوگیا۔اور اچانک ہی ان پر سنگباری شروع ہوگئی یہ سب اچانک ہوگیا۔ بے قابو مجمع کو شدید غم تھا کہ ایک جابر حکمران پھر ان پر مسلط ہوگیا اور وہ میکال کو اس کا ذمے دار سمجھ رہے تھے۔ اتنی شدید سنگ باری ہورہی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے میکال لہولہان ہوگیا۔ مزرک بھی خون میں نہاگئی اور پھر دونوں زمین پر گر پڑے۔
اخناطوس جو محل کے دریچے سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ دیوانوں کی طرح باہر بھاگا اور جب وہ باہر پہنچا تو دونوں دم توڑ چکے تھے۔ اخناطوس نے پاگلوں کی طرح مزرک کو پتھروں کے ڈھیر سے نکالا۔ اور زاروقطار رونے لگا۔
روتے ہوئے اس نے کہا۔
"آہ! نیل کے بیٹو۔ یہ تم نے کیا کیا۔ گناہ گار تو میں تھا۔تم نے میری مزرک کو کیوں مار ڈالا، تم مجھ سے زیادہ ظالم ہو، سفاک ہو، آہ مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔ مزرک کے پیچھے پیچھے جارہا ہوں۔ میں جارہا ہوں۔"
فرعون نے پیش قمیض سے خنجر نکالا اور اپنے سینے میں گھونپ لیا۔
میرے حلق سے ایک چیخ نما آواز نکل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اچانک میں آسمان سے نیچے گر پڑی۔ یہ سارا وجود بوجھل تھا۔ سب کچھ میرے سامنے ہورہا تھا۔ مظلوم مزرک خون میں ڈوبی میرے سامنے پڑی تھی اور۔ اور۔
ایک چھناکہ سا میرے ذہن میں ہوا۔ مسودے میں کسی چہرے کے نقوش نہیں تھے۔ کوئی تصویر نہیں تھی لیکن چشم تصور سے میں نے مسودہ پڑھتے ہوئے جو نقوش دیکھے تھے وہ...... وہ...... پاشا کے نقوش تھے چوڑا بالوں بھرا سینہ، بلندو بالا قد...... روشن سیاہ آنکھیں، اخناطوس۔
میرے منہ سے نکلا۔ اور پاشا چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ "میرے خدا۔"
"پڑھ لیا......" وہ بوجھل لہجے میں بولا۔
"ہاں......" میں نے جواب دیا۔
"انوکھی کہانی ہے نا......؟" اس نے سوال کیا۔ اور میں پرخیال نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر چونک کر بولی۔
"ہاں......"
"میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ میری ہی کہانی ہو۔"
"ہاں کہا تھا۔"
"جانتی ہو کیوں کہا تھا......؟"
"نہیں......" میں نے کہا اور جمال پاشا کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔
"نشا پلیز! میری بات کا کوئی اور مطلب مت لینا۔ پتہ نہیں کیوں۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے کوئی غیر مرئی قوت مجھے تمہارے پاس لے آئی ہے، اور کوئی انوکھی کشش، کوئی انوکھا رشتہ ہے میرے اور تمہارے درمیان مصر کے حوالے سے......"
عجیب الفاظ تھے پاشا کے۔ میں ان میں گم ہوگئی۔ کوشش کے باوجود میں اسے یہ نہیں بتا سکی تھی کہ میں خود ایک عجیب کردار سے منسلک ہوں، میری لاش ایک سنہری تابوت سے دستیاب ہوچکی ہے اور میں ایک کتاب میں نزائلہ کے نام سے پوشیدہ ہوں، مصر کے ایک قدیم باب کی داستان کے طور پر......
پاشا کہہ رہا تھا۔
"اور میں تمہیں یہ بتاؤں کے کچھ راتوں میں، انوکھے خواب نظر آتے ہیں۔ میرے سینے میں عجیب سی وحشت ہوتی ہے، یہ دیکھ کر میرے دل کے مقام پر جو خنجر کا نشان ہے یہ نشان میرے بچپن سے ہے۔" اس نے اپنا لباس ہٹا کر مجھے خنجر کا وہ نشان دکھایا۔ اور میں حیران رہ گئی۔
"یوں میں سوچتا ہوں کہ وہ یہ بوڑھا یہ اوراق لے کر یہ کہتا ہوا کیوں آیا تھا کہ وہ میری امانت ہیں۔ نشا یہ کیسی انوکھی کہانی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہمارے درمیان کوئی انوکھا رشتہ ہے۔ شاید مصر کا رشتہ۔"
میرے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی، پھر اچانک جیسے بم پھٹا۔ ہم دونوں اچھل پڑے، لیکن یہ ڈوربیل کی آواز تھی۔
پاشا پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔ پھر باہر چل پڑا، کچھ لمحوں کے بعد وہ دو افراد کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ یہ ایک ہوٹل کے آدمی تھے جو بہت سے پیکٹوں سے لدے پھدے آئے تھے۔ کھانا آیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد پاشا برتن سجانے لگا۔ میں نے اس کی مدد کی تھی۔
ہم کھانے سے فارغ ہوئے تھے کہ پاشا کے موبائل پر اشارہ ہوا۔ اور پاشا نے موبائل آن کرلیا دوسری طرف پاشا کا ماتحت احمد حسن رہا تھا۔
"سر میں نیو لائن سے بول رہا ہوں۔"
"ہاں احمد حسن۔ بولو۔"
"سر وہ کوٹھی طویل عرصہ سے ویران پڑی ہے۔ چونکہ اس کے آس پاس اور کوئی عمارت نہیں ہے۔ اس لئے وہاں کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوسکا۔"
"کیا لگی ہوئی آگ بجھ گئی......" پاشا نے پوچھا۔
"آگ......" احمد حسن نے سوال کیا۔
"وہاں آگ لگی تھی۔"
"نہیں سر......"
"کیا......؟"
"وہاں بالکل آگ نہیں لگی۔"
"باہر سے تمہیں اندازہ نہیں ہوسکا ہوگا۔"
"میں اندر داخل ہوا تھا۔ پوری عمارت کا اندر سے جائزہ لیا ہے میں نے۔"
"آگ نہیں لگی......؟"
"بالکل نہیں۔ وہاں سوکھی ہوئی جھاڑیاں بکھری ہوئی ہیں۔ سب جوں کی توں ہیں۔"
"اوہ!" پاشا کے ہونٹ سکڑ گئے۔ اس نے موبائل کا اسپیکر کھول دیا تھا اس لئے میں بھی اس کے اور ایس آئی کے درمیان ہونے والی باتیں سن رہی تھی۔
ایس آئی احمد حسن بولا۔
"میں نے کوٹھی کے بارے میں اور بھی معلومات حاصل کی ہیں۔"
"کیا......؟"
"یہ کوٹھی ماہر آرکیالوجسٹ جناب ہارون دانش کی کوٹھی ہے۔"
"کیا......؟" ہم دونوں جیسے اچھل پڑے۔
"جی...... ہارون دانش...... وہ......"
"ہاں مجھے معلوم ہے......"
"اور کوئی حکم سر......؟"
نہیں۔ آرام کرو۔"
"اوکے سر......"
فون بند کرکے پاشا مجھے دیکھنے لگا۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ یہ انوکھا انکشاف ہوا تھا۔
"آپ کو اس کے بارے میں معلوم تھا مس نشاء۔"
"نہیں......" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ پاشا خاموش ہوکر سوچنے لگا۔ پھر ایکدم ہنس پڑا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔
"کیا ہورہا ہے یہ......؟"

"پتہ نہیں......" میں نے کہا۔

"میں کون ہوں نشا۔ قدیم مصر کی تاریخ سے میرا کیا واسطہ ہے۔ میرے سینے پر زخم کا نشان کیوں ہے۔ میرے خوابوں میں مصر کیوں ہے۔ میں تم تک کیوں پہنچا ہوں؟ کسی کے پاس کوئی جواب ہے......؟"

میں خاموش رہی۔ طبیعت کچھ نڈھال تھی۔ کھانا وغیرہ کھا چکے تھے ہم دونوں۔ میں نے کہا۔ "واپس چلیں پاشا؟"

"ہاں ہاں۔" اس نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک بات کہوں پاشا"

"ہاں......ضرور!"

"یہ کاغذات مجھے ادھار دے سکتے ہو......"

"کاغذات......"

"ہاں۔ یہ کہانی......"

"ہاں ہاں۔ رکھ لو۔ ایک درخواست کے ساتھ۔"

"بولو......"

"میری امانت کی حفاظت کرنا۔"

"میں تمہیں واپس کردوں گی۔"

میں گھر آ گئی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ آیا ندیمہ اور فیض بابا کے ساتھ میرا رویہ کافی خراب ہو چکا تھا اب وہ ضرورتاً ہی میرے پاس آتے تھے۔ گھر میں ایک پراسرار اداسی فضا قائم ہو گئی تھی......

اس رات میں نے پوری رات جاگ کر اخناطوس میکال اور حزرک کی کہانی کئی بار پڑھی۔ ایک لمحہ نہیں سوئی تھی۔ پتہ نہیں ذہن کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ اس کہانی کو کوئی اہمیت نہ دیتی لیکن میری خود ایک کہانی بن گئی تھی۔ نزائلہ کی لاش میری ہمشکل تھی اس کے بعد کے پراسرار واقعات، ڈیڈی کی گمشدگی، پھر میرے بارے میں پراسرار انکشافات، اور پھر پاشا۔ بالکل اتفاقیہ ملاقات تھی۔ احمر جنیدی کا واقعہ۔

میرا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔

دوسری صبح تیز بخار ہو گیا۔ اس وقت آیا ندیمہ کا ایک الگ کردار سامنے آیا ملازمہ کے میرے بخار کا سن کر گویا ہوئی۔

"کیا بات ہے نشاء بی بی......؟"

"کچھ نہیں......"

"نشاء بی بی......" اس کے لہجے میں بڑی عاجزی تھی میں نے خونی نگاہوں سے اسے دیکھا، لیکن میں منہ سے کچھ نہ بولی تو اس نے پھر کہا۔

"اتنا دور کیوں ہو گئی ہیں ہم سے۔" وہ بولی۔

"دیکھو آیا ندیمہ سب کچھ جانتی ہو تم، اتنی بے یارومددگار ہوں میں کہ اب کسی کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتی۔ میرا تو پورا ماضی گم ہو گیا ہے، بس مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"میں مر جاؤں گی تمہارے لئے نشاء بی بی تم دیکھ لینا۔" آیا ندیمہ اس طرح کی باتیں کرتی رہی کہ میرا دل پسیج گیا میں نے کہا۔

"تم لوگ میرے نہیں ہو، میں نے کبھی تمہیں ملازم نہیں سمجھا آیا ندیمہ، لیکن لیکن جو کچھ تم لوگوں نے مجھ سے چھپایا اس نے مجھے تم سے بہت دور کر دیا ہے، بہت دور، سمجھ رہی ہو نا میری بات۔"

آیا ندیمہ نے گردن جھکا لی پھر بولی۔ "بدنصیبی ہماری یہ ہے کہ ہم آپ کے بھی نمک خوار ہیں اور دانش صاحب کے بھی، دعوے سے کہتی ہوں کہ میرے مالک زندہ ہیں، وہ آئیں گے نشاء بی بی اور جب وہ مجھ سے یہ سوال کریں گے کہ آیا ندیمہ میں نے تمہارے سپرد جو ذمے داری کی تھی کیا تم نے اسے پورا کیا؟"

"چھوڑو آیا ندیمہ، چھوڑو ان باتوں کو۔" میں نے کہا اور غصے سے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ آیا ندیمہ میری خوشامدیں کرتی رہی مگر میں اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی تھی۔ حالانکہ تیز بخار تھا لیکن لباس اتار کر شاور کے نیچے بیٹھ گئی اور تقریباً پون گھنٹے تک نہاتی رہی، باہر آئی تو ناشتہ تیار تھا، نہانے سے ایک دم ذہن پر ایک خوشگوار سی کیفیت طاری ہو گئی تھی، ناشتہ کیا اور اس کے بعد پاشا کو فون کیا، پاشا کا موبائل بند تھا، دوسری

طرف سے یہی جواب ملا کہ اس کے فون کی پاور آف ہے، شدید کوفت ہوئی اس کے بعد اس کے فلیٹ کے نمبر پر جو میں نے خصوصاً لے لیا تھا۔ اسے رنگ کیا لیکن وہاں بھی کوئی جواب نہیں ملا اور اس کے بعد میں نے پولیس اسٹیشن فون کیا، پاشا وہاں موجود نہیں تھا لیکن احمد حسن نے فون ریسیو کیا۔

"جی......"

"آپ کون......؟"

"ایس آئی احمد حسن۔"

"احمد میں نشاء دانش بول رہی ہوں۔"

"جی مس نشاء صاحبہ، حکم۔"

"پاشا کہاں ہیں؟"

"پتا نہیں، ابھی تک نہیں آئے، حالانکہ اس وقت وہ آ جاتے ہیں ان کا موبائل بھی بند ہے۔"

"ہاں میں نے وہاں بھی ٹرائی کی تھی، خیر جس وقت بھی وہ آ جائیں ان سے کہیں کہ مجھ سے رابطہ کریں۔"

بخار غالباً ٹھنڈے پانی سے نہانے سے اتر گیا تھا، لیکن ذہن پر ایک بوجھ سا طاری تھا، میں خاموشی سے گھر ہی میں وقت گزارتی رہی، لیکن پاشا کا فون نہیں آیا، یہاں تک کہ پورا دن گزر گیا، شام ہو گئی، اب ذرا سی بے چینی ہو گئی تھی، پاشا کی زندگی سے متعلق میں نے جو کہانی سنی تھی وہ ناقابل یقین تھی، لیکن میرے علاوہ اس کہانی پر اور کون یقین کر سکتا تھا کیونکہ میں خود بھی ایک کہانی تھی۔ کمال ہے یار، کس سے بات کروں کس سے نہ کروں، بس عجیب سا احساس تھا۔

رات، پھر دوسرا دن، تیسرا دن، چوتھا دن اور پانچواں دن، میں بوکھلا کر رہ گئی، ہر جگہ پاشا کو تلاش کرتی پھر رہی تھی، لیکن پاشا کا کہیں نام و نشان نہیں تھا، اس کے وہ الفاظ بھی یاد آ گئے جو اس نے مجھ سے کہے تھے، اس نے کہا تھا کہ کیا میں ٹلا مار جاؤں، اگر وہ ٹلا مار بھی گیا ہے تو کم از کم میرے علم میں تو ہونا چاہیے تھا کہ کہاں گیا ہے اور کہاں نہیں ہے، پریشانی کا یہ وقت بڑھتا چلا گیا۔

یہاں تک کہ دس دن ہو گئے۔ احمد حسن کی زبانی مجھے پتہ چلا تھا کہ پاشا کے اہل خاندان بھی شدید پریشان ہیں، آئی جی صاحب نے اپنے تمام وسائل سے پاشا کو تلاش کیا ہے، پھر اس دن شدید ذہنی کوفت کے عالم میں تھی کہ ایک جانی پہچانی شکل مجھے اپنے گھر میں نظر آئی، یہ مشل تھی، وہی لڑکی جو عسکری کے ساتھ مجھے ملی تھی اور عسکری وہی تھا جس نے اس بوڑھی پراسرار عورت کی طرف میری نشاندہی کی تھی، مشل کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا، اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور بولی۔

"جناب پہچان تو لیا ہوگا۔"

"کیسی بات کرتی ہو مشل، بس کچھ ایسی ہی مصروفیات تھیں جن کی وجہ سے تم سے نہ مل سکی۔"

"دیکھئے ہم کچھ نہیں کہیں گے، خیر سنائیں کیسی ہیں آپ اور یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟"

"بس کچھ طبیعت خراب تھی۔"

"خیریت......"

"ایسے ہی کچھ ذہنی الجھنیں ہیں۔"

"ذہنی الجھنیں، ویسے تو نیند نہ آنے کی وجوہات مختلف ہوتی ہیں، لیکن شعرائے کرام نے اس مرض کی تشخیص کچھ محبت وغیرہ کی شکل میں کی ہے، کوئی ایسی بات تو نہیں؟"

"نہیں ہماری ایسی تقدیر کہاں، بس ماضی یاد آ گیا تھا، تنہائی کے کرب نے نجانے کیا کیا خواہشیں کی تھیں، لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی، خیر چھوڑو، ایک بات بتاؤ۔"

"ہاں ہاں بولو۔"

"میں تمہیں کیسی لگی؟"

"جواب نثر میں دوں یا نظم میں۔" مشل نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا اچھی شوخ و شنگ لڑکی تھی۔ ہنسنا بولنا جانتی تھی میں نے کہا۔

"سنجیدگی سے۔"

"یقین کرو، بار بار ملنے کو دل چاہتا تھا، لیکن عسکری کہتے تھے کہ ذرا سی احتیاط کرو، اپنی عزت اپنے ہاتھ

ہوتی ہے، خیر چھوڑو، سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟"

"مشل تمہیں حیرت ہوگی، یہ سمجھ لو کہ محبتوں سے محروم ہوں، یوں لگتا ہے جیسے لوگ میرے قریب آنا چاہتے ہیں لیکن کچھ سوچ کر مجھ سے دور ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ میری تنہائیوں نے ہمیشہ دوستوں کی طلب کی ہے، میں بداخلاق بھی نہیں ہوں سب سے خلوص سے ملتی ہوں، لیکن میرے شناسا اچانک مجھ سے دور ہوجاتے ہیں بغیر کسی وجہ کے......"

"تعجب ہے اور یہ الفاظ میرے لئے اجنبی ہیں۔" مشل نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ کیا کہہ سکتی ہوں اور کیا نہیں کہہ سکتی۔"

وقت گزرتا رہا اور پھر مشل نے کہا۔ "آؤ باہر نکلیں۔ تمہاری طبیعت مجھے خاصی الجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، چلو گھومیں گے، پھریں گے۔" ہم لوگ تیار ہوکر باہر نکل آئے اور اس کے بعد تقریباً کئی گھنٹے ہماری کار سڑکوں پر دوڑتی رہی پھر مشل نے کہا۔

"یار بھوک لگ رہی ہے کہیں کھانا تو کھلادو۔"

"ہاں ہاں جہاں تم کہو۔"

"چلو پھر میں تمہیں ایک عمدہ سے ہوٹل کا پتہ بتاتی ہوں، وہاں کا کھانا لاجواب ہوتا ہے۔"

خوبصورت ہوٹل میں لذیذ کھانے کی لذتیں بے مثال تھیں، دل الٹا پڑ رہا تھا، پاشا کی گمشدگی نے سب کچھ تباہ کردیا تھا، مجھے یوں لگا جیسے میرا دل اس کی جانب راغب ہو، لیکن ان سارے دنوں میں میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تقدیر میں محبتیں نہیں تھیں، بلکہ اس بات کے امکانات ہیں کہ میں جس سے بھی پیار کروں گی وہ کسی نہ کسی مشکل میں گرفتار ہوجائے گا۔ کچھ دیر کے بعد مشل بولی۔

"میں نے اور عسکری نے تمہارے سلسلے میں کافی باتیں کی ہیں، لیکن جانتی ہو عسکری نے مجھے کیا ہدایت کی تھی، اس نے کہا تھا کہ نشاء سے اس بارے میں کچھ نہ کہنا، وہ سوچے گی کہ خواہ مخواہ ہم اس کے ذاتی معاملات کرید رہے ہیں۔"

"ارے نہیں یہ صرف تمہارا خیال ہے، چلو اگر یہ بات ہے تو میں تم سے معافی چاہتی ہوں کہ اتنے دن تک تم سے ملنے کی خواہش کے باوجود تم سے نہ مل سکی۔"

"عسکری کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے، تمہارے بارے میں بہت سی باتیں ہوتی ہیں، اصل میں ہم تمہاری طرف اس لئے نہیں پہنچے کہ تم نے ہم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔"

"چلو ٹھیک ہے اب تو آگئیں۔"

"ہاں اور آتے رہیں گے، نہ صرف میں بلکہ عسکری بھی، ویسے ایک بات کہوں، مجھے تمہارے والدین پر تعجب ہوتا ہے، تم جیسی معصوم لڑکی کو انہوں نے ملازموں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔"

"مختصر الفاظ میں تمہیں اپنے بارے میں تفصیل بتا چکی تھی، لیکن پھر تفصیل بتا رہی ہوں، یہ آج کی بات نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مشل میں نے کبھی اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا۔ پہلے بھی تمہیں یہ بات بتائی تھی۔"

"کبھی بھی، دونوں کو۔"

"ہاں۔" اور اس کے بعد میرے دل کے آبلے پھوٹ پڑے، میں نے اسے مختصراً اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور وہ تصویر حیرت بن گئی۔ خاموش ہونے پر بھی وہ کچھ نہ بولی اور دیر تک اسی عالم میں بیٹھی رہی، پھر اس نے پانی کا ایک گلاس ہونٹوں سے لگا کر خالی کردیا۔

"ناقابل یقین سی بات ہے، بھلا کون یقین کرے گا، مگر ایسا کیوں ہے۔"

"کاش مجھے معلوم ہوتا۔"

"تمہارے ملازموں کو ضرور معلوم ہوگا۔ مجھے تو یہ کوئی بڑی سازش معلوم ہوتی ہے، معاف کرنا بہت سے خیالات دل میں آتے ہیں، تمہاری کوٹھی اور

تمہارے رہن سہن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تم لوگ بے پناہ دولت مند ہو، ہوسکتا ہے تمہارے خلاف کوئی سازش کی جارہی ہو، کوئی تمہاری دولت پر قبضہ کرنا چاہتا ہو، تمہارے خاندان کا کوئی فرد بھی ہوسکتا ہے۔"

"میرے خاندان میں کوئی نہیں ہے۔"

"تمہارے والد کا کوئی بزنس پارٹنر، کوئی بھی ایسا شخص جو تمہاری دولت پر نگاہ رکھتا ہو۔"

"ساری باتیں اپنی جگہ پر ہیں، مگر میرے ماں باپ ہیں کہاں، اگر وہ مر چکے ہوتے تو صبر آجاتا، آیا ندیمہ بتاتی ہے کہ میرے والد مجھے کہیں سے لے کر آئے تھے اور انہوں نے مجھے ایک دوسری عورت کی آغوش میں ڈال دیا تھا، مجھے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ رات کی تنہائیوں میں اکثر وہ کوٹھی میں آکر اپنی لائبریری میں آتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں، وہاں پر کوئی نشان کہیں نہیں ہے۔"

"خدا کی قسم، دماغ چکرا گیا، لیکن میں ایک بات جانتی ہوں کہ تمہارے دونوں ملازموں کو حقیقت ضرور معلوم ہے۔"

"ہوسکتا ہے، لیکن تمہیں انتہائی چالاکی سے یہ سب کچھ معلوم کرنا ہوگا، کیا سمجھیں؟"

میں سوچوں میں ڈوبی رہی اور پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ "مشل، میرا ساتھ دو میں بڑی اکیلی ہوگئی ہوں، بہت اکیلی، خاص طور سے پاشا کے اس طرح گم ہوجانے سے تم یقین کرو میرے اعصاب کشیدہ ہوگئے ہیں، پاشا کہاں چلا گیا۔ بہت اچھا انسان تھا، یقین کرو وہ میرے دل کے قریب پہنچتا جارہا تھا، پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا؟"

مشل خاموشی سے میرا چہرہ دیکھتی رہی، پھر شام تک وہ میرے ساتھ رہی، میں نے اس سے کہا کہ "وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے چلے" تو اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "یہ پروگرام کل تک کے لئے ملتوی کردیا جائے گا۔"

بات سمجھ میں آگئی تھی، پھر میں نے مشل کو ایک ایسی جگہ اتار دیا جہاں سے اسے ٹیکسی مل سکتی تھی اور اس کے بعد اپنے گھر روانہ ہوگئی، مشل سے بہت ساری باتیں ہوئی تھیں اس نے مجھے بہت سے مشورے دیئے تھے اور انہی مشوروں کے تحت میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آیا ندیمہ اور فیض بابا کے ساتھ اپنا رویہ خراب نہیں کروں گی، کوٹھی میں وہی سناٹا چھایا ہوا تھا جو اس کی تقدیر کا ایک حصہ تھا، میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ کوٹھی میں واپس آؤں۔ پتہ نہیں کیا کیا خیالات دل میں آتے رہتے تھے۔

پاشا کی یاد اب ایک حسرت بن گئی تھی۔ میں نے دل میں سوچا تھا کہ جو وقت اس کے ساتھ گزرا کتنا عجیب تھا، میں نے اپنا جائزہ بھی لیا تھا، کیا میرے دل میں پاشا کے لئے کوئی نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا، بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ بہرطور وقت تو گزرنا ہی تھا۔

دوسرے دن کوئی ساڑھے دس بجے کا وقت ہوگا کہ میرے موبائل پر اشارہ موصول ہوا اور میں نے فون ریسیو کرلیا، کوئی اجنبی نمبر تھا۔ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

"مس نشاء ہارون سے بات کرنی ہے۔"

"جی بول رہی ہوں۔ کون صاحب ہیں؟"

"میں عسکری ہوں۔"

"اوہو عسکری صاحب، کم ازکم اتنا تو ہوا کہ بے چاری مشل نے باپ کو میرے بارے میں یاد دلا دیا۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے، مشل نے آپ کو یہ بھی بتادیا ہوگا کہ ہم لوگ آپ کے سلسلے میں احساس کمتری کا شکار ہوگئے تھے۔"

"بڑی فضول سی بات ہے، آپ فوراً میرے پاس آیئے۔ مجھے آپ سے کام ہے۔"

"آرہا ہوں۔" عسکری کی آواز سنائی دی اور موبائل بند ہوگیا، میں خود حیران رہ گئی تھی، بس میں نے رواروی میں ہی یہ بات کہہ دی تھی، لیکن بہرحال تھوڑی دیر کے بعد عسکری آگیا، بہت خوبصورت لباس میں

ملبوس تھا، ویسے بھی اس کی شخصیت بہت ہی پیاری تھی۔

”آیئے۔“ میں نے کہا اور وہ بولا۔

”گھر کے ماحول میں ہمیشہ گھٹن ہوتی ہے اور پھر ہم آپ تو ویسے بھی باہر کی دنیا کے رسیا ہیں، آیئے آیئے۔“

میں عسکری کے ساتھ چل پڑی۔ عسکری بہت خوش نظر آ رہا تھا، میں نے کہا۔

”اس وقت مشل نہیں ہے آپ کے ساتھ۔“

”نہیں...... کیوں، آپ کے خیال میں کیا مشل کے بغیر میں کسی سے نہیں مل سکتا۔“

”نہیں میرا یہ مقصد نہیں ہے، ویسے آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ نظر بد سے بچانے کے لئے آپ نے ان کو سیاہ شیشوں سے ڈھک لیا ہے شاید۔“

”اوہ مس نشاء، ایسی باتیں نہ کریں کہ میں بھٹک جاؤں۔“

”گھر کا راستہ۔“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں زندگی کا راستہ۔“

”کیا مطلب؟“

”آپ ناراض ہو جائیں گی۔“

”نہیں نہیں آپ بتایئے، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ میں نے کہا اور وہ خاموشی سے سڑک پر دیکھنے لگا، مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا، کافی دیر تک اسی طرح گزر گئے پھر اس نے چوراہے سے کار ایک سمت موڑ دی اور مسکرا کر بولا۔

”دیکھئے نا راستہ بھٹک گیا۔“

”کیسے؟“

”گاڑی سیدھی گھر کی طرف جا رہی تھی جہاں مشل ہماری منتظر ہو گی لیکن اب یہ ایک خوبصورت ریستوران کی طرف جا رہی ہے جہاں پہلے میں آپ کو بہترین کافی پلواؤں گا، اس کے بعد ہم گھر جائیں گے۔ آپ اس جرأت کا برا تو نہیں مانیں گی۔“

”نہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ کافی واقعی شاندار تھی، میں نے اس کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”آپ واقعی بڑے عجیب سے انسان ہیں۔“

”اگر آپ کی اس اپنائیت نے میرے دل میں آپ کے لئے محبت پیدا کر دی تو کیا ہو گا۔“ اس نے بے باکی سے کہا اور میں سکتے میں رہ گئی، پھر وہ بولا۔

”اصل میں، میں بہت جلد باز ہوں جو دل میں آتا ہے منہ سے نکل جاتا ہے۔“

”جی جی۔“

”آپ برا مان گئیں۔“

”نہیں۔“

”تو میری بات کا جواب دیجئے گا۔“

”جلد بازی نہیں۔“ میں نے کہا اور مسکرا دی۔

”نہیں کروں گا، ریستوران نہ ہوتا تو کان پکڑ لیتا۔“

”کافی بہت عمدہ ہے، اٹھ جایئے۔ مشل ہمارا انتظار کر رہی ہو گی۔“

”ایک عرض کروں۔ خدا کے واسطے آپ یہ نہ بتایئے گا کہ ہم لوگوں نے یہ تھوڑا سا وقت ریستوران میں گزارا ہے۔“

”میں ذرا سی الجھ گئی تھی، میرے دل میں عسکری کے لئے کوئی ایسا جذبہ نہیں پیدا ہوا تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ مشل بہت اچھی طبیعت کی لڑکی تھی اور مجھے بتا چکی تھی کہ عسکری سے اس کی منگنی ہو چکی ہے، عسکری نے اچانک ہی یہ باتیں شروع کر دی تھیں، عام طور سے مرد اس طرح کی باتیں کر دیتے ہیں۔ آخر کار، کار خوبصورت بنگلے میں داخل ہو گئی، سامنے بڑے دروازے پر مشل ہمارا استقبال کرنے کے لئے تیار کھڑی ہوئی تھی اور اس نے بڑی محبت سے ہمارا استقبال کیا۔

”آیئے۔“ ہم اندر جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور خاطر مدارت ہونے لگی، پھر مشل بولی۔

”ایک بات بتاؤں آپ کو، میں نے عسکری کو ساری کہانی سنا دی ہے اور عسکری خود بھی بڑی الجھن کا

شکار ہو گئے ہیں، ایک منٹ میں ابھی آئی۔“

وہ بولی اور اٹھ کر باہر نکل گئی، عسکری نے کہا۔ ”مس نشاء! ہر چیز ہو سکتی ہے، اس دن کی وہ پراسرار عورت جو آپ کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہی تھی اور پھر بعد کے حالات جو آپ نے مشل کو اور مشل نے مجھے بتائے ویسے میں آپ سے ایک بات کہوں کہ آپ بالکل بے فکر رہیں میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ایک ایک کو دیکھ لوں گا، کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، یہ میرا فرض ہے۔“

”میں خاموشی سے گردن جھکا کر سوچ میں ڈوب گئی، اس دوران مشل واپس آ گئی تھی اس نے کہا۔

”آپ کی اور عسکری کی باتیں ہوئیں۔ میں نے عسکری سے کہا کہ نشاء جتنی پیاری لڑکی ہے تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے ہم بلا وجہ اس سے ملنے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ تو بہت ہی اچھی طبیعت کی مالک ہے، عسکری کہتے ہیں کہ وہ تمہاری بھرپور مدد کریں گے نشاء۔“

”بہت شکریہ، میں واقعی بڑی تنہائی محسوس کرتی ہوں۔“

”ایک بات بتایئے نشاء۔“

”ہاں پوچھئے۔“

”آپ کا اپنا کوئی بینک بیلنس ہے؟“

”میرا خیال ہے کروڑ روپے کے قریب تو میرا ذاتی بینک بیلنس ہے۔“

”یہ پیسے کتنے عرصے سے بینک میں پڑے ہوئے ہیں۔“

”آپ یقین کیجئے مجھے کبھی ضرورت ہی نہیں پیش آئی، پاپا نے انہیں میرے نام سے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا تھا، آج تک اکاؤنٹ چیک نہیں کیا گیا۔“

”اور فیض بابا اخراجات کہاں سے پورے کرتے ہیں؟“

”میں نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔“

”کیا آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں گی کہ میں ان لوگوں سے تھوڑی بہت سی معلومات حاصل کروں۔“

”آپ چلیں ٹھیک ہے آپ کر لیجئے۔“

”اگر کوئی تلخ بات ہوئی تو۔“

”میں دیکھ لوں گی، میں آپ کو اختیار دیتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے مس نشاء، ذرا غور کیجئے انہوں نے آپ کو کتنا دنیا سے الگ تھلگ کر کے رکھا ہے۔ کسی سے آپ کا رابطہ نہیں ہونے دیا، آخر کیوں کس کے اشارے پر۔“

پورا دن مشل اور عسکری کے ساتھ گزارا، بڑی خوشی ہو رہی تھی ان دونوں کے ساتھ، بہت عمدہ سا کھانا پکایا تھا مشل نے، میں خود بھی اس کے ساتھ باورچی خانے میں گئی تھی اور میرے لئے یہ زندگی کا بڑا انوکھا تجربہ تھا، پھر دونوں مجھے میری کوٹھی تک چھوڑنے آئے تھے۔ گھر کے ملازمین کے چہروں پر بے چینی تھی لیکن کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ کوئی مجھ سے کوئی سوالات کرے، میرے گھر میں آ کر وہ کافی دیر تک میرے ساتھ بیٹھے اور پھر چلے گئے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ سب کے چہروں پر سوالات ہیں لیکن مجھ سے کسی نے سوال نہیں کیا تھا۔

میں سوچتی رہی نجانے کیا کیا ذہن میں آ رہا تھا، مصر کے عجیب و غریب کردار، پاشا کے سینے کا وہ زخم جو سو فیصد کسی خنجر کا زخم معلوم ہوتا تھا، لیکن پاشا آخر گیا کہاں، بڑا پرعزم اور شاندار نوجوان تھا، پتہ نہیں کیوں مجھے بار بار یاد آ جاتا تھا۔ نجانے کتنی رات گزر گئی۔ نیند پلکوں کو نہ چھونے کی قسم کھائے ہوئے تھی، دل زیادہ گھبرایا تو اٹھ کھڑی ہوئی، باہر نکلی اور بے اختیار لائبریری کی جانب چل پڑی، لائبریری بہت پرسکون جگہ تھی، میں نے روشنی کئے بغیر چاروں طرف دیکھا۔

لیکن اچانک مجھے یوں لگا جیسے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے، ہر چیز تو نظر آ رہی تھی، کتابوں کے

شیلف، میزیں، یہ روشنی درودیوار سے پھوٹ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ تصاویر جو دیواروں پر کندہ تھیں، نقوش میں فراعین مصر کے دربار دکھائے گئے تھے، ان درباروں میں مشعلیں بھی تھیں اور یہی مشعلیں سفید نقطوں کی شکل میں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف پتھر کے بخوردان بنے ہوئے تھے جن سے دھوئیں کی سفید لہریں اٹھ رہی تھیں، لائبریری میں پھیلی ہوئی خوشبو کا مرکز یہی بخوردان تھے، پھر دربار فرعون میں مجھے ایک نقاب پوش عورت نظر آئی۔ اس کا چہرہ نقاب میں پوشیدہ تھا، بس آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ آہ میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نے ان آنکھوں کو متحرک دیکھا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا کہ جیسے میری آمد سے قبل اس دربار میں کوئی اہم کارروائی جاری ہو اور میری بے جا مداخلت پر سب خاموش ہو گئے ہوں، میری واپسی چاہتے ہوں، منتظر ہوں کہ میں چلی جاؤں تو ان کی کارروائی کا آغاز ہو سکے۔ چاروں طرف سے مجھے اسی طرح کے اشارے موصول ہو رہے تھے چنانچہ میں اس وقت لائبریری میں نہ رک سکی اور باہر نکل آئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں واقعی دربار فرعون میں پہنچ گئی ہوں، یہ سب کچھ فریب نہیں تھا، مضمحل قدموں سے کمرے میں واپس آ گئی، ہونٹ سوکھ گئے تھے، گلے میں پیاس سے پھانسیں پڑ رہی تھیں، بیڈروم میں رکھے فریج سے پانی نکالا اور اس سے سینہ ٹھنڈا کرنے لگی، جانے کتنا پانی پی گئی تھی اور اس کے ساتھ بستر پر لیٹ گئی۔

دوسرے دن سخت اضمحلال کا شکار تھی، نجانے کیا ہو گیا تھا، آپا ندیمہ مجھ سے ناشتے کے بارے میں پوچھنے آئی تو میں نے کہا۔

"صرف چائے پیوں گی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا بات ہے نشاء بیٹی؟"

"بس کچھ بھی نہیں ہے آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔"

آپا ندیمہ نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر واپس چلی گئی، پھر وہ میری پسند کا ناشتہ لے آئی، لیکن وہیں رک گئی تھی۔

"کیا بات ہے؟"

"نشاء کچھ بات کر سکتی ہوں تم سے۔"

"جی جی کہیے کیا بات ہے؟"

"بیٹا! ہم سے آپ کا کوئی رشتہ تو نہیں ہے، لیکن کبھی کبھی رشتے خون سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔"

"نہیں آپا ندیمہ مجھے تو دکھ یہ ہے کہ مجھ سے سارے رشتے کیوں چھین لئے گئے، تمہارے بچے تمہیں پیار کرتے ہیں نا، میں بھی ایک نامعلوم تصور سے پیار کرتی ہوں جس کے نقوش تک نہیں پہچانتی میں، بقول تمہارے میں اپنی ماں کو نہیں جانتی، کچھ عرصے پہلے میں اپنے باپ کو جانتی تھی، کیا سمجھیں، لیکن تم نے مجھ سے وہ تصور بھی چھین لیا، کیوں آخر کیوں......؟"

"بیٹی! بس تم خود بتاؤ یہ کیسے کر سکتی تھی میں، میں تو خود شرمندہ ہوں کہ میرے منہ سے حقیقت نکل گئی۔"

اسی وقت ایک ملازمہ آئی اور بولی۔ "عسکری صاحب آئے ہیں۔"

"اوہو کہاں ہیں۔"

"ہم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں آ رہی ہوں۔" میں نے کہا اور تیزی سے بال وغیرہ کو سنوار کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔ اندر عسکری اور مشل دونوں موجود تھے۔ ان لوگوں سے دوبارہ ملاقات ہو گئی تھی، لیکن مجھے ان کے مل جانے کی بے انتہا خوشی تھی، لیکن بہرحال وہ کھڑے ہو کر بولے۔

"ہیلو نشاء کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم ایک دوسرے کی صحت معلوم کریں، آؤ ناشتہ کریں۔"

"ارے تم نے ناشتہ نہیں کیا؟"

"نہیں، بس سوتی رہی ہوں، اصل میں رات کو دیر تک نیند نہیں آئی۔"

"ہم لوگ بھی تمہارے بارے میں سوچتے رہے اور ہمیں احساس ہوا کہ تم بہت زیادہ خطرات میں گھری ہوئی ہو، نجانے تمہارے گرد جال بننے والوں کا منصوبہ کیا ہے۔"

میرا دل ایک دم سے جیسے مٹھی میں جکڑ گیا، مجھے تو ایک بہت ہی مضبوط سہارا ملا تھا، جمال پاشا، جس کے بارے میں یہ سوچتے ہوئے انتہائی دکھ ہوتا تھا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ میرے پاس وسائل ہی کیا تھے جو میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی بہرحال جو کچھ بھی تھا بہت ہی ایسے کردار زندگی میں آتے ہیں جو کبھی نہ بھلائے جانے کے لئے ہوتے ہیں اور خاص طور سے جمال پاشا جو مجھ سے اسی طرح متاثر تھا جس طرح میں، ایسا کم ہی ہوتا ہے اور پھر کس طرح وہ مجھ تک پہنچ گیا، اور پھر کہاں غائب ہو گیا۔

"کیا سوچنے لگیں؟"

"نہیں کوئی خاص بات نہیں، رات کو دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے ذرا سا ذہن الجھا ہوا ہے۔"

"تو چلو تم ناشتہ کرو۔"

"نہیں بس کافی پیوں گی۔"

"بات اصل میں یہ ہے کہ وہ جو کہتے ہیں نا کہ بعض لوگ خدائی فوجدار بن جاتے ہیں، میں ایک بار پھر تمہاری اجازت چاہتا ہوں نشاء، اصل میں، میں ان لوگوں کو منظر عام پر لانا چاہتا ہوں جو تمہاری الجھنوں کا باعث بنے ہوئے ہیں، جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ تمہیں نقصان پہنچانے والے تمہارے اردگرد موجود ہیں اور تم مجھے اجازت دے چکی ہو کہ میں تمہارے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں کروں، اس لئے سب سے پہلے میں تمہارے ملازموں سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک عجیب سا احساس دل سے گزر گیا تھا، یہ لوگ عمر بھر میری غلامی کرتے رہے ہیں، کبھی کسی نے سرکشی کا تصور نہیں کیا، میری سخت روی پر بھی سر نہیں اٹھایا، آج ایک اجنبی شخص ان سے میرے موضوع پر بات کرے گا، لیکن میں کیا کرتی، کچھ بھی نہیں رہا تھا میرے ہاتھ میں، ایک عجیب وغریب شخصیت اختیار کر گئی تھی، پہلے کم از کم یہ سہارا تھا کہ ماں اگر اس دنیا سے چلی گئی ہے تو باپ تو ہے، کتنے مان سے میں تیونس گئی تھی پاپا کے ساتھ، لیکن اس کے بعد سے جو حالات بگڑے تھے تو آج یوں لگتا تھا جیسے میں اس گھر کا فرد ہی نہ ہوں، ملازم اگر چاہتے تو میرے احکامات سے انکار بھی کر سکتے تھے، بہرحال سب کچھ عجیب سا تھا۔ عسکری کی خواہش پر ہم بڑے ہال نما کمرے میں پہنچ گئے، وہاں پہنچ کر میں نے ایک ملازمہ کو آواز دی اور اس سے کہا کہ سب لوگ اندر آ جاؤ اور رفتہ رفتہ سب لوگ اندر آ گئے۔ عسکری نے ان کا تعارف حاصل کیا پھر سب سے پہلے اس نے آپا ندیمہ سے سوال کیا۔

"آپ کب سے یہاں آئی ہیں ندیمہ صاحبہ؟"

"عمر گزر گئی صاحب، جوان آئی تھی بوڑھی ہو گئی۔"

"آپ کے شوہر اور بچے بھی یہیں ہیں؟"

"جی......"

"شوہر کہیں اور نوکری کرتے ہیں؟"

"نہیں۔"

"گویا آپ کا سارا کنبہ یہیں پلتا ہے۔"

"خدا میرے مالک کو سلامت رکھے۔" آپا ندیمہ نے کہا۔

"اور آپ فیض بابا ہیں؟"

"جی......"

آپ کو یہاں کتنا عرصہ گزر گیا"

"اس سے پہلے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" فیض بابا کے لہجے میں شدید زہریلا پن تھا، عسکری چونک کر انہیں دیکھنے لگا، فیض بابا نے رکے بغیر کہا۔

"آپ کون ہیں، پہلے اپنا تعارف کرائیے۔"
"آپ صرف جواب دیں، کوئی سوال نہ کریں کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ مس نشاء میرے ساتھ ہیں۔"
"جی ہاں اتنا کافی تو ہے۔" فیض بابا اسی انداز میں بولے۔
"کافی شاطر معلوم ہوتے ہیں اصل میں مجھے بال کی کھال اتارنی ہے۔"
"مشکل ہوگا صاحب آپ کے لئے۔" فیض بابا نے پتھریلے لہجے میں کہا۔
"میں آپ سے ایک بات کہوں ، مجھے مکمل اختیارات حاصل ہیں۔"
"نہیں، آپ کو کوئی اختیار نہیں ہے، آپ کو زیادہ سے زیادہ یہ رعایت دی جا سکتی ہے کہ دو چار باتیں کریں اور اس کے بعد یہاں سے چلے جائیں۔"
"آپ عسکری صاحب سے بدتمیزی کر رہے ہیں فیض بابا۔"
"ہاں بی بی جانتا ہوں ایسا ہی کر رہا ہوں۔ ایک بات بتائیے ذرا۔" فیض بابا نے کہا
"جی۔"
"یہ صاحب کس حیثیت سے اتنی معلومات حاصل کر رہے ہیں، ان کا اپنا شجرہ نسب کیا ہے؟"
"آپ بہت زیادہ بول رہے ہیں۔"
"ہاں مجھے بولنے دیجئے، پورا غور کر کے ہی میں یہ بات کر رہا ہوں۔"
"دیکھو میں بہت برا آدمی ہوں، تم لوگوں نے جو جال بن رکھا ہے اس کے بارے میں تم سے سوالات کر رہا ہوں اور تمہیں جواب دینا ضروری ہوگا۔"
"دیکھیں صاحب! میں آپ کو بات بتاؤں، ہارون دانش صاحب کا ایک وصیت نامہ ہے جس میں ہم سب لوگوں کو یہ طے کر دیا گیا ہے کہ کون کیا ہے اور کیا رہے گا۔ اس وصیت نامے میں میری جو حیثیت ہے اس کے تحت میں آپ کے کسی سوال کا جواب دینے کے لئے مجبور نہیں ہوں۔" فیض بابا اس وقت بالکل مختلف شخصیت نظر آرہے تھے۔
"تم یوں کیوں نہیں کہتے کہ تم دانش صاحب کی دولت پر عیش کر رہے ہو اور ان سب کو بھی عیش کرا رہے ہو، تم ایک سازشی انسان معلوم ہوتے ہو، مجھے شبہ ہے کہ تم نے ہارون دانش صاحب کو یا تو ہلاک کر دیا ہے یا کہیں قید کر رکھا ہے تاکہ ان کی دولت کو اپنے تصرف میں لاسکو۔"
"میں نے کہا نا آپ اس سلسلے میں قانون کا سہارا لیں، کیا سمجھ کر آپ یہ بات کر رہے ہیں، آؤ ندیمہ آؤ۔" فیض بابا نے کہا اور آپا ندیمہ کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گئے، پھر دروازے پر رک کر دوسرے ملازموں سے بولے۔
"جاؤ تم لوگ اور اپنا اپنا کام کرو یہ میں کہہ رہا ہوں۔"
"اس وقت مجھے یہاں فیض بابا کی حیثیت معلوم ہوئی، تمام ملازمین ان کے پیچھے ہی پیچھے باہر نکل گئے تھے، میں خود بھی سکتے میں رہ گئی تھی، فیض بابا کو ایک انوکھے روپ میں دیکھا تھا، بہت ہی انوکھے روپ میں، ادھر عسکری ایک دم سے شرمندہ سا ہو گیا تھا اس نے ایک گہری سانس لی اور گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
"یہ آدمی کافی چالاک معلوم ہوتا ہے، میرے خیال کی تصدیق ہوگئی ہے۔"
"اس نے آپ کی توہین کی ہے۔ عسکری میں انہیں معاف نہیں کروں گی۔"
"نہیں نہیں، یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے اب میرا کام براہ راست شروع ہو گیا ہے میں دیکھوں گا کہ کون کس کے بل پر اکڑ رہا ہے، بہت سے چالاک انسان ہے یہ بوڑھا سانپ، بظاہر کینچلی میں لپٹا ہوا لیکن سخت زہریلا۔"
"ہم سب اس کمرے سے نکل آئے میں ان لوگوں کو لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو سامنے ہی لائبریری کا دروازہ نظر آیا۔
"وہ۔" عسکری نے اشارہ کیا۔

"ہاں وہ لائبریری ہے، یہیں کے بارے میں میں نے تمہیں بتایا تھا عسکری کہ دو یا تین بار مجھے یہاں پاپا کے سگار کی خوشبو پھیلی ہوئی ملی اور سگار کے ڈبے سے سگار بھی کم تھے۔"
"دیکھ سکتا ہوں میں اسے۔"
"ہاں آجاؤ۔" میں نے کہا اور ہم لوگ لائبریری کی جانب چل پڑے، مجھے فیض بابا پر شدید حیرانی ہو رہی تھی، کمال کی شخصیت نکلی تھی ان کے اندر سے، ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے، کمرے کے اندر کا ماحول جوں کا توں تھا، خاموشی سناٹا، عسکری لائبریری کے بڑے عظیم الشان کمرے میں داخل ہو کر رک گیا، اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر جہاں رکا تھا وہیں ساکت کھڑا رہ گیا۔ البتہ مشل نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔
"یہاں سے باہر نکلو، خدا کے لئے یہاں سے باہر نکلو، چلو جلدی سے، میں، میں جا رہی ہوں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ جلدی سے باہر نکل گئی، مجبوراً مجھے اور عسکری کو بھی باہر نکلنا پڑا تھا۔
"یہ کیا بچپن ہے مشل۔" عسکری نے باہر آکر کہا۔
"اف خدایا، اف میرے خدایا، کیسا ماحول تھا اس جگہ کا۔ لگتا تھا قدیم مصر کے کسی مقبرے میں داخل ہو گئے ہیں ہم، میں نے مصری اہرامین کے بارے میں سنا ہے، وہاں کے ماحول کا تصور کیا ہے، دعوے سے کہتی ہوں کہ وہاں کا ماحول اس جگہ سے مختلف نہیں ہوگا۔ مجھے انتہائی ڈر لگ رہا تھا وہاں، اندر قدم رکھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے جیسے......" مشل نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
"ہاں مس نشاء اب بتائیے کہ کیا کیا جائے۔"
"آپ نے کیا اندازہ لگایا مسٹر عسکری؟"
"یہ بوڑھا ملازم بہت خطرناک آدمی ہے، اگر یہاں کوئی سازش ہو رہی ہے تو اس کا سرغنہ یہی شخص ہے، مجھے غور کرنے دو، بہت سے خیالات دل میں آتے ہیں، خدانخواستہ یہ امکانات بھی ہو سکتے ہیں کہ اس شخص نے تمہارے والد کو قتل کر دیا ہو، جس وصیت نامے کا اس نے تذکرہ کیا ہے ہو سکتا ہے اس نے طاقت کے ذریعے یہ وصیت نامہ حاصل کیا ہو اور اسے کہیں محفوظ کر دیا گیا ہو، ظاہر ہے وہ وصیت نامہ تمہارے لئے ہی ہو سکتا ہے، انہوں نے یہ سارا جال پھیلا کر تمہیں معطل کر دیا ہے اور اب مزے سے وہ اپنی فوج کی ساتھ تمہاری دولت پر عیش کر رہے ہیں، میں ایک بات بتاؤں وہ تمہیں بھی ختم کر دیتا، لیکن اس کے بعد تمہاری دولت پر قبضے کرنے کا کیا جواز ہوتا۔"
"فیض بابا......" میرے منہ سے آہستہ سے نکلا۔
"ہوں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی شخصیت ہی کچھ اور ہو۔"
"میرا ذہن کام نہیں کر رہا عسکری۔" میں نے چکراتے ہوئے کہا۔
"میں نے تم سے کہا نا اپنی ساری پریشانیوں کا ٹھیکہ مجھے دے دو، میری زندگی میں تمہارا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا، کیا سمجھیں؟"
بہت دیر تک ہم باتیں کرتے رہے، پھر میں نے آپا ندیمہ کو بلایا اور انہیں ہدایت کیں کہ مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا جائے، آپا ندیمہ نے اپنا کام بخوبی سرانجام دیا تھا۔ بہترین کھانا بنایا گیا تھا، ڈائننگ ٹیبل پر عسکری نے کہا۔
"یہ غور کرنا ہے کہ آج کے بعد ان لوگوں کا ردعمل کیا ہوگا، بہرحال تم فکر نہ کرنا، میں اب یہاں بھرپور نگاہ رکھوں گا۔"
"تقریباً شام کے چار بجے وہ لوگ چلے گئے میں نے ان سے رکنے کے لئے کہا تھا کہ مگر عسکری کو کچھ اور کام بھی کرنے تھے اس نے کہا تھا کہ وہ رات کو مجھے فون کرے گا ان کے جانے کے بعد میں اداس ہوگئی۔
پتہ نہیں جو کچھ ہوا تھا وہ ٹھیک تھا یا نہیں، ان لوگوں کے ساتھ تو میرا بچپن گزرا تھا، عسکری فیض بابا کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا تھا میرا دل اسے قبول نہیں کر رہا تھا، فیض بابا اور آپا ندیمہ کے ماضی پر نگاہ دوڑاتی تو وہ ہمیشہ

میرے وفادار ہی نظر آتے تھے۔ ساری زندگی گزاری تھی انہوں نے، وہ دنیا میں تنہا تھے، کبھی ان کا کوئی عزیز ان سے ملنے نہیں آیا، کبھی تو کوئی گھر آ سکتا تھا، یا کبھی وہ خود کسی کے پاس چلے جاتے، انہوں نے کس لئے میری دولت پر قبضہ کیا ہوگا، کبھی ایک رات بھی انہوں نے گھر کے باہر نہیں گزاری تھی، بہر حال اس وقت اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کے ساتھ سخت زیادتی ہوئی تھی، خاص طور سے فیض بابا کے ساتھ۔

کوٹھی کے ماحول میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں ہوئی، میرے احکامات کی تعمیل معمول کے مطابق ہو رہی تھی، سب کے چہرے بے شکن تھے۔ رات کو وعدے کے مطابق عسکری کا فون آیا۔

”جی میڈم کیا ہو رہا ہے؟“

”بور ہو رہی ہوں بری طرح آپ لوگ اتنی جلدی چلے گئے، اس کے بعد چہرے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔“

”مجھے احساس ہے اور تم یقین کرو میں ذہنی طور پر شدید الجھا ہوا ہوں تمہارے لئے لیکن......“

”لیکن کیا......؟“

”یہ خیال بھی ہے کہ تم نے نجانے میرے بارے میں کیا تصور قائم کیا ہوگا؟“

”کچھ نہیں، میں اس قدر الجھی ہوئی بلکہ تمہیں کیا کہوں کہ بے سہارا ہوں کہ ذرا سا سہارا بھی میرے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔“

”میں ذرا سا سہارا نہیں ہوں نشاء میں، میں تو بہت آگے بڑھنا چاہتا ہوں، لیکن بہر حال ایک حد مقرر ہوتی ہے ہر انسان کی۔“

”آپ کی حد کس نے مقرر کی ہے۔“ میں نے بے خیالی کے لہجے میں کہا۔

”سوچ لو، یہ الفاظ بہت گہرے ہیں نشاء، یہ میری دنیا تہہ و بالا کر سکتے ہیں۔“

”پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہیں آپ، میں کیا کہوں آپ سے؟“

”کچھ نہیں، لیکن اب جو کچھ ہوگا نشاء ان الفاظ کی روشنی میں ہوگا سمجھیں، آپ مجھے الزام نہیں دیں گی۔“

”ٹھیک ہے نہیں دوں گی بابا۔“

اتنی دیر میں کیوں؟“

”میں وہیں آ کر بتاؤں گا، خدا حافظ۔“

دوسرے دن ٹھیک بارہ بجے عسکری میرے پاس آ گیا۔ براہ راست اندر گھستا چلا آیا تھا اور پھر اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے لباس تبدیل نہیں کیا؟“

”مشل کہاں ہے؟“

”وہ نہیں آئی۔“

”کیوں؟“

”باہر چلیں بتاؤں گا آپ لباس تبدیل کر لیجئے۔“

”باہر جانا ہے؟“

”ہاں۔“

ٹھیک ہے، میں آتی ہوں۔

بہر حال میں نے لباس تبدیل کیا اور باہر آ گئی۔

”مشل کو بتا کر آئے ہیں آپ؟“

”کیا مشل مشل لگا رکھی ہے؟“

”وہ آپ کی منگیتر ہے، برا نہیں مانے گی۔“

”عسکری خاموش ہو گیا، پھر اس نے کہا۔“ میں اس سے بہانہ کر کے باہر نکلا ہوں، میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، ہم کہاں چل رہے ہیں؟“

”ساحل پر۔“

”ایک بات کہوں آپ سے، مجھے بار بار مشل کا خیال آ رہا ہے، اگر اس نے گھر فون کیا یا چلی آئی تو ملازم اسے بتائیں گے کہ میں آپ کے ساتھ باہر نکلی ہوں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ عسکری نے کہا اور عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

(جاری ہے)

منحوس الو

عبدالحمید ساگر - کندیاں

تعویذ کا پانی چھت پر چھڑکتے ہی چھت پر سے آتی ہوئی خوفناک اور وحشت ناک آوازیں اچانک ختم ہوگئیں اور ساتھ ہی عجیب و غریب دل کو دہلاتے ہوئے کالے کالے ہیولے بھی ختم ہوگئے۔

بنائے تو خدا نے ہیں ان پرندوں کو پر یہ گھر اجاڑ کر رکھ دیتے ہیں، کیا یہ حقیقت ہے؟

بازار سے مختلف ضروریات زندگی کی چیزیں خریدنے کے بعد میں شاپر ہاتھوں میں پکڑے جونہی صدیقی بھائی کے کھوکے کے قریب پہنچا! انہوں نے بے اختیار مجھے آواز دی۔ ”احمد بھیا! ہم سے کوئی ناراضگی ہے کیا؟ جو ہمارے کھوکے کے آگے سے خاموشی سے گزر رہے ہو۔“

”ارے نہیں صدیقی بھائی کوئی ناراضگی نہیں ہے۔ بس ذرا مصروفیت زیادہ ہے آج کل، وقت بالکل نہیں ملتا ہے۔“ میں نے شرمندگی سے جواب دیا۔

صدیقی بھائی کا گلہ ٹھیک تھا۔ میں ان سے اکثر مختلف موضوعات پر گپ شپ کرتا تھا اور کبھی کبھی شام کو وقت گزاری کے لئے ان کے کھوکھے پر آ کر بیٹھتا تھا۔ ان کا پورا نام آصف صدیقی تھا۔ لیکن میں ان کو صدیقی بھائی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ یہ پان سگریٹ اور اس قسم کی

دوسری چیزیں اپنے کھوکھے پر بیچتے تھے۔ صدیقی بھائی خود پچاس برس کے قریب کلین شیو آدمی تھے۔

''احمد بھیا! دوستوں کے لئے وقت تو نکالنا پڑتا ہے۔ ورنہ پھر تو دوستی ختم ہوجاتی ہے، اور دوست ناراض ہوجاتے ہیں۔'' میری بات سن کر صدیقی بھائی نے کہا۔ میں ان کے کھوکھے کے بالکل قریب آ گیا تھا۔

''صدیقی بھائی آج مجھے معاف کردیں۔ آج ذرا جلدی میں ہوں، ان شاء اللہ جلد چکر لگاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ میری بات سن کر صدیقی بھائی نے ہاں میں مسکرا کر سر ہلایا، اور میں وہاں سے چل دیا۔

میں گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ میں نے جھگڑے کی آواز سنی۔ امی اور ابا کسی بات پر لڑ جھگڑ رہے تھے۔ ''نہیں رہنا، تمہارے پاس۔ تم نے میری جوانی کے اٹھارہ سال اذیت میں گزار دیئے، شروع میں ان بچوں کی وجہ سے خاموش تھی میں، لیکن اب بچے بڑے ہوگئے ہیں۔ اچھا کیا ہے برا کیا ہے سب سمجھتے ہیں۔'' یہ کہہ کر امی رونے لگیں۔

''امی!'' میں نے کہا تو وہ بھاگیں اور بے اختیار میرے گلے لگ گئیں۔ ''احمد بیٹا! ساری عمر تمہارے باپ کی غلامی میں زندگی گزار دی، اور آج تمہارا باپ مجھے قصوروار سمجھتا ہے۔ آج جب ہماری غربت کی وجہ سے ہمیں تمام رشتہ داروں نے اکیلا بے سہارا چھوڑ دیا ہے، تو تمہارا باپ مجھے قصوروار سمجھتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر میں عورت ہوتی تو سارے لوگوں سے رشتہ داریاں نبھاتی وہ ہمیں چھوڑ کر نہ جاتے۔''

''امی نہ روئیں، میرے ہوتے ہوئے آپ کو ابو کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' میں نے کہا۔ اور امی کو اندر کمرے میں لے گیا۔ میں نے ابا سے کوئی بات نہیں کی کیونکہ ان سے بات کرنا فضول تھی۔ ان سے بات کرنا دیوار سے بات کرنا تھا۔ وہ ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ میری امی کی بات ٹھیک تھی۔ وہ ہمیشہ ہمارے بھلے کا سوچتی تھیں۔ ابا بس اپنی فتح ڈھونڈتے رہتے تھے۔ کبھی ہمارے بارے میں، نہیں سوچا تھا۔

میں نے چھوٹی بہن عاشی کو آواز دی جس کی عمر چودہ سال تھی۔ ''جو سامان لایا ہوں۔ وہ سنبھال لو۔''

''جی بھائی'' عاشی نے جواب دیا۔

عاشی کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا اپنے بارے میں، اپنی ماں کے بارے میں اسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اپنا ماضی یاد آ گیا۔

میں سندھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ میری ماں یتیم تھی۔ اس کی شادی، اس کے ظالم بھائیوں نے بغیر سوچے سمجھے پیسوں کی خاطر ایک ایسے شخص کے ساتھ کردی جو پڑھا لکھا تھا، لیکن ان پڑھ کے برابر۔ نور خان تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ نور خان کی ماں یعنی میری دادی شروع سے ہی اپنی تین بیٹیوں کی طرف داری کرتی تھی۔ اور بیٹے کے متعلق کچھ نہ سوچتی تھی۔ اس نے بیٹے کو مشکل سے دس جماعتیں تو پڑھادی تھیں لیکن کبھی بیٹے کو پاس بیٹھا کر زندگی کے اصول نہیں سمجھائے۔ میرے دادا میں بھی یہی عادتیں پائی جاتی تھیں اس لئے جب میں پیدا ہوا تو ماں کے علاوہ کسی نے میری تعلیم وتربیت پر توجہ نہیں دی۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب گاؤں کے دوسرے لڑکے میرے ہاتھوں سے بسکٹ اور ٹافیاں لے کر بھاگ جاتے تھے تو میری ماں ان کے گھر پہنچ جاتی۔ عجیب سادگی تھی، عجیب ماحول تھا۔ اسی ماحول میں، میں نے پانچ جماعتیں پاس کیں، میرے ابا ریلوے میں ایک معمولی عہدے پر تھے۔ تنخواہ سے مشکل ہی گزارا ہوتا تھا۔ لیکن میانہ روی کی زندگی گزارتے گزارتے، آخرکار میں نے بی۔ اے پاس کرلیا۔ میری ایک بہن میری پیدائش کے تین سال بعد پیدا ہوئی، اور میں نے بھی مصیبتیں دیکھیں جو میری ماں اور میں نے برداشت کیں۔ میرے ابا نے اس مرحلے میں کبھی میری ماں کو سکھ نہیں دیا۔ بس شہر لے کر آنے اور ہمیں پڑھانے کے طعنے دیتے رہے، لیکن میری ماں برداشت کرتی رہی۔

آج جب ہم سوچنے سمجھنے کے قابل ہیں۔ لیکن پھر بھی ابا نہیں بدلے، وہی پرانی اور فرسودہ سوچ ہے ان کی۔

ہماری غربت اور ہمارے حالات دیکھ کر تمام رشتہ داروں نے ہم سے منہ موڑ لیا۔ اور ابا ان تمام باتوں کا ذمہ دار میری ماں کو سمجھتے ہیں۔

''بھائی۔'' عاشی کی آواز سن کر میں چونک گیا۔

''چائے'' عاشی نے مجھے چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا۔ امی اس دوران سوگئی تھیں۔ ہمارے بارے میں سوچتے سوچتے جب انہیں کوئی راہ نظر نہیں آتی تو نیند ان پر غالب آجاتی تھی اور وہ سوجاتی تھیں۔

چند دنوں بعد ڈاکیہ ایک لفافہ لے کر آیا۔ عاشی نے وصول کیا تھا۔ وہ میرے پاس لے کر آئی۔ ''بھائی، کھولو تو پتہ نہیں کیا ہے آپ کے نام پر آیا ہے۔'' میں نے کھولا تو خوشی سے میں اچھل پڑا۔ وہ میری نوکری کا لیٹر تھا۔ میں نے شہر میں موجود ادویات کی ایک فیکٹری میں اپنے کاغذات بھیجے تھے۔ اور آج میری نوکری لگ گئی تھی۔ یہ میرے لئے بہت خوشی کی بات تھی۔ میں نے عاشی، ابو اور امی دونوں کو بتایا، امی بہت خوش تھیں۔ لیکن ابا کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ وہ بس ہلکے سے مسکرا دیئے۔

جس صبح میں نے فیکٹری جانا تھا، میں صبح جلدی اٹھا، اور ناشتہ کر کے فیکٹری کے لئے تیار ہوا۔ لیکن میں اس دن کام پر نہ جاسکا، اچانک امی کے پیٹ میں درد شروع ہوا اور مسلسل بڑھتا چلا گیا، اس بری طرح چیخ رہی تھیں، میں حیران تھا، پریشان تھا، ایسا پہلے کبھی امی کو محسوس نہ ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے پڑوس کے ایک لڑکے سے موٹر سائیکل کے لیے کہا لیکن میری قسمت کہ موٹر سائیکل نہیں تھی مجبوری سے میں ہانپتا ہوا بھاگا اور ایک رکشہ پکڑ لایا اور امی کو بیٹھا کر اسپتال لے گیا۔

ضروری علاج کے بعد میں امی کو گھر لے آیا۔ ڈاکٹر نے کچھ ادویات بھی دی تھیں۔ ڈاکٹر نے درد کی وجہ بتانے سے لاعلمی ظاہر کی تھی۔ ڈاکٹر کے مطابق امی بالکل ٹھیک تھیں۔ درد، وقتی کسی وجہ سے ہوا تھا۔

اگلے دن میں فیکٹری گیا مجھے میڈم ماریہ نے خوش آمدید کہا وہ میڈیسن کی ایم ڈی تھی۔ اور تمام فیکٹری کو خود چلاتی تھی، مجھے ایک کلرک کی نوکری ملی تھی۔ جو کہ میری گزر بسر کے لئے کافی نہیں تھی۔ لیکن نہ ہونے سے اچھی تھی۔ میں نوکری کرتا رہا۔

وقت گزرتا گیا، اس دوران صدیقی بھائی سے بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک دن امی عاشی اور میں گھر میں تھے۔ ابا پتہ نہیں کہیں گئے ہوئے تھے۔ اچانک کالی گھٹا چھا گئی، بادل گرجنے لگے۔ اور چند منٹ میں ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ بارش تقریباً چار گھنٹے لگاتار جاری رہی، اس دوران جب میں نے امی کو دیکھا۔ وہ تمام چھوٹے موٹے برتن کمرے بارش کے قطروں کے آگے رکھ رہی تھیں۔ کمرے کی چھت جگہ جگہ سے ٹپک رہی تھی اور امی کبھی وہاں برتن رکھتیں۔ اور کبھی یہاں اس دوران میں نے امی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے، پھر وہ بولیں۔ ''احمد بیٹا، کوئی اور عورت ان حالات میں تمہارے ابا کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی تھی، لیکن میں نے سب کچھ برداشت کیا ہے اور اب بھی گزاروں گی۔ آج ہمارا ذاتی گھر نہیں ہے۔ آج ہماری حالت دیکھو کہاں جاؤں میں؟'' یہ کہہ کر آنسو بہانے لگیں۔

''امی صبر کریں ہم نیا گھر لے لیں گے آپ نہ روئیں ورنہ عاشی بھی رو دے گی۔'' امی کو روتے ہوئے دیکھ کر عاشی بھی رونے لگی تھی۔ عاشی کا سن کر امی اس سے لپٹ گئیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آنسو پی گئیں۔

وقت رکتا نہیں، تیزی سے گزر جاتا ہے۔ اور کسی کو زخم اور کسی کو مرہم دے جاتا ہے۔ وہ اتوار کی شام تھی۔ جب میں گھر پہنچا۔ غالباً میں صدیقی بھائی کے کھوکھے پر بیٹھا تھا۔ گھر پہنچتے ہی میں نے دیکھا۔ عاشی رو رہی تھی۔ امی کے سینے سے لپٹی ہوئی تھی۔ عاشی بھاگ کر میرے سینے سے لپٹ گئی۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ لیکن ابا بالکل نارمل خاموش تھے۔ ''عاشی روتی ہی رہو گی یا کچھ بتاؤ گی بھی؟''

”بھیا! آج...... آج...... وہ کئی دنوں سے میرا راستے میں پیچھا کرتا تھا۔ مجھے تنگ کرتا تھا۔ آوازیں کستا تھا۔ سیٹیاں مارتا تھا۔ لیکن میں سر جھکا کر چلتی رہی۔ وہ کسی بڑے گھر کی بگڑی ہوئی اولاد ہے۔ جو مجھے بدنام کرنے پر تلا ہوا ہے۔ میں نے ہمیشہ پرواہ نہیں کی۔ لیکن آج وہ میرے گھر تک آیا۔ امی کے سامنے میرا ہاتھ پکڑا، مجھ سے بدتمیزی کی، گھر کے اندر۔ آج ہم اتنے کمزور ہیں کہ گھر کے اندر لوگ ہمیں تنگ کرنے آگئے ہیں۔“

”ابا گھر میں تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”ن...... نہیں......“ عاشی بولی۔ ”ابو کون ہے یہ آدمی؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا پتہ کون ہے۔ اور یہ جو بتا رہی ہے کہ کوئی امیر زادا ہے۔ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔؟“ ابا ڈھٹائی سے بولے۔

”تو کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے یونہی بیٹھے رہیں گے؟“ میں نے غصے میں کہا۔

”تو کیا کروں، قتل کردوں اسے پھانسی پر چڑھ جاؤں؟“

”آپ سے بات کرنا فضول ہے ابا۔“ میں نے کہا۔ اور عاشی کو لے کر نزدیکی پولیس اسٹیشن گیا اور اس بدتمیز لڑکے کے خلاف رپورٹ درج کروائی۔ ”وہ کافی بڑے باپ کی اولاد ہے۔ ہم کچھ خاص کارروائی کر نہیں سکتے۔ لیکن پیار سے سمجھا دیں گے اسے۔“ تھانیدار نے بتایا۔ جو مجھے شکل سے شریف نظر آرہا تھا۔

”صاحب آپ جو بھی کریں، بس ہم شریف لوگ ہیں اور شرافت سے رہنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہماری حفاظت آپ لوگوں پر فرض ہے۔“ میں نے کہا۔

”دیکھئے جناب! میں نے کہا ناں کہ آپ بے فکر ہو جائیں۔ ہم سمجھا دیں گے اسے۔“ تھانے دار تھوڑا غصے سے بولا۔

ہم تھانے سے واپس گھر آگئے۔ امی پریشان تھیں۔ انہیں تسلی دی۔

اس واقعے کے چند دن تک وہ بدمعاش لڑکا نظر نہیں آیا۔ ہم سب سمجھنے لگے کہ پولیس نے اسے سمجھا دیا ہے۔ میں اس دوران فیکٹری باقاعدگی سے جاتا رہا تھا۔ میڈم ماریہ بہت اچھی خاتون تھیں۔ تیس سالہ خوبصورت عورت وہ مجھ پر بہت مہربان تھیں۔ ایک شام میں فیکٹری سے جلد لوٹ آیا تھا۔ میں گھر میں تھا۔ جب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ عاشی نے دروازہ کھولا تو ایک چیخ ماری۔

”بھیا!“ میں جلدی سے دروازے کی طرف لپکا۔ عاشی دروازہ کھلا چھوڑ آئی تھی۔ ایک نوجوان اندر داخل ہو گیا تھا۔ چوبیس پچیس سال کا مونچھوں والا نہتا ہمارے گھر میں ایسے داخل ہوا جیسے اس کے باپ کا گھر ہو۔ ”اوئے تو آج پڑھنے نہیں گئی دل گھبرایا، اس لئے تیرا پوچھنے آگیا۔“ وہ مجھے نظر انداز کرتے ہوئے بدتمیزی سے بولا۔ جیسے میں اس کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

”بھیا یہی ہے۔ یہی ہے وہ بدمعاش۔“ عاشی چیختے ہوئے بولی۔ میں نے نہ دیکھا اور نہ سنا۔ میں جیسے آگ بگولا ہو گیا۔ میں نے گھونسوں، مکوں، اور لاتوں سے اس کا استقبال کیا۔ اسے بری طرح پیٹا، اتنی بری طرح سے کہ اس نے بھاگنے میں خیریت چاہی۔

لیکن اگلے دن میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا۔ ہمارے ملک میں شاید الٹا، قانون چلتا ہے۔ پیسوں کے زور سے سچ کو جھوٹ، اور جھوٹ کو سچ ثابت کر دیا تھا۔ پتہ نہیں میڈم ماریہ کو کس نے خبر دی تو انہوں نے میری ضمانت کرائی، اور میں گھر آگیا۔

دوسرے دن میں صدیقی بھائی کی دکان پر گیا۔

”صدیقی بھائی! سمجھ نہیں آتی کہ اپنے حالات گردش میں کیوں ہیں؟ جو بھی کام سیدھا کرتا ہوں وہ الٹا ہو جاتا ہے۔ گھر میں خیر خیریت، سکون نہیں رہتا۔ پتہ نہیں میری قسمت خراب ہے یا کیا چکر ہے؟ مجھے سکون نصیب نہیں ہوتا۔“

میں صدیقی بھائی کے پاس ان سے باتیں کر رہا تھا۔

”احمد بھیا! اکثر ایسا ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ جب اس کی طرف سے دیر ہو، حکم نہ ہو تو جلدی کی امید کرنا فضول ہے۔“

”لیکن! میں نے تو سنا ہے کہ آدمی اپنی قسمت خود بناتا ہے۔ اسے چاہیے کہ محنت کرے اور پھل حاصل کرے۔“ میں حیرانگی سے بولا۔

”ارے احمد بھیا! دنیا میں محنت کا پھل بھی خدا کی مرضی سے ملتا ہے۔ یعنی ہوتا تو وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔“ صدیقی بھائی نے کہا۔

چند منٹ باتیں کرنے کے بعد میں گھر آگیا۔

اگلی صبح میں فیکٹری کے لئے تیار ہوا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں چھتری لے کر نکلا، گلی میں ہمارے محلے کی وہ لڑکی نظر آئی جو اکثر اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی ہو کر میری راہ تکا کرتی تھی۔ اس کی عمر بیس سے اوپر کی لگتی تھی۔ میں نے کبھی بھی اس پر توجہ نہیں دی۔ لیکن اس دن نہ جانے مجھے کیا ہوا بارش میں بھیگتے ہوئے بھی میں رک گیا اور اس کو دیکھنے لگا کیونکہ وہ مجھے دیکھ کر رک گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سبزی کا تھیلا تھا صبح صبح نہ جانے کہاں سے لائی تھی۔ مجھے دیکھتے دیکھتے اچانک بولی۔ ”احمد کام پر جا رہے ہو؟“ اس کی آنکھوں میں ایک امید تھی۔ ایک چمک تھی۔

”ہاں اور تم“ نہ جانے میں نے کیوں پوچھا۔

”میں سبزی لے کر آئی ہوں۔ ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”اچھا میرے لائق کوئی حکم ہو تو بتاؤ۔“

”ماں کے لئے دوائی لانی ہے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے دوا کی پرچی مجھے دے دو، میں دوا لے آتا ہوں۔ کیا بیماری ہے ماں کو؟“

”شدت کا بخار ہے اور پورے بدن میں درد بھی ہے۔“ اس کو تسلی دیتے ہوئے بارش کے باوجود میڈیکل اسٹور کی جانب چلا گیا بڑی مشکلوں سے بخار کی دوائی ملی اور تھوڑی دیر بعد دوا لے کر واپس آگیا۔ میں

نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تیز بارش ہو رہی تھی۔ چند منٹ بعد اس نے دروازہ کھولا۔ ''یہ لو دوائی۔'' میں نے کہا

''احمد آپ اندر نہیں آئیں گے'' اس نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

''نہیں ...... مجھے جانا ہے۔ فیکٹری سے لیٹ ہو جاؤں گا۔'' اور واپسی کے لئے مڑا۔ اس نے آواز دی۔ ''احمد! احمد بہت بہت شکریہ...... میں آپ کی احسان مند رہوں گی۔''

حالات یونہی چلتے رہے۔ وقت گزرتا رہا۔ وہ ایک سہانی شام تھی۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چھا گیا تھا میں جب اپنے گھر کے قریب آیا تو مجھے پرندوں کے شور کی آواز سنائی دی۔ عجیب آواز تھی۔ ایسی آواز پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ میں جونہی دروازے کے قریب آیا مجھے اپنے گھر کی چھت پر دو عجیب سے پرندے نظر آئے۔ وہ شور مچا رہے تھے۔ ذرا واضح دیکھا تو پتہ چلا وہ تو الو ہیں۔ میں نے پتھر مارا تو وہ اڑ کر دوسری طرف چلے گئے لیکن کچھ دیر بعد اڑ کر پھر آ گئے۔ میں اندر چلا گیا۔ اور ان پر کچھ خاص توجہ نہ دی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب مجھے سخت پیاس محسوس ہوئی۔ میں پانی پینے کی غرض سے کمرے سے باہر نکلا تو دیکھا۔ کر، کر، کر...... کی آواز سنائی دی، جب اس طرف دیکھا تو دو الو چھجے پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اڑ کر چھت کی پچھلی سائیڈ پر چلے گئے۔

''انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا۔ اور کمرے میں جا کر سو گیا۔

اس سے اگلے دن شام کے وقت میں صدیقی بھائی کے پاس گیا تو باتوں باتوں میں الوؤں کا ذکر نکل گیا۔ ''صبر کرو احمد بھیا...... صبر کرو۔ کیا کہا تم نے الو...... ارے نام مت لو ان منحوسوں کا...... نام مت لو بہت منحوس اور خبیث پرندے ہیں۔ بنائے تو خدا نے ہیں۔ پر یہ گھر اجاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ان سے تو لوگ پناہ مانگتے ہیں۔'' انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔

صدیقی بھائی کی بات سن کر ڈر کے مارے تمام بات میں نے ان کو بتا دی۔

وہ کہنے لگے۔ ''بس میاں...... بس تم بڑے عذاب سے بچ گئے ہو۔ اب تمہیں کچھ کرنا ہوگا۔ یہ جو گردش میں ہیں نا تمہارے ستارے یہ ان الوؤں کا بدولت ہیں۔ تمہارے گھر کے تمام حالات قدم قدم پر پریشانی، ہر کام میں رکاوٹ، مجھے ان الوؤں کی کارستانی لگتی ہے۔''

''میں کیا کروں صدیقی بھائی، ویسے یہ الو تو اب نظر آئے ہیں پہلے تو نہ تھے۔'' میں نے پریشانی سے کہا۔

''ارے میاں! شکر کرو کہ تمہیں نظر آ گئے نہ جانے کب سے ڈیرا لگا کر بیٹھے ہوں گے تمہارے گھر پر۔''

''صدیقی بھائی اب مسئلے کا حل کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بھیا کسی اللہ والے کے پاس جاؤ۔ یہ منحوس پرندے ہیں۔ ایسے تمہاری جان نہیں چھوڑیں گے۔''

میں سوچتے سوچتے گھر آیا۔ اندھیرا تھا۔ دیکھا تو کر کر لگائے بیٹھے تھے۔ میں نے ایک زوردار آواز لگاتے ہوئے ان کو پتھر مارا تو اڑ کر دوسری جانب چلے گئے۔ میں پریشانی کے عالم میں تھا۔ تمام بات امی کو بتا دی۔ امی بھی بہت پریشان تھیں۔ کہنے لگی۔ ''احمد بیٹا! کچھ کرو، تاکہ ان سے جان چھوٹے اور ہمارے دن پھر جائیں۔ یہ بات تو عیاں ہے کہ ہمارے گھر میں نحوست پھیلی ہوئی ہے۔'' میں خاموش رہا۔

اگلے دن صدیقی بھائی کے پاس گیا اور مدد چاہی۔ ''میاں ایک شخص ہے جو تمہاری طرح میرا دوست ہے۔ اس کو میں جانتا ہوں۔ وہ ایک بزرگ کو جانتا ہے جو بہت اللہ والے ہیں۔ اور دنیاوی چیزوں سے دور رہتے ہیں۔ میں تمہیں ان کے ساتھ ملا دیتا ہوں۔ بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا'' صدیقی بھائی گاہکوں کو نمٹاتے ہوئے بولے۔

''صدیقی بھائی میں بہت ممنون رہوں گا آپ کا۔''

ارے احمد بھیا! میں نے کہا تھا ناں کہ دوست دوست کے کام آتے ہیں۔ لیکن دوستوں کے لئے

وقت کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ دوست ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ بس میں یہ کچھ گاہک نمٹا لوں تو چلتے ہیں۔'' صدیقی بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ جواباً میں نے بھی ہنس دیا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہم روانہ ہوئے۔ پہلے بس اور پھر ایک تانگے پر سفر کیا آبادی سے دور وہ کوئی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ کچی اور پکی دونوں آبادی تھی۔ صدیقی بھائی اور میں تانگے سے اتر کر کچی سڑک پر پیدل چلنے لگے۔ اور درختوں کے جھنڈ میں سے گزرتے ہوئے ایک گھر کے دروازے پر رکے۔ اس گھر کا آدھا حصہ پکا اور آدھا کچا تھا۔ صدیقی بھائی نے آواز لگائی۔ ''مختار بھائی!'' اور دروازہ بھی کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد ایک مونچھوں والا ادھیڑ عمر آدمی باہر نکلا۔ باتوں کے بعد صدیقی بھائی نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ اسی دوران وہ ہمیں گھر کے سامنے موجود گھنے درختوں کے نیچے چارپائیوں پر بٹھا چکا تھا۔'' صدیقی بھائی، بالکل میں ایک ایسے بزرگ کو جانتا ہوں۔ ان کے پاس اگر آپ چاہیں گے تو آپ کا کام ضرور ہوگا۔ وہ یہیں تھوڑے فاصلے پر رہتے ہیں۔ ہماری طرح عام آدمی ہیں۔ لیکن خدا نے ان کو نواز رکھا ہے۔

ان کا نام کریم بخش ہے۔ بڑے صوفی بزرگ ہیں۔ میں آپ لوگوں کو لے چلتا ہوں۔'' تھوڑی دیر بعد ہم دونوں اس کے ساتھ چل پڑے۔ ایک گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد ہمیں دور کچھ کچے مکان نظر آئے۔ قریب پہنچے تو پرانی لکڑی کا بڑا دروازہ تھا۔ جو کہ کھلا تھا۔ ہم اندر چلے گئے۔ سامنے بہت بڑا برآمدہ تھا۔ جس میں چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بہت سے عقیدت مند وہاں بیٹھے تھے۔ ہم تینوں بھی وہاں بیٹھ گئے۔ پاس رکھے ہوئے گھڑے سے پانی پیا تو عجیب سا سکون ملا۔

''صدیقی بھائی۔ مجھے تو یہاں آ کر عجیب سا سکون ملا ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بے شک، بے شک اللہ والوں کے پاس ایسا محسوس ہوتا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

اتنے میں ایک سفید داڑھی والے بزرگ آئے جنہوں نے سفید کرتا پہنا ہوا تھا۔ پاؤں میں ربڑ کی چپل تھی۔ ایک سفید شال لئے ہوئے تھے۔ اور سر پر سفید ٹوپی تھی۔ ان کے آتے ہی تمام لوگ کھڑے ہو گئے۔ جب انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو سب بیٹھ گئے۔ باری باری تمام لوگوں کے مسائل سنے، کسی کو وظیفہ بتایا تو کسی کو تعویذ لکھ کر دیا، اور کسی کو دم کیا۔

ہماری باری آنے پر تمام مسئلہ سننے کے بعد انہوں نے اپنے پاس پڑی ہوئی ایک موٹی کتاب تقریباً دس منٹ تک الٹ پلٹ کی، پھر اٹھے اور جس راستے سے آئے تھے وہاں سے چلے گئے کچھ دیر بعد آ کر بیٹھے تو ان کے ہاتھ میں ایک اور پرانی سی کتاب تھی۔ کچھ دیر اس کا مطالعہ اور ورق گردانی کے بعد بولے۔ ''احمد آپ کا نام ہے؟'' میں نے کہا۔ ''جی۔''

''آپ کے والد کا نام نور خان ہے؟''

''جی۔''

''آپ کی ایک بہن بھی ہے؟''

''جج...... جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ پھر بزرگ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد کتاب بند کرتے ہوئے بولے۔ ''تم...... بہت خوش قسمت ہو۔ نہ جانے تم نے ایسی کیا نیکی کی ہے یا کر رہے ہو جو خدا کو پسند ہے۔ جس کی وجہ سے تم بچ گئے۔ تم بہت بڑی مصیبت سے باہر نکل گئے۔''

صدیقی بھائی میرے ہمراہ بیٹھے تھے۔ اور حیران تھے۔ میری بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے امید بھری نظروں سے بزرگ کو دیکھا۔ اور کہا۔ ''آپ اللہ والے بزرگ ہیں۔ مجھے آسان الفاظ میں بتائیں۔ خدا آپ کا بھلا کرے گا۔''

وہ ایک لمبی سانس لے کر بولے۔ ''یہ الو خود بخود تمہارے گھر پر نہیں آئے بلکہ ایک خاص عمل کے ذریعے بھیجے گئے ہیں۔ طویل عرصے سے تمہارے گھر کے پاس ایک پرانے شیشم کے درخت میں موجود ایک سوراخ

میں رہتے تھے۔ لیکن خدا شاید تمہیں بچانا چاہتا تھا۔ کسی نے وہ درخت جڑ سے کاٹ دیا اور پھر الو تمہارے گھر کے پچھلے برآمدے کی چھت کے ساتھ موجود ایک پرانے سوراخ میں چلے گئے۔ لیکن اس دوران تمہیں نظر آگئے۔ اور تم میرے پاس پہنچ گئے۔"

میں نے کہا۔ "باباجی آپ کی مہربانی ہوگی کہ آپ واضح طور پر مجھے بتادیں۔"

"یہ بات شاید تم جانتے ہوگے۔ تمہارے گھر میں غربت ہے، افلاس ہے، مسائل ہیں۔ پریشانی ہے۔ تمہاری ماں اور باپ کے بیچ لڑائی جھگڑا ہوتا ہے۔ تمہارا باپ شروع سے ہی تلخ مزاج کا ہے، لیکن اتنا بھی نہیں زیادہ اثر الوؤں کی وجہ سے ہے۔ تمہارے ستارے گردش میں ہیں۔ تم خود گردش میں اور تمہارے حالات گردش میں۔ یہ سب تمہارے رشتہ داروں نے جو تمہارے آبائی گاؤں میں رہتے ہیں اور تمہارے باپ کے خاندان سے ہیں۔ انہوں نے ایک خاص عمل کروایا ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت جادو ٹونے ہوئے ہیں۔ جن کی وجہ سے تم لوگوں کے حالات بہت خراب ہوئے۔ لیکن یہ الوؤں والا کام بہت خطرناک ہے۔ ان الوؤں پر شیطانی عمل کر کے زبردستی تم لوگوں کے گھر پر بیٹھایا گیا ہے۔ الو ایک ایسا پرندہ ہے جو بنایا تو خدا نے ہے پر انتہائی منحوس ہے۔ اور گھر اجاڑ دیتا ہے۔ عنقریب تمہاری والدہ بیمار ہو کر دم توڑ جاتیں لیکن انشاء اللہ سب حالات ٹھیک ہوجائیں گے۔

تم جس فیکٹری میں کام کرتے ہو وہاں ایک ماریہ نام کی عورت ہے؟"

"ج...... جی......" بمشکل میں نے کہا۔ "وہ تم پر بہت مہربان ہے اور عورت مہربان تب ہوتی ہے جب اس کے دل میں کچھ ہو۔ وہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن ان منحوس الوؤں کی نحوست نے اس کی زبان بند کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے محلے کی ایک غریب لڑکی ہے۔ اس کا نام رخسانہ ہے۔ وہ بھی تمہاری راہ دیکھتی ہے۔ تمہارے لئے وہ رشتہ بہتر رہے گا۔ تمہاری مرضی ہے۔ میں کچھ تعویذ بنا کر دیتا ہوں۔ انہیں جلا کر ان کی راکھ چھت پر پھینک دینا۔ اور کسی برتن میں پانی لاؤ۔ میں دم کر کے دوں گا وہ گھر میں چھڑکنا تو الو واپس چلے جائیں گے۔"

"باباجی ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ کیا ہم سے کسی کی کوئی دشمنی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"احمد! تمہارے باپ کا خاندان تمہاری ماں کے شروع سے خلاف ہے، اور وہ تمہاری ماں کو اور تم لوگوں کو ترقی کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، بس یہی وجہ ہے۔"

میں نے ان بزرگ سے تعویذ اور دم کیا ہوا پانی لیا۔ ایک درس گاہ میں بچے قرآن شریف پڑھتے تھے۔ حسب توفیق خیرات اور گھر آکر بزرگ کے کہنے کے مطابق تعویذ جلائے اور پانی چھڑکا، عمل تین دن کا تھا۔

تین دن بعد کی صبح بہت سہانی تھی۔ تازہ ہوا چل رہی تھی۔ اس دن بہت زور کی ہوا چلی، میں نے گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں۔ ان تین دنوں میں دوبارہ الوؤں کی کِرکِر نہیں سنی تھی۔ اور نہ ہی وہ کہیں نظر آئے۔

باباجی کی بات ٹھیک تھی۔ آہستہ آہستہ ہمارے حالات بہتر ہوتے چلے گئے اور فیکٹری میں میری ترقی ہوگئی۔ ابا، اماں کی لڑائی بھی ختم ہوگئی تھی۔ چند دنوں بعد خود بخود عاشی کے لئے ایک اچھے گھر کا رشتہ آیا اور ہم نے اس کی شادی کردی۔ میڈم ماریہ نے مجھ سے شادی کی بات کی۔ لیکن میں نے انکار کردیا۔ اس بات سے ان کی مہربانی میں کمی نہیں آئی بلکہ وہ مزید عزت کرنے لگیں، میں نے عاشی کی شادی کے چند دن بعد امی کو رخسانہ کے گھر بھیجا اور اس سے شادی کرلی۔ آج بھی میں اور صدیقی بھائی گہرے دوست ہیں۔ میں ان کا بہت ممنون ہوں کیونکہ ان کی وجہ سے منحوس الوؤں سے ہماری جان چھوٹ گئی۔

صفحہ نمبر 310

مدثر بخاری۔ شہر سلطان

کمرے میں اچانک گھٹا ٹوپ اندھیرا چھاگیا اور پھر ایک کونے میں ایک ہیولہ نمودار ہوا، وہ غضبناک حالت میں تھا، اس کی آنکھیں جیسے انگارہ اگل رہی تھیں، ساتھ ھی ایک دلخراش چیخ......

لفظ لفظ...... سطر سطر جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتی...... کرب و اذیت میں ڈوبی کہانی

لاش کی کنڈیشن دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... چہرہ کسی سفید لٹھے کی مانند...... ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے لاش کے مردہ جسم سے خون نچوڑ لیا گیا ہو...... حیرت کی بات یہ ہے کہ لاش کے جسم پر آلۂ قتل یا اخراج خون کا کوئی نشان تک نہ تھا...... نبض کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا جیسے قتل کرنے والے نے انتہائی بے دردی سے اس لڑکی کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا......

ایک بات تو پوسٹ مارٹم سے پہلے میری عقل میں آچکی تھی کہ مقتولہ کی موت خون کی کمی کی وجہ سے ہوئی ہے...... پر جو بات حیران کن تھی کہ ہمیں کہیں بھی مقتولہ کے جسم سے اخراج خون یا آلہ قتل کے استعمال کا ثبوت نہیں ملا تھا......

میں آفس میں کسی فائل کے لفظوں اور ان کی

پیچدگیوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی مترنم گھنٹی نے مجھے فائل سے دومنٹ کے لئے کنارہ کشی پر مجبور کردیا۔

”بخاری اسپیکنگ ......!“ میں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا......

”سر......! غضب ہوگیا......“ گلشن ٹاؤن میں ایک نوجوان لڑکی کی لاش اس کے گھر سے ملی ہے......معاملہ پیچیدہ ہے ......آپ پلیز...... جائے وقوعہ پر پہنچیں......“ آواز اجنبی اور نامانوس تھی......

”آپ مجھے گلشن ٹاؤن میں گلی نمبر اور گھر نمبر بتا سکتے ہیں......“ میں نے استفسار کیا۔

”گلی نمبر 4، مکان نمبر 422......“ دوسری طرف سے بتایا گیا۔

ہم جائے وقوعہ پر پہنچے تو ایک دل دہلا دینے والا منظر ہمارا منتظر تھا......ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکی گھر کے ڈرائنگ روم میں ریوالونگ چیئر پر اوندھی منہ پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ٹیبل پر ایک ہارر کتاب کھلی ہوئی ملی......سوچ کے زاویے ملے تو محسوس ہوا اور کتاب کی پچویشن نے یہ ظاہر کیا کہ مقتولہ مرنے سے پہلے کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھی۔

میں نے حوالدار حبیب اور اے ایس آئی کے ذریعے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا......

محلے والوں کا بیان خاصا عجیب تھا......

”صاحب جی......! مرنے والی کا نام، ثانیہ ہے......! گورنمنٹ کالج میں F.S.C پارٹ ون کی طالبہ تھی......اس کی ماں تو اسے بہت پہلے چھوڑ گئی البتہ اس کا باپ لندن میں رہتا ہے۔ کہتے ہیں اس نے بھی کسی گوری میم سے شادی رچالی ہے......“

”اور خرچہ کون دیتا ہے......؟“

”اس کا باپ......تبھی تو اتنا بڑا گھر کار۔ اے سی اور دنیا کی ہر آسائش میسر تھی۔“ ایک اور نے بتایا......

”مجھے فون پر کس نے اطلاع دی تھی......؟“ میں نے پوچھا۔

”صاحب جی......وہ میں تھا......“ ایک نوجوان بھیڑ سے باہر نکل آیا۔

حلیہ اور آواز کی ٹون سے پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا دکھائی دیتا تھا......

”آپ اپنا بیان ریکارڈ کرائیں......“

”کیس کی ابتداء اسی نوجوان کے عجیب وغریب بیان سے کرتے ہیں......“ میں نے کہا۔

اطلاع دینے والے اس نوجوان کے مطابق اس کا نام، عاصم، تھا......ایف ایس سی پارٹ ون کا طالب علم......حیرت انگیز طور پر مقتولہ کا کلاس فیلو......

”سر......! یہ خاصی ہوشیار اور تیز اسٹوڈنٹ تھی......میٹرک میں اسکالر شپ......اور کلاس میں ذہین ترین......

آج دوپہر میں کالج سے لوٹی تو میں نے اسے خوشی خوشی گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ مجھ کو اس وقت خوف محسوس ہوا، جب ثانیہ گھر سے باہر نہ نکلی کیونکہ روزانہ شام چار بجے ثانیہ بی بی شہر کے مشہور فاؤنڈیشن کلب میں بچوں کے ساتھ وقت گزاری کے لئے جایا کرتی تھیں۔ مگر خلاف توقع ایسا نہ ہوا۔ چوکیدار نے کہا۔

خانساماں رفیق کے مطابق آج بی بی نے کھانا بھی نہیں کھایا......وہ کچن میں پڑا پڑا ٹھنڈا ہوگیا......

پھر ساڑھے چار کے قریب جب چوکیدار فضل دین ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اس کے حواس اس کے ساتھ چھوڑ گئے۔ ثانیہ ریوالونگ چیئر پر کھلی آنکھوں سے سراپا سوال تھی۔

چوکیدار فضل دین کے مطابق وہ ڈر اور خوف کے ملے جلے احساس سے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔ کیونکہ اسے وہاں کسی غیر مرئی مخلوق کا احساس سا ہونے لگا تھا......اس نے انتہائی خوف کے عالم میں، عاصم کے گھر کا دروازہ پیٹا......

عاصم کو اس نے سارا ماجرا سنایا......ادھر اس نے پولیس اسٹیشن اطلاع کردی......

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق قتل شام چار سے ساڑھے چار بجے کے دوران ہوا......حیرت انگیز رپورٹ کے مطابق اپنی نوعیت کا یہ انوکھا قتل تھا......کیونکہ اس میں لاش کے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا گیا تھا......سب سے بڑھ کر حیرت انگیز بات کہ نہ تو اخراج خون کے لئے کوئی آلہ استعمال کیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی آلہ قتل...... بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی ان دیکھی قوت نے اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر مقتولہ کے جسم سے خون نچوڑ لیا ہو......ایسا کیسے ممکن تھا......؟

ممکن نہیں تھا مگر ایسا ہو چکا تھا......

اے ایس آئی سرور خان نے مجھے جائے وقوعہ کا نقشہ دکھایا......قاتل نے کوئی بھی ثبوت نہیں چھوڑا تھا......

اچانک میرے دماغ میں اس ہارر بک کا تصور ابھر آیا جو جائے وقوعہ پر مقتولہ کے سامنے موجود میز پر رکھی ملی تھی......

حبیب خان......آپ کو وہ ہارر بک دی تھی......کیا آپ اسے حاضر کر سکتے ہیں؟

”جی ضرور......“

”ذرا جلدی......“

چند ہی لمحوں میں جائے وقوعہ پر ملنے والی کتاب میرے ہاتھوں میں تھی۔

ٹائٹل خاصا ڈراؤنا تھا......میں نے ورق الٹ کر اندر کے صفحات پلٹنے شروع کردیئے......پھر حیرت کا جھٹکا مجھے اس وقت لگا جب کتاب بالکل وائٹ ملی۔ یعنی کتاب جس طرح بے نام تھی اسی طرح اندر سے بھی بلیک اینڈ وائٹ......

البتہ ایک چیز۔ جو میرے لئے خاصی پرابلم تھی وہ......پبلشر اور ناشر کا نام......

شہر کے مشہور و معروف پبلشر میاں ارسلان، اس کے ناشر بھی اور کتاب کا اہتمام بھی انہی کے ذریعے ہوا......کتاب کی پرائس اور فون نمبر درج تھا......خالی کتاب شائع کرنے کا کیا مقصد ہوسکتا تھا؟

اس سوال کا جواب میاں ارسلان ہی دے سکتے تھے۔

لیکن ایک سوال اور بھی ابھرتا تھا کہ اس کتاب کا قتل سے کوئی تعلق بھی تھا یا نہیں...... پر دائرہ تفتیش کو آگے بڑھانا بھی تو مقصود تھا۔

☆......☆......☆

ایک اور قتل......

اس بلیک اینڈ وائٹ کتاب کے پبلشر و ناشر میاں ارسلان بھی پراسرار موت کا شکار ہوگئے......

میں نے کتاب پر لکھے فون نمبر سے رابطہ کیا تو دوسری طرف کسی ملازم نے اٹینڈ کیا۔

”گلشن ٹاؤن تھانہ انچارج بات کررہا ہوں......میاں ارسلان سے بات ہوسکتی ہے......؟“ انداز پیشہ ورانہ تھا......

”ویری سوری سر......! اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے......“

’وہاٹ......؟؟“ میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا......

”جی سر......! ان کا آدھا گھنٹہ پہلے ہی انتہائی پراسرار انداز میں قتل ہوا ہے۔“ دوسری طرف سے خوف اور ڈر کے ملے جلے عنصر سے جواب دیا گیا اور ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا......

اے ایس آئی سرور خان اور میں جائے وقوعہ پر پہنچے تو گھر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا......ورثاء نے صف ماتم بچھا رکھا تھا......اس حالت میں تفتیش کرنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن ڈیوٹی از ڈیوٹی......

ایک ہی نوعیت کے دو قتل......کڑیاں ملانے کی ضرورت تھی تاکہ قاتل بے نقاب ہوجائے۔

ایک کتاب چھاپنے والا اور دوسرا کتاب پڑھنے والا......

اس کتاب کا کوئی ایسا راز ضرور تھا جس نے دو انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا......

ہم دونوں گھر میں داخل ہوگئے......

اہل محلہ اور ورثاء نے خاصا تعاون کیا۔

لاش کی حالت بالکل...... مقتولہ ثانیہ کی طرح

تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ نے دونوں مقتولین کی رپورٹ صرف وقت کے فرق کے ساتھ قریب ایک جیسی تھی......

”سر......!اگر کتاب تھی ہی بالکل بلیک اینڈ وائٹ......تو ذرا سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک عقل والا انسان خالی کتاب کیوں خریدے گا......“اے ایس آئی نے کہا۔

”ہاں......بات تو تمہاری سولہ آنے ٹھیک ہے......پر سوال یہ ہے کہ ثانیہ کی لاش کے سامنے وہ کتاب کھلی ہوئی ملی......فنگر پرنٹس رپورٹ نے بھی یہ ثابت کردیا ہے کہ کھلے ہوئے صفحات پر ثانیہ کی انگلیوں کے نشانات تھے......“میں نے جواب دیا۔

اور تھوڑی دیر بعد، ہم دونوں جیپ میں سوار باہر جارہے تھے۔

جیب میں اچانک کوئی فنی خرابی ہونے لگی جس کی وجہ سے جیپ جھٹکے کھانے لگی تھی۔

پھر اچانک ہی جیپ کا انجن بند ہوگیا......ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے سرور خان نے چابی اگنیشن میں بار بار گھمائی مگر گیئر اور کلچ نے جواب دے دیا۔

ہم اس وقت کتاب کے رائٹر انوار عالم کی جانب رواں دواں تھے۔ مگر اچانک جیپ میں خرابی نے روانی روک دی......

شام کے سائے پھیلتے جارہے تھے وہ سڑک خاصی سنسان رہتی تھی......انوار عالم کی رہائش گاہ یہاں سے کوئی دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھی تفتیش کے دائرے کو تنگ کرنے اور قاتل تک پہنچنے کا واحد راستہ وہ مصنف ہی تھا۔

پر ابھی یہ معمہ یہیں رک گیا تھا کیونکہ ہم اپنی واحد جیپ کے پاس یاس وبحرومی میں کھڑے تھے۔

وہ ایک مرسیڈیز پر تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خاتون سوار تھی......عمر کوئی 39 کے پیٹے میں......ہاف کٹنگ......فل انگلش سوٹ۔ البتہ چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔

”سرلفٹ......؟“

ہمارے اشارے کے بغیر ہی وہ مرسیڈیز خودبخود رک گئی۔

رنگین شیشے نیچے کو سرک گئے۔

پرکشش خاتون کا چہرہ نظر آیا۔

”سر اہیو یو اینی پرابلم......؟“انداز مہذبانہ تھا۔

”یس......“قیوم آباد بلاک 4 تک جانا ہے“میں نے آگے بڑھ کر بڑے شائستہ انداز میں کہا۔

”وائے ناٹ سر......میں خود بھی اسی طرف جارہی ہوں۔“

”ویری گڈ......“

سرور خان اور میں بیک سیٹ پر براجمان ہوگئے......

سفر کی سنگینی کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب سرور خان کی طبیعت اچانک بگڑنے لگی......حالانکہ وہ ایک کڑیل نوجوان تھا۔ مگر گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کی حالت بگڑنے لگی تھی۔

”صاحب......میرے پیٹ میں آگ سی لگی ہے......“

اس کی تکلیف کا اندازہ اس کی کرب اور دکھ میں ڈوبی آواز سے باآسانی لگایا جاسکتا تھا۔

”حوصلہ کرو......خدا کو یاد کرو......کڑیل جوان ہو......“

میں نے اسے تسلی دی۔

پھر اچانک ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی خاتون بولی۔

”بخاری صاحب......اس بار آپ کے ہاتھوں بڑا انوکھا کیس لگا ہے......دو ایک جیسے قتل......اور اب یہ تیسرا......“آواز میں طنز۔ اور گہرائی تھی۔

”تیسرا قتل......!!“میں نے حیرت سے کہا۔

”جی......!تیسرا قتل......!آپ جن کی طرف جارہے ہیں وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے......“

”مطلب رائٹر انوار عالم بھی قتل ہوچکے ہیں......؟“

”یس......اپنی تسلی کے لئے ان کے گھر سے انفارمیشن لے لیں......“

سیل فون کی دوسری گھنٹی پر فون اٹینڈ کرلیا گیا......

”انوار عالم صاحب......!“میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”سوری سر!ان کا پراسرار انداز سے قتل ہوگیا ہے......“

اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

”پر محترمہ......آپ کو ہمارے کیس اور اس تیسرے قتل کے بارے میں کہاں سے علم ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں مجاز نہیں کہ آپ کے اس سوال کا جواب دوں......آپ تفتیش جاری رکھیں......اور ویسے بھی ہر عام وخاص کو آپ کے اس انوکھے کیس کا علم ہے......“

جیپ مطلوبہ جگہ پر رکی تو سرور خان کی طبیعت بھی سنبھل گئی تھی......ہم جائے وقوعہ پر پہنچے تو حیرت کا جھٹکا مجھے لگا۔

انوار عالم کی عمر 70 کے قریب تھی۔ سفید بال ان کی زندگی کے ذاتی تجربات کے عکاسی تھے......

اگر یہ کہوں کہ یہ قتل بھی پچھلے دو مقتولین کی طرح کا ایک انوکھا قتل تھا تو بے جانہ ہوگا......

قاتل خاصا ہوشیار اور تربیت یافتہ تھا۔ تبھی تو کوئی ثبوت چھوڑے بغیر قتل جیسا اندوہناک قدم اٹھا جاتا تھا......

لاش کے انگ انگ سے خون کسی عرق کی طرح نچوڑ لیا گیا تھا......چہرہ لٹھے کی طرح انتہا کا سفید......

اور پہلے کی طرح جسم پر اخراج خون کا نشان یا کوئی آلہ قتل کا استعمال......قطعاً نہیں......

پوسٹ مارٹم رپورٹ بالکل پچھلے مقتولین کی طرح......البتہ وقت کا فرق واضح تھا۔ ہم نے انوار عالم کے بھائی افتخار عالم اور ملازم حشمت کو ساتھ لیا......

”افتخار صاحب کیا آپ ہمیں انوار صاحب کا کمرہ دکھا سکتے ہیں۔ ہم تین ایک ہی جیسے قتل کی تفتیش میں ہیں......“

”ضرور سر......!“ان کا حوصلہ قابل دید تھا......ورنہ بھائی کی اچانک موت پر کچھ لوگوں کو غشی کے دورے سے پڑنے لگتے ہیں پر ان صاحب کا حوصلہ قابل ستائش تھا......

وہ مجھے انوار عالم کے ذاتی کمرے میں لے گئے......

وہ ایک خوبصورت ڈیکوریٹیڈ کمرہ تھا......بیڈ کے قریب ایک رائٹنگ ٹیبل، کرسی رکھی تھی......

”کیا انوار عالم اسی کرسی پر بیٹھ کر لکھائی پڑھائی کا کام کرتے تھے......؟“میں نے پوچھا۔

”جی سر......!بالکل......یہ ان کا اپنا ذاتی کمرہ تھا......اور یہ ٹیبل چیئر ہمہ وقت ان کے استعمال میں رہتی تھی۔“

بیڈ کے ساتھ ہی لائبریری نما ایک بکس بنا ہوا تھا جس میں تقریباً ہر موضوع پر دنیا جہان سے لائی گئی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔

میں نے چند ایک کتابیں نکال کر دیکھیں......پہلی جو کتاب میرے ہاتھ لگی تھی وہ خوفناک قسم کی تصویر سے نمایاں تھی۔ بلیک ہارر نائٹ کے نام سے لکھی گئی۔ یہ کتاب اپنی خوفناکیت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے ہر ایک کتاب کا ٹائٹل بڑے غور سے دیکھا۔ اریب قریب سب کا موضوع، ہارر تھا......

انوار عالم کی انوکھی کہانیاں میں نے بھی پڑھ رکھی تھیں۔ ان کے لکھنے کا انداز انوکھا اور لفظوں کی چاشنی سحر انگیز ہوتی تھی......خاص طور پر خوفناک اور ایڈونچر اسٹوریز میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا......کہانی کو سب سے انوکھے اور نرالے انداز میں پیش کرنا ہی ان کا خاصہ تھا......

مگر ان کی اچانک موت جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس کتاب سے ضرور تھا جو پرنٹنگ کے بعد میٹر وائز وائٹ ہوگئی تھی۔

پر میں قانونی طور پر یہ تمام انکشافات ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ نہ تو قاتل کا کوئی اتا پتا اور نہ ہی کیس میں کوئی پیش رفت......

قتل پر قتل اور الجھاؤ والی بات یہ کہ قاتل کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا......اور نہ ہی پیش رفت کے لئے کوئی کیو......

ہم انوار عالم کے گھر پر تھے کہ کال بیل کی آواز سنائی دی......ملازم باہر گیا......واپسی پر ملازم کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی بھی تھا جس کی عمر انوار عالم کے لگ بھگ ہوگی......

بال سفید......مگر شخصیت کے اعتبار سے بہت سلجھا ہوا......

"سر......!انوار صاحب کا گہرا دوست رہا ہوں......زندگی کے ہر قدم پر ساتھ نبھایا...... پر آج ان کی اچانک موت نے سب کو غم زدہ کردیا......جانے والے واپس نہ آنے کے لئے چلے جاتے ہیں......پر ان کی یادیں اور باتیں ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتی ہیں......ان کی تحریریں، ان کے پڑھنے والوں کے لئے ......اور ان کی باتیں ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ رہیں گی......"ان کی آواز میں گہری جھلک نمایاں تھی......

"سر......آپ کو ایک خاص الخاص بات بتانے کے لئے حاضر ہوا ہوں......اور مجھے سو فیصد امید ہے کہ یہ اہم بات میرے دوست کے قاتل تک رسائی کے لئے ایک اہم ستون ثابت ہوگی......

میرے تجسس میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

"جی ضرور! آپ کھل کے بات کریں......"

انوار بھائی کی موت سے تین دن پہلے کا ذکر ہے کہ ہم نئی کتاب کی تزئین و آرائش میں مصروف تھے کہ اچانک ایک فون کال ریسیو ہوئی۔

"ہیلو......!"انوار عالم نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"انوار صاحب......دو دن کے بعد آپ کی نئی کتاب "راز" کے نام سے مارکیٹ میں آرہی ہے۔ اور آپ کو پیشگی انفارم کردوں کہ اگر یہ کتاب مارکیٹ میں آ گئی تو اس کتاب سے تعلق رکھنے والے ہر انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ دوسری طرف سے خاصے سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔

"یہ کتاب مارکیٹ میں ضرور آئے گی۔ آپ جو بھی ہیں ایک بات کان کھول کے سن لیں کہ ہم کسی دھمکی میں آنے والے نہیں ہیں۔"انوار عالم کا لہجہ بھی خاصا سپاٹ تھا۔

"ٹھیک ہے!! جیسا آپ چاہیں ......میرا مقصد آپ کو اطلاع دینا تھا۔ باقی مجھے افسوس ہے کہ آپ کی زندگی کے دن گنتی کے رہ گئے ہیں۔ آپ کی موت کا افسوس رہے گا۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوچکا تھا۔

"میرا دل خاصا الجھا ہوا تھا......موبائل کا اسپیکر آن تھا، میں اس گفتگو کو صاف سن رہا تھا......"

انوار صاحب......اگر زندگی اور موت کا مسئلہ ہو تو انسان کو اپنی حفاظت کرنی چاہیے......یہ انسانیت کا فرض اور بنیادی حق بھی ہے۔ اگر آپ کی زندگی کو خدانخواستہ کوئی خطرہ لاحق ہے تو خدارا اس کتاب کو مارکیٹ میں نہ لائیں۔ ہم آپ کو ابھی کھونا نہیں چاہتے۔"میں نے مصلحتاً دلی تجویز پیش کی۔

"نہیں قریشی صاحب......اس کتاب کو ہر صورت میں منظر عام پر لانا ہوگا......یہ کتاب اپنی نوعیت کی اہم کتاب ہے۔ مصر کی شہزادیوں اور سب سے اہم ایک راز جو کتاب کے صفحہ نمبر 310 پر درج ہے......وہ قارئین کے دلوں میں ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔

انوار صاحب کا انداز قطعی تھا۔ دو ٹوک اور کھرا......"

یہاں تک کہنے کے بعد وہ بزرگ خاموش ہوگئے۔

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ ان تینوں قتل میں کسی غیر مرئی قوت کا ہاتھ ہے جسے ہم دنیا کی کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کرسکتے۔"میں نے کہا۔

"جناب......! قانون کی کتاب آپ نے پڑھی ہے۔"

"میرے پاس یہی اہم بات تھی جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

آج سے پورے تین دن پہلے ثانیہ کا قتل ہوا۔ جہاں سے ہمیں بلیک اینڈ وائٹ کتاب ملی۔

سوال یہ تھا کہ کتاب کو مارکیٹ میں آج آنا تھا۔ جبکہ دو دن پہلے کتاب ابھی چھاپہ خانہ تک ہی محدود تھی۔ پر ثانیہ کے پاس دو دن پہلے کتاب کیسے جا پہنچی؟

اس کا جواب ہمیں ملا اس کے کالج کی پرنسپل شہناز علی سے......

کالج کی لڑکیاں ثانیہ کی اچانک موت پر کافی رنجیدہ تھیں اور خوف ان کی آنکھوں میں دیکھا جاسکتا تھا

"جی سر......! میں ثانیہ کے معاملے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟"

پرنسپل کا انداز مہذبانہ تھا۔

"جی......یہاں کے پروفیسرز کی لسٹ دکھانا چاہیں گے۔"میں نے کہا۔

"جی ضرور......"انہوں نے دراز کے نچلے حصے سے ٹیچرز لسٹ نکال کر میرے سامنے حاضر کردی......

میں نے ایک ایک نام کو غور سے دیکھا۔

مطلوبہ نام لسٹ میں کہیں نظر نہ آیا تو میں تھوڑا پریشان ہوگیا۔

"کیا آپ بتاسکتی ہیں کہ ثانیہ کی کلاس کو اردو کا مضمون کون پڑھاتا تھا؟"

"جی......بہت مشہور ہستی ہیں......ہمارے محبوب مصنف اور شاعر جناب انوار عالم......"

مجھے مطلوبہ جواب حاصل ہوگیا تھا......

"آپ کو ان کی موت کا علم ہوگیا......"میں نے اچانک کہا......

"وہاٹ......ہمیں تو کوئی ایسی خبر نہیں ملی......"

"جی محترمہ......ان کا کل شام پراسرار طور پر قتل ہوگیا ہے۔

کیا میری اس کلاس تک رہنمائی کریں گی۔ جہاں ثانیہ پڑھا کرتی تھی......"میں نے پوچھا۔

"جی ضرور......"

خوف اور افسوس کے سبب شہناز علی کا چہرہ ایک دم مردہ سا ہوگیا تھا۔ بوجھل قدموں سے وہ مجھے اس کلاس تک لے گئیں جہاں ثانیہ تعلیم سے فیض یاب ہوا کرتی تھی۔

میری نظر لاسٹ لائن میں بیٹھے فرسٹ بوائے پر پڑی......یہ وہی لڑکا تھا جس نے مجھے قتل کے متعلق انفارم کیا تھا......

"ثانیہ کے پراسرار قتل کے متعلق آپ سے چند سوالات پوچھنا چاہتے ہیں ان کی بھرپور مدد کیجئے۔"پرنسپل نے کہا۔

لڑکیاں ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگیں......

"آپ مجھے ایک سوال کا جواب دیں کہ کیا انوار عالم نے ثانیہ کو اپنی کوئی کتاب دی تھی؟"

عاصم اور باقی تمام لوگوں کا بیان کچھ یوں تھا۔

"چار روز قبل انوار صاحب نے ایک مشترکہ مضمون لکھنے کا کہا......"آج کے اس زمانے میں آگ برساتی اور امن کی روشنی کو اندھیروں میں بدلتی حالت۔" دہشت گردی کا یہ مضمون ہم سب نے لکھنا تھا۔ سر نے انعام بطور اپنی نئی کتاب اس طالب علم کو عنایت کرنے کا اعلان کیا کہ جو سب سے جاندار اور نرالے انداز سے لکھ کر لائے گا......

اتفاقی طور پر یا خوش قسمت، ثانیہ نے میدان مار لیا......

سر نے ثانیہ کے پراسرار قتل کے روز ہی اسے کتاب عنایت کی تھی......"

تبھی مجھے عاصم کا یہ فقرہ بھی یاد آیا کہ "کالج سے واپسی پر ثانیہ خاصی خوش تھی۔"

موت سے پہلے چند لمحوں کی خوشی کا سبب انوار عالم کے ہاتھوں سے انعام بطور ملی وہ کتاب ہی تھی جس نے اب تک تین لوگوں کو رشتہ جاں سے محروم کردیا تھا۔

سے آخری سوال کیا......

''انوار عالم کا نام ٹیچرز لسٹ میں درج نہیں کوئی خاص وجہ؟''

''جی سر! ایک خاص بات......! انوار عالم یہاں اپنی خدمات بالکل مفت فراہم کرتے تھے۔ اپنی ادبی و تعلیمی خدمات کا انہوں نے ہم سے یا گورنمنٹ سے کبھی بھی معاوضہ وصول نہیں کیا......'' پرنسپل کا جواب انوار عالم کی ایک انتہائی اہم خوبی کو ظاہر کرنے لگا۔

☆......☆......☆

''ہیلو......! بخاری اسپیکنگ......'' میرا مخصوص انداز......

''سر......! ایک اہم خبر......صدر بازار میں لائبریرین وقاص کی اچانک موت واقع ہوگئی ہے۔''
اطلاع دینے والا اے ایس آئی تھا......

''آپ جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کریں میں ابھی پہنچا......''

حیرت کا شدید جھٹکا اس وقت لگا جب وقاص کی ڈیڈ باڈی کی حالت بھی انوار عالم اور باقی تمام مقتولین کی طرح تھی......اے ایس آئی نے وہ مخصوص کتاب قبضہ میں لے لی تھی۔ جو ایک خوفناک معمہ بن کے رہ گئی تھی۔

اسی لمحے میرے سیل فون پر نمبر ڈسپلے ہونے لگا......

''بخاری اسپیکنگ......!''

''سر جوہر آباد میں تین افراد کی پراسرار موت واقع ہوگئی ہے......پلیز! جلدی پہنچیں۔'' معاملہ گھمبیر ہوتا جا رہا تھا۔

قتل پر قتل......اور قاتل فرار......حیرت اور وجہ شرمندگی کہ ایک کیو بھی قاتل کی طرف پیش قدمی کے لئے نہ ملا تھا......اور جو ملے تھے وہ شواہد عقل کے گھوڑے دوڑانے کے بعد بھی کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتا۔

اے ایس آئی اور کسٹمرز کے مطابق......ایک نوجوان نے ''راز'' کی ڈیمانڈ کی......وقاص نے جونہی کتاب sale کی......اگلے لمحے اس کا چہرہ سفید لٹھے کی مانند سفید ہونے لگا۔ اور پھر ڈاکٹرز کے آنے تک وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

صدر میں وقاص لائبریری خاصی پاپولر تھی۔ تقریباً ہر موضوع پر کتابوں کا ڈھیر موجود تھا۔

میں نے راز کی ساری کاپیاں اے ایس آئی کو تھمائیں۔

رجسٹر میں ''راز'' نامی کتاب کی ایشو ڈیٹ اور نام پتے کا ریکارڈ چیک کرنے کے بعد تین اشخاص کے نام سامنے آئے جن کا تعلق جوہر آباد سے تھا۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دیا گیا......اور پھر رپورٹ نے اس کے بعد تصدیق بھی کر دی کہ موت خون کے اچانک ختم ہونے کی وجہ سے ہوئی......

جوہر آباد روانگی سے قبل میں نے شہر کی تمام لائبریریوں کو ''راز'' کی sale پر پابندی لگانے کے آرڈر منظور کروائے......اگلے چند گھنٹوں میں علاقے کے متعلقہ تھانوں میں، کتاب کی کاپیاں جمع تھیں۔

لوگوں میں خوف وہراس پھیل چکا تھا۔

میڈیا والوں نے بات خاصی طول دینے کی کوشش کی جس سے لوگوں کے دلوں میں کتابوں سے نفرت کی بو آنے لگی۔

''دیکھیں جی......! یہ قتل کا سیدھا سادھا کیس ہے......کیس چلے گا......مجرم کو بے نقاب کیا جائے گا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ میڈیا کو ہر ممکن خبر سے آگاہ کیا جائے گا۔ جہاں تک کتاب پر پابندی کا تعلق ہے تو یہ کتاب اپنے نام کی طرح ایک راز ہے......

جب تک اس کا راز فاش نہیں ہوتا، تب تک کوئی ڈیلر، لائبریرین، اسے فروخت کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کسٹمر اس کتاب کو خریدنے کی حماقت کرے......''

''سر......یکے بعد دیگرے قتل جن کی نوعیت ایک ہی قسم کی ہے۔ آپ کے خیال میں قاتل ایک شخص یا گروہ ہے۔'' سوال آیا......

''دیکھیں......میں عرض کر چکا ہوں کہ قتل کا تعلق کتاب سے ہے۔ کتاب کی دستیابی ہوگی تو قتل ہوتے رہیں گے۔'' thanks

اور میں نے میڈیا بریفنگ سے جان چھڑائی۔

مجھے حیرت تھی کہ ارسلان میاں کی موت کے بعد بھی ان کے ادارہ والوں نے کتاب مارکیٹ میں پہنچا دی۔ جبکہ ہمیں پہلی فرصت میں تمام کاپیاں اپنے قبضے میں کر لینی چاہیے تھیں۔

بہرحال اگلے ہی لمحے اشفاق میاں لائن پر تھے۔

اشفاق صاحب اسسٹنٹ منیجر تھے ادارہ میاں پبلشر کے......

''اشفاق صاحب......تھانہ انچارج بات کر رہا ہوں۔''

''جی سر......حکم کریں......کیسے یاد کیا......''

''جناب......آپ اپنے ادارے کو فی الوقت سیل ہی سمجھیں......کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے ارسلان صاحب کی پراسرار موت کے بعد بھی اور افسوس کے ساتھ کہ دوسرے ہی دن کتاب مارکیٹ پہنچا دی۔''

''سر آپ کی بات بجا ہے پر انوار عالم صاحب جو اس کتاب کے مصنف تھے، انہوں نے وصیت کی تھی کہ کتاب وقت مقررہ پر ہی مارکیٹ میں پہنچ جانی چاہیے، کیونکہ انہیں اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہ تھا......ادھر ارسلان میاں......نے مجھے خاص تاکید کی تھی کہ اگر ہم دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہے تو بھی آپ وقت مقررہ پر کتاب مارکیٹ میں پہنچانا۔''

''لیکن اشفاق صاحب......اس حماقت کی وجہ سے کئی قتل ہو چکے ہیں......عدالت آپ کو عمر قید سنا سکتی ہے......'' میرے دماغ میں یہ فقرہ جانے کیسے آ ٹپکا۔

''سر......کئی قتل......پر ان کا اس کتاب سے کیا تعلق ہے......؟ جبکہ ہمارا کوئی جرم ہی نہیں پھر کس خوشی میں عدالت مجھے عمر قید کی سزا سنا سکتی ہے......'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''دیکھیں اشفاق صاحب......میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں......اس ایک کتاب نے پورے سات قتل کر ڈالے ہیں پر وہ بھی بغیر کسی ثبوت کے......''

''ٹھیک ہے سر......! ہم فی الوقت کتاب کی ترسیل بند کر رہے ہیں۔ اور کوئی حکم......''

''بہت بہت شکریہ......'' انہوں نے کہا......اور رابطہ منقطع ہو گیا......

ایک بات تو طے تھی کہ کتاب کو اب بینڈ کر دیا گیا تھا۔ کسی کے ہاتھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

☆......☆......☆

عثمان میاں کی موت نے بھی مجھے ایک نئے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا کیونکہ میرا دل دھواں دھواں اور عجیب قسم کی اضطرابیت میں مبتلا ہو چکا تھا......ایک انجانا خوف سے جسم میں کپکپی سی پیدا ہونے لگی تھی......

میں پولیس کی نوکری میں جب سے آیا تھا تب سے ایسا کوئی کیس میرے ہاتھ میں نہیں آیا تھا جس میں آٹھ قتل قریب قریب ایک ہی نوعیت کے ہوئے ہوں......اور ملازمت کے کسی دور میں ایسے عجیب وغریب قتل دیکھے یا سنے نہ تھے......مزید براں کہ قاتل بھی بغیر کوئی ثبوت چھوڑے منظر عام سے غائب تھے۔

صدر سے لائبریرین وقاص کی شاپ سے راز نامی ہارر کتاب خریدنے والے جوہر آباد کے تین افراد کا قتل بھی اسی سلسلے میں ایک کڑی تھی......چھاپہ خانہ اور میاں پبلشر کی ہر قسم کی کاروباری سرگرمیوں کو روک دیا گیا۔

بعد ازاں......اس کتاب کی تمام کاپیوں کو آگ جلا کر دھواں دھواں کر دیا گیا......اپنی نگرانی میں اس کتاب کی تمام کاپیوں کو جلاتے ہوئے میں نے آسمان کی طرف بڑھتے اس خوفناک دھوئیں کو بغور دیکھا جس کے کالے ذرات میں ان معصوم لوگوں کی صدائیں تھیں جو اس قاتل کتاب کی بھینٹ چڑھے تھے......

آئی جی کی جانب سے الٹی میٹم دے دیا گیا......

موت کا خوف کسے نہیں ہوتا......اس ہارر کتاب کا نام ان آٹھ ایک قسم کے مقتولین سے جڑا تھا جن کا تعلق کتاب خریدنے، بیچنے، لکھنے اور پرنٹ کرنے والے سے تھا۔

اور خاص طور پر ''صفحہ 310 کا اصل راز کیا تھا!''

قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

ثبوت بغیر یا کوئی کیو بغیر کیس سلجھانا ناممکنات میں سے تھا۔ پر ایک بات تو طے تھی کہ کوئی غیر مرئی قوت ان تمام مقتولین کے اندوہناک قتل کا موجب تھی۔ ایک ایسی قوت جو ظاہری آنکھوں سے دیکھی جاسکتی تھی اور نہ ہی سنی جاسکتی تھی۔

اس کو حواس سے محسوس کیا جاسکتا تھا۔

ہم کافی عرصہ اس کیس پر اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں کرتے رہے تھے۔

''حقیقت کیا تھی......؟ قاتل کون تھا......؟''

☆......☆......☆

وہ ایک خوشگوار صبح تھی۔ سخت سردی کا موسم...... بیڈٹی اور چھٹی کا دن...... یہ ایک دن ہی سال میں آتا تھا جس میں مجھے سیپل ڈریس میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پارک جانا ہوتا تھا۔

کال بیل کی دوسری گھنٹی پر ملازم گیٹ پر پہنچا تو اسے ایک پیکٹ ملا......

خاکی لفافے میں پیک اس پیکٹ کو اس نے میرے حوالے کیا۔

''صاحب...... یہ ڈاکیہ دے گیا ہے......'' اس کے ساتھ ہی ایک خط میرے نام تھا جس کا عنوان کچھ یوں تھا۔

آپ کے مذہب میں خط کے شروع میں لکھتے ہیں۔

السلام علیکم......!

امید کرتی ہوں کہ طبیعت میں خوشگواری اور ذہن میں ہمہ وقت مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کا عزم ہوگا۔ ایک قانون کے محافظ ہونے کے ناطے آپ کا فرض بھی آپ کو اپنے مقصد کی طرف پکارتا ہے۔

ہارر کتاب ''راز'' کو آپ نے جس انداز سے مارکیٹ میں آنے سے روکا، اور اس کی فروخت اور خاتمہ کے لئے جو اقدام بھی اٹھائے اس کے لئے میں دل کی عمیق گہرائیوں سے ممنون ومشکور ہوں۔ اور اس کے لئے شکریہ قبول فرمائیں۔

میں عرض کرتی چلوں کہ اس خالی پیکٹ میں چند ویڈیوز ہیں...... جس میں کتاب اور قتل کے متعلق ہر قسم کی حقیقت سے آپ کو مکمل آگاہی حاصل ہوگی......

اگر اپنی حفاظت کے لئے آپ کو یہ ویڈیوز کے میڈیا کے سپرد بھی کرنا پڑیں تو دریغ مت کیجئے گا...... شکریہ!

آخر میں میرا تعارف صرف اتنا ہے کہ جو لوگ بدنصیب ہوتے ہیں انہیں زمین بھی مرنے کے بعد قبول نہیں کرتی......

میں ایک ایسی طاقت جو آپ کی دنیا سے انسانوں کی سوچ سے بہت دور......

آپ کا کیس solve ہوگیا...... ویڈیوز دیکھئے اور اس انوکھے کیس کو اپنے اسپیشل ریکارڈ میں بحفاظت رکھ لیجئے......

آخر میں ایک خوشخبری یہ کہ اب میری طرف سے انسانوں پر کوئی ظلم یا کوئی قتل جیسا اقدام نہیں اٹھایا جائے گا شکریہ۔ والسلام

راز

یہ انکشاف کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ راز کی طرف سے اقرار جرم اور ویڈیوز کی فراہمی میرے لئے خوش بختی تھی۔

☆......☆......☆

انوار عالم جونہی صفحہ 310 پر پہنچے تو انہیں جھٹکے سے لگنا شروع ہوگئے...... جھٹکوں کا ڈائریکٹ اثر ان کے دماغ سے تھا...... پہلے وہ جھٹکے معمولی اور نارمل قسم کے تھے مگر منٹ اور گھڑی کی رفتار سے ان کی تعداد اور انفلکشن میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

انہوں نے مسودہ سائیڈ پر رکھا اور فریج سے پانی کی بوتل منہ سے لگالی۔

پر دماغی جھٹکوں میں اس وقت کمی واقع ہوگئی جب انہوں نے آج کی رات کتاب مزید لکھنے کا ارادہ ترک کردیا...... چند ہی لمحوں میں ان کی ہلکی ہلکی سانسوں کی دھیمی دھیمی آواز کمرے میں گونجنے لگی......

Next سین میں دن کا اجالا پیش کیا گیا تھا...... وہ انوار عالم کا ذاتی کمرہ تھا جہاں ایک ٹیبل

انوار عالم بڑی تیزی سے کتاب کا مسودہ لکھنے میں مصروف تھے۔

موبائل فون کی تیسری گھنٹی پر انہوں نے فون بند کیا...... پر انہیں یاد آگیا کہ انکا cell مسودہ لکھنے سے پہلے آف تھا مگر یہ آن کیسے ہوگیا۔

حیرت کے مارے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جب دوسری طرف سے کسی نسوانی آواز نے ان کی نئی کتاب سے متعلق انکشاف کرتے ہوئے کہا......

''انوار عالم صاحب! بے وقت ڈسٹرب کرنے کے لئے معذرت خواہ ہوں...... پر انوار صاحب...... میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں کیونکہ اگر آپ اس کتاب کو مکمل کرکے مارکیٹ میں لائے تو آپ کی اس کتاب سے تعلق رکھنے والے بندے کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا، کیونکہ آپ نے صفحہ نمبر 310 پر جس قسم کے انکشافات کیے ہیں وہ میری برداشت سے باہر ہیں...... یا تو آپ اس صفحہ کو کتاب سے الگ کردیں یا کتاب لکھنے کا ارادہ ملتوی کردیں......'' انوار عالم کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ سخت جاڑے کے موسم میں بھی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی۔

''دیکھیں محترمہ...... میں اس قسم کی دھمکیوں میں نہیں آیا کرتا......

نہ ڈرپوک ہوں اور نہ ہی ضمیر فروش...... حق اور سچ بات میرے قارئین تک ہر صورت پہنچے گی......'' ان کا فیصلہ اٹل تھا...... انہوں نے cell آف کردیا۔

دھمکی کا جیسے ان پر کوئی اثر ہی نہ ہوا تھا۔ انہوں نے پہلے کی طرح کتاب کا مسودہ لکھنا شروع کردیا۔

تیسرے سین میں میاں ارسلان کا چہرہ ابھرا......

انوار عالم کی نئی کتاب ''راز'' کی تقریب رونمائی کی تاریخ پیش کی جارہی ہوتی ہے۔

مسودہ تیار ہو کے کمپوزنگ اور پھر ضروری اصلاحات کے بعد چھاپہ خانہ کی طرف روانہ کردیا گیا۔

چھاپہ خانہ کے تمام ملازمین کی حالتیں اس وقت [illegible] جب چھاپنے کے لئے ان کے پاس لایا گیا۔

''سر......! ایک عرض ہے......'' ایک ملازم نے میاں ارسلان سے مودبانہ انداز سے کہا۔

''سر...... جب سے کاپیاں پریس میں لائی گئی ہیں۔ ایک انجانا سا خوف دل میں بیٹھ گیا ہے...... ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمیں کوئی غیر مرئی قوت اس کتاب کو چھاپنے سے منع کررہی ہے۔''

''خواہ مخواہ یہ تمہارا وہم ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔'' ارسلان صاحب نے کہا۔ پرنٹنگ مشین نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ سپلائی کنکشن بجلی سے کرنے کے باوجود مشین نے قطعاً جواب دے دیا۔

مکینک نے مشین کو چیک کیا مگر کوئی فالٹ سامنے نہ آیا...... لیکن ارسلان صاحب کے پختہ ارادہ نے مشین کو کام کرنے پر مجبور کردیا۔

اور پھر 1000 کی تعداد میں کتابیں چھاپی گئیں۔

ویڈیو کے اس حصہ میں ثانیہ کا چہرہ نظر آتا ہے۔

جس کے گلابی حسین چہرے پر جوانی کا رنگ وروپ تھا۔ لانبی پلکوں اور لمبے حسین دلکش بالوں کے ساتھ اس لڑکی کا حسن کسی ماہتاب کی مانند تھا جو کئی دلوں کی دھڑکن اور کسی کے لئے راحت کا سامان تھی......

منظر اس کلاس کا جہاں میں کالج کی پرنسپل شہناز علی کے ساتھ تفتیش کے سلسلے میں گیا تھا۔

انگلش کے پروفیسر کے پیریڈ کے بعد انوار عالم اپنے مخصوص انداز میں کلاس میں داخل ہوئے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے طالب علموں سے مضمون چیک کرانے کو کہا۔ ان میں سے ایک طالبہ ثانیہ بھی تھی۔

انوار عالم نے پہلے تین طالب علموں کا مضمون چیک کیا مگر وہ ان سے مطمئن نہ ہوئے...... ثانیہ کا مکمل مضمون چیک کرنے کے بعد ان کے چہرے پر خوشگوار اثرات پیدا ہونے لگے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ثانیہ کا مضمون عین ان کے مطابق ہو۔

''شاباش بیٹا...... دہشت گردی پر مبنی تحریر، آپ نے واقعی ڈوب کے لکھی ہے...... انتہائی گہرے پوائنٹ

اور انداز تحریر بھی موہ لینے والا...... وعدے کے مطابق آپ چونکہ انعام کی حق دار ٹھہری ہیں تو......

تو...... پلیز! سب لوگ ثانیہ بیٹا کے لئے زور دار تالیاں بجائیں......" تب سرنے تالیوں کی گونج میں اپنی نئی کتاب اسے انعام میں دی جس کا نام راز تھا۔

ثانیہ کے لئے یہ انعام کسی قارون کے خزانے سے بھی زیادہ بیش قیمت لگا...... اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو۔

پر ساتھ ہی اس کا دل بے چین ہو گیا تھا۔ ایک انجان خوف سے اس کے جسم وجاں ہونے لگا تھا۔ ایک قلب میں دو مخالف قوتیں نبرد آزما تھیں۔ ایک کا تعلق امید اور کھلتے گلاب کی معطر خوشبو سے تھا تو دوسری قوت کا تعلق مایوسی اور اندھیروں سے تھا وہ خوشی و مسرت میں سرشار گھر لوٹی تو چوکیدار فضل دین نے مین گیٹ پر اس کا استقبال کیا......

اس کی نظروں نے کسی اور شخص کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کیا...... اس نے مڑ کے دیکھا اس کے کلاس فیلو اور دوست عاصم کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں...... اس نے عاصم کی پروا کئے بغیر حویلی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا۔

وہ سین ڈرا دینے کے لئے کافی تھا جب ثانیہ نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔

ڈرائنگ روم کی چیر اور ٹیبل اس کا ریڈنگ پوائنٹ تھا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے اس کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھی...... اور پھر جب وہ جونہی صفحہ نمبر 310 پر پہنچی۔

اچانک اسے چکر سے آنے لگے۔ اس نے کتاب کو سہولت سے ٹیبل پر رکھا...... اور پھر اچانک ایسا محسوس ہوا کہ آندھی طوفان آ گیا ہو، مکان میں بجلی سی چمکنے لگی اور پھر لائٹ آف ہو گئی۔

ایک غیر مرئی قوت کا مکان کے اندر داخلہ ہوا تھا۔ جسے صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ثانیہ خوف سے سہم گئی۔ اور پھر طوفان تھم گیا جب اس معصوم لڑکی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس خونی منظر اپنی آنکھوں میں سمیٹا۔

موت کے وقت ثانیہ کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا...... مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے قطرہ قطرہ خون اس کے جسم سے خارج ہو رہا ہے......

ویڈیو کے اس سین میں میاں ارسلان جو کہ ادارہ میں پبلشر کے بانی تھے۔"

"انوار عالم صاحب...... مجھے اس کتاب کے متعلق خاصی تشویش ہو رہی ہے۔ آپ کو دھمکی آمیز فون کئے گئے جن کا مطلب واضح اور صاف ہے کہ دھمکی دینے والے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"او جی...... کچھ نہیں ہوتا...... یہ کام کسی ایسے ایڈیٹر یا پبلشر کا بھی ہو سکتا ہے جسے میں نے ایک زمانے میں اپنی کتاب کا مسودہ دینے سے انکار کر دیا ہو یا پھر وہ ہماری اس نئی کتاب کے ذریعے ہماری پبلسٹی یا پاپولیرٹی کو برداشت نہ کر پا رہے ہوں......" انوار عالم نے کہا۔

"لیکن جناب! آپ کو وہ فون تو یاد ہے جس میں آپ اسی کتاب کا مسودہ۔ تیار کر رہے تھے جب آپ کا سیل فون آف ہونے کے باوجود بھی ایک فون کال اٹینڈ کو تیار ہو گیا تھا۔

آپ صفحہ نمبر 310 پر موجود تھے۔

اس کال میں کالر نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ آپ جس صفحہ پر اس وقت کام کر رہے ہیں۔ یا تو اسے کتاب سے ہٹا دیں یا پھر کتاب میں نہ شائع کریں اور اگر میری اس اطلاع کے بعد بھی آپ کی یہ کتاب مارکیٹ میں آ گئی تو مجرم آپ ہوں گے۔ اور اس کتاب سے تعلق رکھنے والے ہر انسان کو لقمۂ اجل بنا دیا جائے گا۔

انوار صاحب...... سوچ سمجھ کے کوئی فیصلہ کیجئے...... ایسا نہ ہو کہ تکمیل کے بجائے تخریب کا ر کا ہو جائے۔ خدانخواستہ اس کتاب کے بعد کسی کی موت ہو جائے تو ذمہ دار ہم دونوں ہوں گے۔"

ارسلان میاں کی بات حد درجہ وزن آمیز تھی۔

"اللہ پہ بھروسہ رکھو...... کچھ بھی نہیں

ہوتا...... تخریب کا کوئی خدشہ نہیں بلکہ ہمیں ڈرانے اور دھمکیاں دینے والے وہ ملک دشمن عناصر ہیں جن کا دین ہے نہ مذہب......

آپ بس کتاب کو جلد منظر عام پر لانے کی تیاری کریں......"

"او کے انوار صاحب...... جیسا آپ چاہیں"

انوار عالم کا چہرہ یکدم ہی منظر سے روپوش ہو گیا۔

وہ ایک تاریک کمرہ تھا۔ بیڈ پر میاں ارسلان کا نیند میں ڈوبا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔

اچانک سے پہلے محسوس ہوا کہ کمرے کی ہر چیز ہلنے لگی ہو۔ ٹیبل پر رکھی اشیاء خود بخود ہلنے لگیں۔

ان کا بیڈ بھی چرچرانے لگا۔

اسی لمحے محسوس ہوا کہ کوئی غیر مرئی قوت ان کے قریب آ بیٹھی ہو۔ اگلے ہی لمحے ارسلان میاں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ان کی سانس خاصی تیز چل رہی تھی۔ انہوں نے اپنے دائیں جانب پانی کا جگ تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی مگر جگ ہوتا تو انہیں ملتا۔

موت کا خوفناک منظر میرے سامنے تھا۔ ان کی گردن میں کسی انجانی ان دیکھی قوت کی طرف سے پھینکی گئی چھوٹی چھوٹی سوئیاں چبھنے لگیں...... دیکھتے ہی دیکھتے ان کا پورا جسم خون سے عاری ہوتا گیا...... اور پھر سوئیاں اچانک غائب ہو گئیں۔ ارسلان میاں کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

یہ سب دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے میرے گال پر سے پھسلتے ہوئے زمین پر جا گرے...... میرے کئی عزیز لحد میں اترے...... کئی عزیز دوستوں کے جنازوں کو کندھا دیا...... پر کبھی شبنم بھرے موتی میری آنکھوں سے اس طرح رواں نہ ہوئے تھے۔

انسان میں ایک اعضاء دل بھی ہے۔ جس کے حساس تار اس کے وقت حساسیت سے لبریز ہو جاتے ہیں جب وقت اور زمانے کے فرعون دھرتی پر اپنا ظلم وتسلط جمانا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب اپنے جیسے انسان کو تکلیف نزاع میں دیکھے تو پسیج سا جاتا ہے۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوا...... نور اور روشنی کا سفر خاصا پر لطف اور انعام واکرام سے پر تھا۔

وہ اس مکروہ ویڈیو کا ہی ایک منظر تھا جس میں انوار عالم انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنے گھر کی راہداری میں ٹہل رہے تھے۔ ان کا انداز شاہانہ، چہرے پر آثار ندامت تھی۔

ایسے لگتا تھا جیسے خود کو مجرم تصور کر رہے ہیں...... اور دماغ میں بار بار جملے کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔" کاش! ارسلان میاں کی بات مان لی ہوتی تو آج ارسلان میاں زندہ ہوتے......" پھر انہیں اپنی چہیتی اسٹوڈنٹ ثانیہ کے پراسرار قتل کا پتہ چلا تو بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔

میڈیکل رپورٹ میں انہوں نے بغور پڑھی تھی...... ارسلان میاں اور ثانیہ کا قتل بالکل ایک ہی طرح سے عمل میں لایا گیا تھا۔

انہوں نے میاں پبلشر کے اسسٹنٹ اشفاق میاں کو کال کی...... جس کا لب لباب تھا۔

"اشفاق صاحب...... میری نئی کتاب "راز" کو مکمل سیل کر دیں...... اس کی کوئی کاپی بھی پریس سے باہر نہ جائے......"

"لیکن سر! ہم نے آپ کے فرمان اور مرحوم ارسلان صاحب کی آخری وصیت کے مطابق کتاب مارکیٹ میں پہنچا دی ہے۔"

"اوہ! نو!...... ویری بیڈ!!!"

"آپ...... پلیز! جلدی سے جہاں جہاں کتابیں دی ہیں، ان سے کتابیں واپس منگوائیں۔"

"او کے سر! میں کوشش کرتا ہوں۔"

اشفاق میاں نے لسٹ کے مطابق تمام کسٹمرز کو فون سے کتاب کی واپسی کا مطلب بیان کیا۔

صدر بازار میں واقع وقاص لائبریری کا شاپ نمبر اور موبائل نمبر ہر بار آف ملے...... جہاں سے کتابیں واپس نہ ملیں۔

اشفاق میاں نے وقاص لائبریری کو کل کی

تاریخ پر چھوڑا اور آفس بند کر کے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔

قتل کا یہ انداز بھی انوکھا اور نرالا تھا۔ انوار عالم اپنی آرام گاہ میں کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ پیشانی پر سلوٹیں اور عرق آلود......

دل کی دھڑکنیں خاصی بے ترتیب...... دھواں دھواں انداز پگھلتا دل جس کی دھڑکنیں اتنی تیز کہ اسٹیتھو اسکوپ کی ضرورت نہ پڑے۔

ایک خوفناک آواز کمرے میں گونجی۔

''انوار عالم...... آج میں اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور اندھیری راہوں پر چلنے والی اندھی گرم اور آلودہ ہوا کی مانند تمہارے نزدیک موجود ہوں۔

کئی بار کہا...... کہ اس کتاب کے صفحہ نمبر 310 کو نکال باہر کرو یا کتاب ہی شائع نہ کرو۔

پر تم پر جوں تک نہ رینگی۔

یہ حقیقت تسلیم کرتی ہوں کہ تم خود ایک قیمتی پارس ہو جس کی پہچان صرف قدردان کو ہی ہو سکتی ہے۔ عام نگاہیں تمہاری قیمت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکیں۔ یہ بھی مانا کہ تم نے اس دنیا میں رہنے والے ان فرعونوں پر بھی اپنی اصلاحی تحریروں کا سکہ جمایا ہے۔ تمہاری تحریروں کی وجہ سے بہت سے بگڑے ہوئے نوجوان روشنی اور فلاح کی جانب چل پڑے۔

پر صرف ایک ضد اور غلطی آج تمہاری موت کا سبب بن رہی ہے۔

ذرا ایک سوال کا جواب تو دو...... خدا ہر کسی کے عیب پر پردہ رکھتا ہے۔ رسوائیوں سے پر ''راز'' بھی افشاں نہیں کرتا...... پھر ذرا عقل کے گھوڑے دوڑا کر جواب دو کہ تم نے میری ذات سے وابستہ راز کو دنیا کے سامنے انتہائی اندوہناک انداز سے عیاں کرنے کی کوشش کیوں کی؟ جرم یا قصور بتاؤ میری ذات کا......

کاش! تم میری بات مان لیتے تو آج موت سے تمہارا واسطہ نہ پڑتا۔''

خاموشی کا راج موت کی طرح پھیلتا چلا گیا۔

انوار عالم کی سانس بہت دور جا چکی تھی...... اتنا دور کہ جہاں سے واپسی کا کوئی امکان یا امید نہ تھی۔

یہ ویڈیو کا غالباً لاسٹ سین تھا۔

وقاص لائبریرین کی نظر اس انوکھی کتاب کے صفحہ نمبر 310 پر جا پڑی...... اس سے پہلے وہ قریب قریب اس کتاب کے تین پرچے sale کر چکا تھا۔

پر اچانک اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کی گردن پر اپنی قوت کے آخری حصے سے دباؤ ڈال رہا ہو...... وہ چکرا کر گرنے لگا...... تبھی اسے محسوس ہوا جس میں موت کی تختی کا راج تھا۔ کہ اس کا جسم خوف سے عاری ہو رہا ہو...... اس کے چہرے سے موت کی سختی صاف عیاں تھی۔

ایک بات کہوں کہ اس اندوہناک منظر کو میں تحریر کے دائرے میں لانے سے قاصر ہوں۔

میں نے ویڈیو آئی جی اور پھر پرنٹ اینڈ الیکٹرانک میڈیا کو پیش کر دی اور ساتھ ہی وہ خط بھی جو شاید قاتل کے ہاتھوں سے لکھا گیا تھا۔

پھر معاملہ ٹھپ ہو کے رہ گیا کیونکہ میں استغاثہ کے طور پر نہ تو مجرم حاضر کر سکتا تھا اور نہ ہی اس غیر مرئی قوت کے خلاف کوئی ایکشن لے سکتا تھا۔

آج وقت کی دھاریں کسی گھن چکر کی طرح انتہائی تیز و تند ہو چکی ہیں...... میرے بال سفید اور تجربہ بھی خاصا وسیع ہو چلا ہے...... زندگی میں ایسے کئی واقعات رونما ہوئے جو خواب کی طرح لگتے ہیں...... پر میری زیست کا یہ انوکھا کیس آج بھی میرے دماغ کے نہاں خانے میں روز روشن کی مانند عیاں ہے۔

وہ راز تھا۔

ایک ایسی عورت کی موت کا ''راز''...... جس نے ایک جن سے عشق کیا تھا۔ ایک ایسا عشق جس میں ملاپ دو الگ مخلوق کے درمیان ہوا۔ مصنف نے اس عورت کی موت یعنی اس کی لٹی عصمت کا راز اس کتاب کے صفحہ نمبر 310 پر فاش کر دیا تھا۔

پراسرار ہوسٹل

عروفیہ ملک۔ گجرات

کمرے میں طالبات محوِ خواب تھیں کہ اچانک ایک دلخراش چیخ نے ہوسٹل کے پورے ماحول کو لرزا کر رکھ دیا۔ بدحواس ہوکر طالبات اٹھ بیٹھیں اور جب دیکھا تو کمرے میں خوفناک منظر رونما تھا۔

وحشت اور وہشت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی اندوہناک اور خوف ناک خونی کہانی

''ٹک...... ٹک...... ٹک......'' ہال کمرے میں جب جوتوں کی آواز گونجی۔ تو پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ خوش گپیوں میں مصروف تمام لڑکیاں باتیں چھوڑ کر اپنی نئی آنے والی ینگ خوبصورت وارڈن کو دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔

''السلام علیکم! امید ہے مجھے آپ سب سے مل کر اچھا لگے گا۔ آپ کو میں اچھی لگوں یا نہیں، اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ خیر میں کوشش کروں گی کہ آپ سب پر کسی قسم کی غیر ضروری پابندیاں عائد نہ کروں۔ لیکن وقت کی پابندی نہ کرنے والوں کی میں سخت خلاف ہوں۔ اس لئے میں ہر کسی کو وقت کا پابند دیکھنا چاہوں گی۔

صبح آٹھ بجے ناشتہ، دوپہر ایک بجے لنچ اور رات کو آٹھ بجے ڈنر ہوگا۔ ڈنر کے بعد تمام لڑکیاں اپنے

اپنے روم میں چلی جائیں گی۔

نہ تو کوئی باہر جائے گا نہ اندر آئے گا۔

انڈر اسٹینڈ؟ آج کے لئے اتنا بہت ہے۔ آپ سب کھانا کھالیں اور کمروں میں چلیں جائیں۔" وہ اتنا کہہ کر پلٹی ہی تھی کہ آواز گونجی۔

"مس آپ کا نام کیا ہے؟"

"ہوں...... میرا نام ربیعہ ہے۔"

"ویری نائس نیم" وہ لڑکی دوبارہ بولی۔

"اور آپ کا نام؟" ربیعہ نے سامنے کھڑی پیاری سی پر اعتماد لڑکی سے پوچھا۔

"مس میرا نام ماہا ہے اور میں فرسٹ ائیر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔"

"آپ کا نام بھی بہت خوبصورت ہے۔" ربیعہ نے ماہا کا گال پیار سے تھپتھپایا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

"یار یہ نئی وارڈن ہے تو زبردست مگر رولز تو اس کے بھی بے کار اور دقیانوسی ہی ہیں۔"

ماہا کی دوست نیلم خاصی بدمزہ ہو رہی تھی۔

"ارے بھئی! رولز تو رولز ہوتے ہیں اس میں دقیانوسی کا کیا سوال؟" ماہا کو مس کی برائی اچھی نہ لگی تھی۔

"اچھا چھوڑو! کمرے میں چلتے ہیں۔" نیلم ماہا کے موڈ کو دیکھتے ہوئے بات بدل گئی۔ اور دونوں کمرے کی طرف چلی گئیں۔ رات خراماں خراماں اپنا سفر طے کر رہی تھی کہ "آ...... آہ......" درد میں ڈوبی ہوئی چیخ کی آواز سن کر ربیعہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی اور جلدی سے چپل پہن کر اپنے کمرے سے باہر آئی۔ باہر آ کر اس نے دیکھا کہ ہوسٹل کے باقی کمرے بھی آہستہ آہستہ کھل رہے تھے۔ اور لڑکیاں پریشانی کے عالم میں باہر آ گئیں تھیں۔

"میڈم! یہ چیخ کہاں سے آئی ہے؟" ایک لڑکی نے ربیعہ سے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا، میں ابھی کمرے سے نکلی ہوں۔" ربیعہ کے جواب پر سب ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"آہ...... آ......" اتنے میں دوبارہ کرب میں ڈوبی ہوئی کربناک آواز گونجی۔

"میڈم...... میڈم......" نیلم بھاگتی ہوئی بدحواس سی آئی۔

"میڈم وہ...... وہ ماہا......" وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔

"کیا ہوا ماہا کو، کہاں ہے وہ؟" ربیعہ کو یکدم بے چینی نے آن گھیرا۔

سب لوگ ماہا اور نیلم کے مشترکہ کمرے کی طرف بھاگے۔ لیکن کمرے میں ماہا موجود نہیں تھی۔

"میڈم میں یہ ہی تو کہنا چاہتی ہوں کہ ماہا کمرے میں نہیں، جب میری آنکھ کھلی چیخ سن کر تو ماہا اپنے بستر پر نہیں تھی، اور چیخ کی آواز ماہا کی ہے جو غالباً اس کمرے سے آ رہی ہے۔" نیلم نے روتے ہوئے اپنے کمرے کے ساتھ موجود کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ کمرے کے دروازے پر بھاری زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔

ربیعہ نے حیرت سے نیلم کی طرف دیکھا۔

"نیلم اس کمرے کو تو تالا لگا ہوا ہے ماہا اندر کیسے ہو سکتی ہے؟ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" ربیعہ نے نیلم سے کہا۔

"نو میم وہ ضرور اس کمرے میں ہی ہوگی۔ پہلے بھی ایک لڑکی اسی طرح غائب ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے وارڈن کو نکالا گیا تھا۔" ایک اور لڑکی نے بتایا۔

"ہوں...... اگر ایسی بات ہے تو ابھی اس دروازے کو کھلواتے ہیں۔" ربیعہ کہتے ہوئے اپنے آفس کی طرف بھاگتی ہوئی گئی۔ اور چابیوں کا گچھا لئے ہوئے واپس آئی۔

"بی بی آپ اس کمرے کو بند ہی رہنے دیں۔" ہوسٹل کی ملازمہ رحمت بوا نے التجائیہ الفاظ میں کہا۔

"کیوں؟ آخر ایسا کیا ہے اس کمرے میں؟" ربیعہ اس الجھن کو سلجھانا چاہتی تھی۔ جواباً رحمت بوا نے کچھ نہ کہا بس التجائیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ ربیعہ نے ایک نظر ان کو دیکھا اور چابیوں کے گچھے میں سے تالے کی چابی تلاش کرنی شروع کر دی۔ تمام لڑکیوں کے چہرے سے پریشانی اور وحشت ٹپک رہی تھی۔ فی الحال کسی میں کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی۔

کچھ دیر کے بعد تالا کھولنے کی آواز سنائی دی۔ سب کی سانسیں سینے میں ہی رک گئیں۔ ربیعہ کو دروازہ کھولنے میں دقت ہونے لگی۔ کیونکہ ایسا لگتا تھا کہ سالوں سے دروازہ نہیں کھولا گیا تھا، خیر تھوڑی دیر بعد چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ربیعہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اندر داخل ہو گئی۔ ربیعہ کے پیچھے رحمت بوا اور نیلم بھی اندر داخل ہوئیں۔

ربیعہ دیوار پر ہاتھ مار کر سوئچ بورڈ تلاش کر رہی تھی۔ آخر اس کا ہاتھ سوئچ بورڈ پر پڑا اور کمرہ ایک دم روشنی سے نہا گیا۔ کمرے کا ماحول نہایت خوفناک تھا۔

کمرے میں لاتعداد جالے لگے تھے۔ دیواروں پر چھپکلیاں اور کاکروچ آزادانہ سیر و تفریح میں مصروف تھے۔

اس کے علاوہ خوفناک شکلوں والی بڑی بڑی مکڑیاں کمرے میں جالوں کے سہارے جھول رہی تھیں۔

فرش پر مٹی کی اتنی موٹی تہہ تھی کہ کمرے کا اصلی فرش نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہوسٹل کے دوسرے کمروں کی طرح اس کمرے میں بھی دو بستر موجود تھے۔ جو خستہ حال ہو چکے تھے۔ ایک طرف دیوار میں لکڑی کی الماری تھی جس کی حالت بستروں سے مختلف نہ تھی۔

دوسری طرف اٹیچ باتھ روم تھا۔ ربیعہ کمرے کا تفصیلی جائزہ لے کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ باتھ روم کا دروازہ بھی تھوڑی مزاحمت کے بعد کھل گیا۔ باتھ روم کی حالت دیکھ کر یکدم اس کا جی متلانے لگا۔ مختلف اقسام کے کیڑے دیواروں اور زمین پر پھر رہے تھے۔

وہ جلدی سے باہر آ گئی۔ رحمت بوا، نیلم اور باقی لڑکیاں بھی پریشان کھڑی تھیں۔ اس جگہ ماہا کا نام و نشان تک نہیں۔" ربیعہ نے سب کو مخاطب کیا۔

"کیا باقی سب جگہ تلاش کیا ہے ماہا کو؟ ہو سکتا ہے وہ باہر لان میں ہو۔ چوکیدار سے پوچھتے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ" ربیعہ سب کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر باہر کی طرف چلنے لگی۔

ابھی وہ سب لان کی طرف کھلنے والے دروازے تک پہنچی تھیں کہ دو لڑکیاں بھاگتی ہوئی آئیں۔

"میڈم ہم نے باہر لان میں اور پورے ہوسٹل میں دیکھ لیا ہے ماہا کہیں بھی نہیں ہے۔" ایک لڑکی ربیعہ سے مخاطب ہوئی۔

"ہوں......" ربیعہ نے پریشانی سے سر ہلایا۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ "چوکیدار کو بلا کر لاؤ۔"

رحمت بوا ایک لڑکی ہمراہ چوکیدار کو بلا لائیں۔

"دلاور خان تم نے ہوسٹل سے کسی لڑکی کو باہر جاتے ہوئے دیکھا یا کسی اجنبی کو اندر آتے ہوئے؟" ربیعہ نے دلاور خان سے پوچھا۔

"نہیں بیگم صاحب ام نے کسی کو نہیں دیکھا! ام کسی مشکوک آدمی کو اندر نہیں آنے دیتا۔"

"تم نے چیخ کی آواز سنی تھی؟"

"نہیں جی ام کو کسی کی چیخ نہیں سنائی دی۔"

"عجیب بات ہے نہ ماہا ہوسٹل میں ہے اور نہ ہوسٹل سے باہر گئی تو آخر کہاں، اسے زمین کھا گئی یا آسمان۔ اور نہ جانے وہ چیخ کہاں سے آئی تھی؟" ربیعہ سخت قسم کی الجھن میں مبتلا تھی۔

آج اس کا ہوسٹل کی وارڈن کی حیثیت سے پہلا دن تھا اور آج ہی اتنا بڑا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ ہوسٹل سے ایک لڑکی کا غائب ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

لڑکی کے گھر والے ان کے خلاف مقدمہ بھی کر سکتے تھے۔ ہوسٹل کی بدنامی الگ ہوتی۔ ربیعہ کا سر مسلسل چکرا رہا تھا۔ کیونکہ تمام حالات کے متعلق وہی جواب دہ تھی۔

"ٹھیک ہے دلاور تم جاؤ اور باقی سب بھی اپنے

کمروں میں چلے جائیں۔ رحمت بوا اور نیلم آپ دونوں میرے ساتھ آئیں۔" یہ کہہ کر ربیعہ اپنے آفس کی طرف بڑھ گئی۔

رحمت بوا اور نیلم ربیعہ کے سامنے بیٹھی تھیں۔

"ہاں تو نیلم! مجھے شروع سے ساری بات بتاؤ۔" ربیعہ نے روتی ہوئی نیلم سے کہا۔ اور ایک نظر گھڑی پر ڈالی جو بارہ بجا رہی تھی۔ میڈم میں اور ماہا تقریباً نو بجے سونے کے لئے لیٹ گئی تھیں۔ پھر اچانک زوردار چیخ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ماہا کے بستر کی طرف دیکھا تو وہ بستر پر موجود نہیں تھی، میں سمجھی وہ چیخ کی آواز سن کر باہر گئی ہے، یہ سوچ کر میں کمرے سے باہر آئی۔ اسی دوران دوبارہ چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں ماہا کی آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتی ہوں۔ وہ بلاشبہ ماہا کی آواز تھی۔ اور چونکہ وہ بند کمرہ بالکل ہمارے کمرے کے ساتھ اس لئے مجھے پورا یقین ہے کہ وہ آواز اسی کمرے سے آرہی تھی۔ بس یہ سب ہوا تھا جو میں نے آپ کو بتا دیا ہے اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں پتہ" نیلم نے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

"یہی تو حیرت کی بات ہے اگر آواز اس کمرے سے آرہی تھی تو ماہا کہاں گئی؟ وہ وہاں نہیں تھی، اس بات کی گواہ آپ لوگ بھی ہیں۔" ربیعہ نے رحمت بوا اور نیلم کی طرف دیکھا۔

پھر ایک دم چونک کر رحمت بوا سے مخاطب ہوئی۔ "بوا آپ مجھے کیوں وہ کمرہ نہیں کھولنے دے رہی تھیں؟"

"ماہا اب واپس نہیں آئے گی، میں نے اسے منع کیا تھا کہ اس کمرے کے بارے میں جاننے کی کوشش نہ کرو، اور اس نے میری بات نہیں مانی۔ یہ بچے بڑوں کی بات نہیں مانتے، اور اپنی من مانی کرتے ہیں۔" رحمت بوا نے اشک بار لہجے میں بتایا۔

"مطلب کیا ہے بوا آپ کا اور ایسا کیا ہے اس کمرے میں؟" ربیعہ نے حیرت سے پوچھا۔ نیلم بھی رونا بھول کر رحمت بوا کی طرف متوجہ تھی۔

"بیٹا! مت پوچھو اس بارے میں۔" رحمت بوا نے صاف انکار کر دیا۔

"بوا آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں، مجھے جواب دہ ہونا ہے، آخر سب کو کیا جواب دوں گی کہ کہاں گئی ماہا؟ اس کے ماں باپ آئیں گے تو کیا کہوں گی انہیں؟" ربیعہ نے رحمت بوا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"بیٹا! میں سمجھتی ہوں مگر اس معاملے کو بند رہنے دو، ورنہ بہت تباہی آئے گی۔" رحمت بوا بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ کسی طور پر بتانے پر راضی نہ ہو رہی تھی۔

کرسی سے اٹھ کر پریشانی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ رحمت بوا اتنی آسانی سے نہیں بتائیں گی پھر اس نے اپنے دماغ میں ایک منصوبہ ترتیب دیا جس سے وہ انہیں اصل مقصد کی طرف لا سکتی تھی۔

"نیلم تم جاؤ اپنے کمرے میں، رات بہت ہوگئی ہے آرام کرو۔" ربیعہ نے نیلم سے کہا۔

"تو میڈم نیور میں اکیلی اس کمرے میں جاؤں بالکل نہیں پلیز! میڈم مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" نیلم نے خوفزدہ انداز میں انکار کر دیا۔

"ٹھیک ہے تم میرے روم میں چلی جاؤ، میں تھوڑی دیر تک آتی ہوں۔" اب نیلم کو اٹھنا پڑا، وہ اب بھی خوفزدہ تھی اور خوف کے زیر اثر ربیعہ کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

"رحمت بوا آپ کتنے سالوں سے یہاں کام کر رہی ہیں؟" نیلم کے بعد قدرے پرسکون انداز میں ربیعہ نے بوا سے پوچھا۔

"ارے بیٹا! مجھے تو تقریباً پچیس سے تیس سال ہوگئے یہاں پر، اب تو ایسا لگتا ہے کہ یہی میرا گھر ہے۔" بوا قدرے پرجوش انداز میں بولی۔

"اور آپ کا اپنا گھر اور گھر والے؟" ربیعہ نے ایک اور سوال کیا۔

"اوہ!......" بوا نے ٹھنڈی سانس بھری پھر لمحوں بعد گویا ہوئی۔

"کیا بتاؤں بیٹا! ماں باپ نے چھوٹی عمر میں بیاہ دیا تھا۔ بیاہ کے کچھ دن بعد ہی دونوں ماں باپ حج کرنے گئے اور بس وہاں ابدی نیند سو گئے۔ اور اس سے کچھ ہی دن بعد گھر والا بھی کار ایکسیڈنٹ میں داغ مفارقت دے دیا۔ تب ہی سے یہیں ہوں" بوا دکھ کے عالم میں آپ بیتی سنا رہی تھیں کہ یک دم چونکی۔ "پر تم کیوں پوچھ رہی ہو یہ سب؟"

"بس ایسے ہی اب میں اس ہوسٹل کی سربراہ ہوں تو مجھے یہاں کے لوگوں کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے نا اس لئے۔ اور بوا آپ تو دیکھ رہی ہیں۔ پہلے دن ہی اتنی بڑی پریشانی ہوگئی ہے۔ پتہ نہیں کل صبح کیا کیا مشکلات ہوں گی، جن کا سامنا کرنا ہے۔" ربیعہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔

"ہاں بیٹا! میری مانو تو چھوڑ دو یہ نوکری، اس میں صرف اور صرف مصیبت ہے بس۔" بوا نے ہمدردانہ مشورہ دیا۔

"نہیں بوا! اتنی بزدل نہیں ہوں میں جو میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ اس معاملے کی تہہ تک ضرور جاؤں گی میں۔" ربیعہ نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"چاہے اس کے لئے تمہاری جان بھی چلی جائے۔" بوا کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" ربیعہ نے چونکتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"یہ ہوسٹل دشمن ہے وارڈن کا کوئی وارڈن ایک مہینہ سے زیادہ ٹکتی نہیں ہے یہاں پر۔" بوا نے ایک اور راز افشا کیا۔

"جانتی ہوں، اسی لئے میں یہاں آئی ہوں کہ آخر پتہ تو چلے کیوں کوئی نہیں رہتا زیادہ دن یہاں پر۔ ربیعہ مطمئن انداز میں بولی جیسے کوئی مسئلہ ہی نہ ہو...... بوا نے حیرت سے نڈر اور پراعتماد ربیعہ کو دیکھا۔

"بیٹا! میں آخری بار سمجھا رہی ہوں، چلی جاؤ واپس۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔" بوا نے پراسرار رویہ اختیار کیا۔

"کوئی تو وجہ ہوگی اس سب کی۔" ربیعہ ہنوز اطمینان سے بولی۔

"کیا کروگی جان کر وجہ؟" بوا نے کہا۔

"میں شاید واپس لوٹ جاؤں۔" ربیعہ پرسوچ انداز میں بولی۔

"تو پھر ٹھیک ہے صرف اور صرف تمہاری زندگی کی خاطر میں تمہیں بتاتی ہوں کہ کیا راز پوشیدہ ہے اس ہوسٹل میں۔ تم میرے دل کو اچھی لگی ہو۔ بالکل ایسی ہوتی میری اپنی بیٹی اگر ہوتی تو۔ خیر تم بھی میری بیٹی جیسی ہو، اس لئے تمہیں بھلا برا بتانا میرا فرض ہے۔" بوا نے پیار بھری نظروں سے ربیعہ کی طرف دیکھا۔ ربیعہ بے چینی سے بوا کے بولنے کی منتظر تھی۔

آہستہ آہستہ بوا بولنا شروع ہوئی۔

"یہ آج سے تقریباً 10 سال پہلے کی بات ہے۔ یہاں کی ایک وارڈن بہت سخت مزاج تھی۔ بلا ضرورت سختیوں سے ہوسٹل کی لڑکیاں اس بدظن ہو چکی تھیں۔ اور جان بوجھ کر اس کے اصول کے خلاف کام کرتی تھیں۔ وہ جو بند کمرہ ہے نا اس میں دو لڑکیاں رہتی تھیں۔ "نازش اور ہاجرہ" وہ دونوں بھی ہوسٹل کی دوسری لڑکیوں کی طرح وارڈن کو تنگ کرنے کے لئے رولز کو توڑتی تھیں۔ اور بس وہ دونوں اس کی نظروں میں آگئیں۔

ایک روز نازش بازار کچھ سامان خریدنے گئی تھی۔ اس دن اچانک شہر کے حالات خراب ہوگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر میں گھیراؤ جلاؤ ہونے لگا۔ ٹرانسپورٹ غائب ہوگئی۔

نازش نے فون کر کے وارڈن کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا کہ جیسے ہی کوئی سواری ملی فوراً آجاؤں گی۔

مگر وارڈن نے نازش سے بدلہ لینے کا سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

نازش کے ہوسٹل واپس آنے تک یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ نازش اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

نازش کے لئے یہ خبر کسی قیامت سے کم نہ تھی۔
نازش کے گھر والے پہلے ہی شکی مزاج قسم کے تھے۔ اس خبر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

نازش ابھی ہوسٹل میں آئی ہی تھی کہ وارڈن نے ایک اور چال چلی نازش کے گھر فون کر کے کہہ دیا کہ نازش جس کے ساتھ بھاگی تھی۔ وہ دھوکہ کر گیا ہے اس لئے نازش واپس آ گئی ہے۔

وارڈن شگفتہ آگ لگا کر اب آرام سے تماشہ دیکھ رہی تھی۔

نازش نے لاکھ اپنے گھر والوں کو سمجھایا پر بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ ہوسٹل، کالج اور یہاں تک کہ اس کے خاندان بھر میں اس بات کا چرچا ہو گیا۔

نازش کے بھائیوں کی غیرت کو یہ بات گوارا نہ ہوئی۔ انہوں نے ہوسٹل کے اس کمرے میں نازش کا بے رحمی سے قتل کر دیا۔

بس اس دن سے اس ہوسٹل کے برے دن شروع ہو گئے۔ نازش کے قتل کے بعد ہاجرہ اس ہوسٹل کو چھوڑ کر چلی گئی۔

پھر کچھ ہی دنوں بعد وارڈن شگفتہ کی لاش نہایت بری حالت میں اسی کمرے سے ملی۔

اس واقعہ کے بعد کوئی بھی وارڈن ایک مہینہ سے زیادہ رہ نہیں پاتی۔ نازش کی روح ہر وارڈن سے اپنی انتقامی آگ بجھانے کے لئے بدلہ لیتی ہے۔ اسے ہر وارڈن مجرم لگتی ہے۔ وہ کسی اور کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتی لیکن جو اس کمرے سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ اسے معاف نہیں کرتی۔ بس کچھ ایسا ہی معاملہ ماہا کے ساتھ بھی ہوا ہے وہ بھی اس کمرے کے متعلق جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔"

بوا اپنی بات مکمل کر کے ربیعہ کے تاثرات کا جائزہ لینے لگی۔ ربیعہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور کچھ دیر تک بوا کی طرف دیکھتی رہی۔

"آپ کو کیا لگتا ہے بوا جب میں ماہا کے ماں باپ کو اور ہوسٹل کے انتظامیہ کو یہ واقعہ سناؤں گی تو وہ میری بات کا یقین کر لیں گے۔"

ربیعہ نے پوچھا تو دو پل کے لئے رحمت بوا بوکھلا گئیں۔

"ہاں بیٹا تم ٹھیک کہہ رہی ہو کوئی بھی شاید یقین نہ کرے۔ اور مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے بھی یقین نہیں کیا۔ خیر میرا کام تمہیں آگاہ کرنا تھا باقی تم اپنے فیصلوں میں با اختیار ہو۔" رحمت بوا بوجھل آواز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر جاتے جاتے پلٹیں اور ربیعہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

"لیکن بیٹا حقیقت چاہے کتنی ہی ناقابل یقین ہو ایک نہ ایک دن اسے ماننا پڑتا ہے۔"

"ہاں بوا آپ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ بس ایک بار یہ ماہا والے معاملے کا کوئی حل نکل آئے پھر میں کوئی فیصلہ کرتی ہوں۔ آخر اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔" جاتے جاتے بوا کو ربیعہ کی آواز سنائی دی اور وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل گئیں۔

بوا کے جانے کے بعد ربیعہ نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے سامنے معصوم ماہا کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد اٹھ کر باہر آ گئی۔ لاؤنج میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی نیلم اس کے بستر پر گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اس کے گالوں پر اب بھی آنسو کے نشان موجود تھے۔

ربیعہ کو بے ساختہ اس معصوم لڑکی پر پیار آیا جو اپنی دوست کے بچھڑ جانے پر غمزدہ تھی۔ اس نے نیلم کے اوپر کمبل ڈال دیا اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی جو باہر لان میں کھلتی تھی۔ کھڑکی کے راستے سرد ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ ربیعہ نے بے ارادہ نظر پورے لان پر ڈالی اور یہ دیکھ کر وہ چونک گئی کیونکہ دور لان کے ایک کونے میں دو سائے متحرک تھے۔ یہ دیکھ کر وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی باہر لان میں گئی۔

لیکن اب دور دور تک کسی ذی روح کا وجود تک نہ تھا۔ وہ حیرت سے اس جگہ کی طرف بڑھی جہاں اس نے وہ مشکوک سائے دیکھے تھے۔ لیکن اب وہاں سوائے اندھیرے اور سناٹے کے کچھ بھی نہ تھا۔

"اف خدایا! آخر کون تھے وہ اور کہاں؟ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ لگے ہوں گے مجھے یہاں آتے ہوئے اتنی سی دیر میں کہاں جا سکتے ہیں وہ" ربیعہ پرسوچ انداز میں چلتی ہوئی اندر آ گئی۔

"وہ جو کوئی بھی تھے ہوسٹل کے فرد تھے۔" ربیعہ نے سوچوں کے گھوڑے کو دوڑایا اب رحمت بوا کے دروازے کے سامنے موجود تھی۔ لیکن یہ کیا! رحمت بوا کا دروازہ تو اندر سے بند تھا۔

گویا وہ اندر موجود تھیں۔ پھر باری باری اس نے تمام دروازے چیک کر لیے سارے دروازے بند تھے۔ تھک ہار کر واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

"کوئی بہت بڑا مسئلہ ہے یہ اور اگر اندر سے نہیں تو باہر سے ضرور کوئی ملوث ہے اس معاملے میں۔

نہیں وہ نازش کی روح بھی تو ہو سکتی ہے۔

اس کا مطلب ہے میری جان کو خطرہ ہے۔

نہیں پر میں نے دو سائے دیکھے تھے آخر وہ کر کیا رہے تھے وہاں؟

اور پتہ نہیں ماہا کہاں گئی؟ اگر وہ اس کمرے میں تھی تو کم از کم کوئی ثبوت تو ملنا چاہیے تھا۔ اس کی وہاں موجودگی کا۔

پوری رات ربیعہ کا دماغ مختلف قسم کی سوچوں کا آماج گاہ بنا رہا۔ وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح ایک اور ہنگامہ اس کا منتظر تھا۔ نیلم نے ماہا کے گھر والوں کو ماہا کی گمشدگی کی خبر دے دی تھی۔ ان لوگوں نے آ کر خوب ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ وہ ہوسٹل کے انتظامیہ سے ماہا کی بازیابی کا مطالبہ زور و شور سے کر رہے تھے بڑی مشکل سے انہیں سمجھا بجھا کر واپس بھیجا گیا۔ اس یقین دہانی کے ساتھ کہ بہت جلد ماہا مل جائے گی۔

پولیس اپنی تفتیش میں مصروف تھی۔ سب لوگوں سے ازسرنو بیانات لیے گئے۔ ربیعہ نے پولیس کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا پر رات کو نظر آنے والے سایوں کی بات گول کر گئی۔ پولیس نے بند کمرے کی تفصیلی تلاشی لی۔ مگر کوئی قابل ذکر چیز نہ ملی۔ اس طرح چند دنوں کے لئے معاملہ تھوڑا سا دب گیا۔

اور پھر ہوسٹل میں ایک اور وجود کا اضافہ ہوا۔

حسب معمول سب لڑکیاں ناشتے کے بعد کالج جا چکی تھیں۔ رحمت بوا صفائی کر رہی تھیں۔ اور ربیعہ گزشتہ حالات و واقعات کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب اچانک اسے باہر سے آوازیں آنے لگیں۔

ربیعہ نے باہر آ کر دیکھا۔ ایک عورت جس کی عمر 30 سے 35 سال کے درمیان تھی۔ سفری بیگ تھامے رحمت بوا اس سے جوش و خروش سے باتوں میں مصروف تھیں۔ جب اس کی نظر ربیعہ پر پڑی تو وہ فوراً ربیعہ کی طرف لپکی۔

"ہائے آپ نئی وارڈن ہیں، بہت کم عمر لگتی ہو، رب جھوٹ نہ بلوائے تو کبھی اتنی سوہنی وارڈن اس ہوسٹل میں نہیں دیکھی میں نے" وہ بے تکلفی سے بولتی ہوئی ربیعہ کے گلے لگ گئی۔

ربیعہ حیرت سے اس نو وارد کے انداز و اطوار دیکھ رہی تھی۔ اس کی انتہاء درجے کی بے تکلفی اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ وہ برسوں سے یہاں قیام پذیر تھی۔

ربیعہ نے سوالیہ نظروں سے رحمت بوا کی طرف دیکھا۔

"بیٹا یہ یہاں ہوسٹل میں کھانا پکاتی ہے اپنے بھائی کی شادی میں چھٹیاں لے کر گئی ہوئی تھی۔ اس لئے ان دنوں میں نے کچن سنبھالا ہوا تھا۔" رحمت بوا نے بتایا۔

"آپ نے پہلے مجھے ان کے بارے میں نہیں بتایا۔ عجیب بات ہے ہوسٹل کے ایک اہم فرد کے تعارف سے مجھے محروم رکھا گیا۔" ربیعہ کے ماتھے پر ناگواری کی لکیریں پڑ گئیں۔

"ارے نہیں بیٹا! بھلا ہم نے کیوں چھپانا تھا

کچھ بھی تم سے وہ تو بس تمہارے آتے ہی اتنے مسئلے بن گئے کہ کچھ بتانے کا موقع ہی نہ ملا، بوا نے بوکھلا کر وضاحت دی۔

ربیعہ کچھ کہے بنا واپس اپنے آفس میں چلی گئی ۔مگر اس کے ماتھے پر شکنیں ابھی تک موجود تھیں۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ ’’یس کم ان‘‘ ربیعہ کے کہتے ہی وہ عورت ٹرے میں دو کپ چائے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

’’السلام علیکم جی! مجھے پتہ ہے آپ بوا سے ناراض ہو پر مجھ سے تو ناراض نہ ہو، میرا بھلا کیا قصور ہے جی۔ میں آپ کی ناراضگی دور کرنے کے لئے چائے لائی ہوں، پتہ ہے ہمارے پنڈ میں جب کوئی ناراض ہوتا ہے تو چائے پلاتے ہیں، بس پھر کیا جھٹ ناراضگی دور‘‘ وہ نہایت باتونی معلوم ہوتی تھی۔ ربیعہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ خالص دیہاتی انداز میں بات کر رہی تھی۔ ربیعہ اس عورت جس کا نام پروین تھا کی کمپنی کو خوب انجوائے کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

’’لبنیٰ پلیز یار مان لو نا میری بات آخر دیکھیں تو سہی ایسا کیا ہے وہاں پلیز! پلیز! سحر کب سے لبنیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ تھی کہ راضی ہو کر نہ دے رہی تھی۔

’’دیکھو سحر میں نے آج تک تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ پر آج نہیں ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ تمہیں ہر روز کوئی نہ کوئی ایڈونچر سوجھا ہوتا ہے۔‘‘ لبنیٰ سحر کی فطرت سے سخت جھنجھلائی ہوئی تھی۔

’’بس آج میری بات مان لو آگے سے کبھی تمہیں کسی کام کے لئے پریس نہیں کروں گی۔‘‘ سحر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

’’اچھا اب ہاتھ جوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہم وہاں کیسے جائیں گے؟‘‘ لبنیٰ نے اہم نکتہ اٹھایا۔

’’ارے تم فکر نہ کرو، میں بس ابھی آئی۔‘‘ وہ خوشی سے کہتے ہوئے باہر بھاگی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد چابیوں کے گچھے کے ساتھ وارد ہوئی۔

’’سحر اگر مس ربیعہ کو پتہ چل گیا تو؟‘‘ سحر کی حرکتیں لبنیٰ کو سخت پریشان کر رہی تھیں۔

’’انہیں بتائے گا کون تم یا پھر میں؟‘‘ سحر نے اس انداز میں کہا کہ لبنیٰ خاموش ہو گئی اس کے علاوہ چارہ بھی کوئی نہیں تھا۔

اب وہ دونوں بند کمرے کے سامنے تھیں۔ سحر نے تالا کھولا اور دونوں اندر داخل ہو گئیں۔ کمرہ پہلے سے قدرے بہتر حالت میں تھا۔ پولیس نے تفتیش کے دوران یہاں کی صفائی کروائی تھی۔

’’سحر یار جو بھی کرنا ہے جلدی کرو اور واپس چلو۔‘‘ لبنیٰ کا نا جانے کیوں دل گھبرا رہا تھا۔

’’چلتے ہیں اتنی جلدی کیا ہے۔‘‘ لبنیٰ کے مقابلے میں سحر پر اطمینان تھی۔

سحر گھوم پھر کر کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جبکہ لبنیٰ ایک ہی جگہ کھڑی تھی۔ اچانک لبنیٰ کے پاؤں پر سے ایک کاکروچ بھاگتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ اس اچانک حملے پر اس سے پہلے کہ لبنیٰ کے منہ سے چیخ نکلتی کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ کو روک دیا۔ لبنیٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

’’کیا کر رہی ہو کاکروچ تھا کوئی بھوت نہیں جو تم ابھی۔ چیخ کر سارے ہوسٹل کو جمع کرنے کی تھی۔‘‘ سحر نے اسے ڈانٹا۔

’’تھینک گاڈ تم تھی، میں سمجھی پتہ نہیں کس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔‘‘ لبنیٰ نے سکون کا سانس لیا پھر بولی۔ ’’بس اب چلو سحر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔‘‘

’’اچھا چلتے ہیں۔‘‘ سحر لاپرواہی سے کہتی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ پہلے لبنیٰ کا دل چاہا وہ سحر کے پیچھے جائے پھر نہ جانے کیوں وہ وہاں ہی رکی رہی۔ سحر کے اندر جانے کے کافی دیر بعد سحر کی آواز آئی۔

’’لبنیٰ دیکھو تو سہی مجھے کیا ملا ہے جلدی آؤ۔‘‘

’’سحر پلیز! میں یہاں ہی ٹھیک ہوں تم باہر آؤ واپس چلیں ورنہ میں جا رہی ہوں۔‘‘ لبنیٰ نے سخت لہجے میں کہا۔ لیکن سحر کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ لبنیٰ نے کچھ دیر مزید انتظار کیا پھر دوبارہ آواز لگائی۔

’’سحر آ بھی جاؤ۔‘‘ پر جواب ندارد۔

لبنیٰ کی چھٹی حس اسے کچھ غلط ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ فوراً اسے پیشتر باتھ روم کی طرف گئی۔ مگر یہ کیا باتھ روم کا منظر اس کے اوسان خطا کر دینے کے لئے کافی تھا۔

وہ الٹے پاؤں بھاگتی ہوئی ربیعہ کے کمرے کی طرف آئی اور دھڑا دھڑ اس کے کمرے کا دروازہ بجانے لگی۔

☆......☆......☆

رات کے تقریباً 12 رہے تھے پر نیند ربیعہ کی آنکھوں سے دور کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اسے میٹھی نیند سوئی ہوئی نیلم کو دیکھ کر رشک آ رہا تھا۔ جب سے ماہا گمشدہ ہوئی تھی نیلم اس کے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ چند لمحوں تک ایک رسالے کی ورق گردانی کرتی رہی پھر جلد ہی اکتا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

کچھ دیر بعد وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی چینل سرچ کر رہی تھی۔ یہ سہولت ہوسٹل میں وارڈن کے سوا کسی کو میسر نہ تھی۔ چینل سرچنگ کے مشغلے سے اکتا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستگی سے چلتی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ دور آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ماحول پر پراسرار سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس سناٹے میں دور لان کے ایک کونے میں دو سائے متحرک تھے۔ ربیعہ یک دم چونکی ہو گئی۔ آج وہ یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ ابھی مڑی ہی تھی۔ کہ دروازہ زور زور سے پیٹا گیا، دستک دروازے کے پیچھے موجود فرد کی شدید عجلت کو ظاہر کر رہی تھی۔

’’یا اللہ خیر‘‘ ربیعہ ہولتے دل کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔

دروازے پر ہوسٹل کی ہی ایک لڑکی لبنیٰ کھڑی تھی۔ ربیعہ کے دروازہ کھولتے ہی وہ تیزی سے اس کے گلے لگ گئی۔ اور ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

’’مس وہ......وہ......مس......! سحر‘‘ ہچکیوں کے بیچ اس سے صرف اتنا ہی بولا جاسکا۔

’’ریلکس......ریلکس......لبنیٰ بیٹھو یہاں۔‘‘ ربیعہ نے اسے کرسی پر بیٹھایا۔ اور پانی دیا۔

’’پہلے یہ پانی پیو پھر آرام سے مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔‘‘ ربیعہ نے نرم لہجے میں کہا۔

لبنیٰ نے پانی پیا جب اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے آہستہ آہستہ ربیعہ کو تمام حالات تفصیل سے سنا دیئے۔

’’یعنی سحر بھی ماہا کی طرح وہاں سے غائب ہو گئی۔‘‘ ربیعہ نے لبنیٰ سے دوبارہ تصدیق چاہی۔

’’جی مس......! جب میں باتھ روم گئی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔‘‘ لبنیٰ ایک بار کہہ کر دوبارہ رونے لگی۔ ربیعہ کو ان لوگوں کی حرکت پر غصہ تو بہت آ رہا تھا۔ مگر لبنیٰ کی حالت کے پیش نظر وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی۔ شور کی آواز سن کر نیلم بھی اٹھ کر ان کے پاس آ گئی تھی۔

’’آؤ دیکھیں ذرا اس جگہ کو‘‘ ربیعہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

’’نہیں مس آپ وہاں نہ جائیں پلیز! نیلم نے جلدی سے ربیعہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکنا چاہا۔

’’ہاں مس آپ وہاں نہ جائیں نیلم ٹھیک کہہ رہی ہے آپ کو کچھ ہو گیا تو؟‘‘ لبنیٰ نے بھی گھبرائے ہوئے انداز میں نیلم کی تائید کی۔

’’کم آن گرلز! اگر تم لوگ نہیں جانا چاہتیں تو ٹھیک ہے میں ابھی آتی ہوں۔‘‘ ربیعہ نے نیلم سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے روکتیں۔ ربیعہ بھاگتی ہوئی بند کمرے میں آ گئی۔ اور متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ پھر باتھ روم میں جا کر وہاں کا معائنہ کرنے لگی۔

لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی جس سے کوئی معلومات ملتی۔ ابھی وہ واپس جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ کسی احساس کے تحت واپس پلٹی۔ وہ اپنے شک کی تصدیق کے لئے آگے بڑھی اور پھر جو منظر اس نے دیکھا وہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے موجود منظر کو دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

"ہیلو! انسپکٹر ارسلان اسپیکنگ......" فون سے ارسلان کی آواز آئی۔

"جی انسپکٹر میں ربیعہ بات کررہی ہوں، آپ پلیز! جلدی سے یہاں پہنچیں۔" ربیعہ نے بے چینی سے کہا۔

"رات کے 2 بجے خیریت تو ہے نا۔" انسپکٹر ارسلان نے پریشان ہوکر کہا۔

"آپ فوراً سے پیشتر یہاں پہنچیں، میں آپ کو حالات سے آگاہ کردوں گی۔" ربیعہ نے کہا اور فون رکھ دیا۔ اب وہ بے چینی سے انسپکٹر ارسلان کا انتظار کررہی تھی۔

تقریباً 20 منٹ بعد انسپکٹر اپنے تین ماتحتوں کے ساتھ پہنچ گیا۔

"جی اب آپ بتائیں کیا ایمرجنسی ہے؟" انسپکٹر نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"لبنیٰ، نیلم تم دونوں باقی سب کو اٹھاؤ اور انسپکٹر صاحب! میرے ساتھ آئیں۔" ربیعہ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگی اس کا رخ بند کمرے کی طرف تھا۔

انسپکٹر اور اس کے ماتحت ربیعہ کے پیچھے تھے۔

باتھ روم میں پہنچ کر ربیعہ نے پیچھے مڑ کر انسپکٹر کی طرف اور پھر آگے بڑھ کر سوئچ بورڈ پر ایک بٹن دبا دیا۔ اچانک سامنے موجود دیوار میں شگاف ہوا اور باہر لان کی ہری بھری فضا نظر آنے لگی۔

"ارے......یہ......یہ کیا......" انسپکٹر کے منہ سے حیرت ناک آواز آئی۔

"اب آپ میرے ساتھ آئیں۔" ربیعہ کہتے ہوئے اسی شگاف سے باہر نکل گئی اب اس کا رخ چوکیدار کے کیبن کی طرف تھا۔

کیبن کے دروازے پر پہنچ کر اس نے زور زور سے دروازہ بجایا۔ کچھ ہی دیر بعد دلاور خان کا چہرہ نظر آیا۔ سامنے ربیعہ اور پولیس کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور جلدی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انسپکٹر پہلے ہی چوکنا ہوچکا تھا۔ اس نے فوراً دلاور خان کو روکا اور دھکا دے دیا۔ پھر سب لوگ اندر داخل ہوگئے۔

رحمت بوا، پروین، لبنیٰ اور نیلم کے علاوہ۔ ہوسٹل کی باقی لڑکیاں بھی وہاں آنکھوں میں حیرت لئے موجود تھیں۔

سامنے موجود بستر پر سحر بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔

"تو یہ ہے نازش کی روح۔" ربیعہ نے استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے دلاور خان کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا تو تم ہو نازش ک روح۔" انسپکٹر نے کہتے ہوئے ایک زوردار تھپڑ دلاور خان کے منہ پر دے مارا۔ دلاور خان اس اچانک حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ اس کا ہونٹ پھٹ گیا۔ اور خون رسنے لگا۔ وہ ہاتھ سے خون صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور ہراساں نظروں سے انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

"سر شاید آپ کو پتہ نہیں نازش کی ایک نہیں دو روحیں ہیں۔" ربیعہ کے کہتے ہی سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

"کیا مطلب؟" آخر نیلم بول پڑی۔

"مطلب یہ کہ دلاور خان کے ساتھ ایک اور شخص بھی ہے جو ہم میں سے ایک ہے۔" ربیعہ کے انکشاف نے سب کو دم بخود کردیا۔ سب اپنی اپنی جگہ حیرت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور ایک دوسرے کو پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"کیوں دلاور خان تم خود بتاؤ گے یا میں بتاؤں۔" ربیعہ نے دلاور خان سے پوچھا۔ دلاور خان نے کوئی جواب نہ دیا وہ مسلسل اپنے ہاتھوں کو گھورے جارہا تھا۔

"اچھا چلو میں بتا دیتی ہوں وہ کوئی اور نہیں ہماری بہت ہی قابل احترام رحمت بوا ہیں۔" ربیعہ نے گویا دھماکہ کیا۔

سب حیرت سے رحمت بوا کی طرف دیکھنے لگے ہر کسی کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"ربیعہ بیٹا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" بوا نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیوں بوا آپ کو اچھا لگے گا کہ آپ کا بیٹا دلاور خان تو جیل جائے اور آپ یہاں عیش کریں۔" ربیعہ نے بوا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

بوا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اب تو سارا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔

"لیجئے انسپکٹر میں نے آپ کے مجرم پکڑ لیے ہیں اب ان سے یہ اگلوانا آپ کا کام ہے کہ یہ کس گینگ سے تعلق رکھتے ہیں۔" ربیعہ نے کہا تو انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جاؤ لے جاؤ ان دونوں ماں بیٹے کو اگر سیدھے طریقے سے سب کچھ بتاتے ہیں تو ٹھیک ورنہ ڈرائنگ روم کی سیر کروادو انہیں۔" انسپکٹر ارسلان نے ماتحتوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جی سر" تینوں نے سیلوٹ کیا۔ اور رحمت بوا اور دلاور خان کو لے کر باہر چلے گئے۔

"ویل ڈن انسپکٹر ربیعہ اظہر، یوڈن آ گریٹ جاب مجھے آپ سے یہ ہی امید تھی۔" انسپکٹر ارسلان نے خوش دلی سے کہا۔

"جی نہیں اب آپ جھوٹ نہ ہی بولیں تو بہتر ہے آپ کو تو مجھ میں کوئی خوبی نظر ہی نہیں آتی، یہ تو میں نے ہی اس کیس کو زبردستی لیا تھا، ربیعہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو ارسلان جو کہ ربیعہ کا منگیتر بھی تھا بے ساختہ

ہنس دیا۔
''او مائی گاڈ! مس ربیعہ آپ...... اسپیشل انوسٹی گیشن آفیسر ہیں؟'' لبنیٰ حیرت سے چیخ پڑی۔
جواباً ربیعہ نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ جس میں ہاں پوشیدہ تھی۔
''مس کیا آپ ہمیں بتانا پسند کریں گی کہ آپ نے یہ سب کیسے معلوم کیا؟ نیلم نے پوچھا۔
''ہاں بھئی! ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ مس ربیعہ کا دماغ کتنا تیز ہے۔'' ارسلان نے شرارت سے کہا۔
ربیعہ نے ایک شکوہ بھری نگاہ اس پر ڈالی اور پھر سب کو دیکھا جو حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات لیے اس کی طرف متوجہ تھے۔ ربیعہ سب کا اشتیاق دیکھتے ہوئے بولنا شروع ہوئی۔
''پچھلے کچھ سالوں سے ہوسٹل سے لڑکیوں کا غائب ہونا عام ہوتا جارہا تھا۔ جو شہریوں کے ساتھ ساتھ محکمہ پولیس کے لئے بھی باعث تفتیش تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی ہوسٹل سے کوئی لڑکی غائب ہوتی۔ ان میں سرفہرست یہ ہوسٹل تھا۔ بہت تحقیق کے بعد بھی پولیس اصل مجرموں تک پہنچنے سے قاصر تھی۔ پھر بہت سوچ بچار کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ان ہوسٹلز میں رہ کر معاملات کا جائزہ لیا جائے اور میں نے اس کام کے لیے اپنی خدمات پیش کردیں۔ حالانکہ کچھ لوگوں نے راستے میں روڑے اٹکانے کی بھی کوشش کی۔'' ربیعہ نے شرارت سے ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔
''بہر حال میں یہاں وارڈن کے طور پر آگئی۔ اور پہلے ہی دن ماہا گم شدہ ہوگئی۔ میں اس بات سے خاصی پریشان ہوگئی۔ رحمت بوا سے بات کی تو انہوں نے مجھے نازش کی روح سے متعلق ساری کہانی سنائی۔ جس پر میں نے بالکل یقین نہ کیا۔
خیر میں نے رحمت بوا پر ظاہر کردیا کہ میں کچھ دنوں بعد واپس چلی جاؤں گی جس سے وہ پرسکون ہوگئیں۔ پھر پروین وارد ہوئی۔'' ربیعہ نے مسکرا کر پروین کی طرف دیکھا۔
''اور جو معلومات مجھے پروین نے رحمت بوا کے بارے میں دیں وہ رحمت بوا کے بیان سے مختلف تھیں۔
پروین یہاں تقریباً پانچ سال سے کام کررہی تھی اور اس کے مطابق رحمت بوا اور دلاور خان پچھلے دو سال سے یہاں ملازم تھے اور دو سال سے ہی لڑکیاں غائب ہونا شروع ہوئی تھیں۔
وہ دونوں لڑکی کو غائب کرکے کمرے میں چھپا دیتے تھے۔ اور خود مل کر سب کے ساتھ پورا ہوسٹل چھان مارتے چوکیدار کے کمرے کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ جاتا۔ اور جب معاملہ ٹھنڈا ہوجاتا تو لڑکی کو نکال کر اپنے گروہ کے حوالے کردیتے جو بیرون ملک انہیں فروخت کردیتے یہ سب معلومات مجھے خاص آدمیوں سے ملیں۔
لیکن میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت یا گواہ نہیں تھا۔ پھر میں نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کا پلان بنایا۔ اور جلد ہی یہ موقع مجھے سحر کے ذریعے مل گیا۔ بس آگے کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔'' ربیعہ نے ساری تفصیل بتادی۔
''تھینک یو مس! آپ کی وجہ سے ہمیں ان آستینوں کے سانپوں سے نجات ملی۔'' پروین نے کہا۔
''پروین اگر تم نہ ہوتی تو شاید میں اتنی جلدی ان تک نہ پہنچ پاتی۔'' ربیعہ نے خوش دلی سے اعتراف کیا۔
''او کے ربیعہ اب میں چلتا ہوں بہت جلد آپ سے ملاقات ہوگی۔'' ارسلان اٹھ کھڑا ہوا۔
''اور سر ماہا وہ کب ملے گی؟'' نیلم نے بے تابی سے پوچھا۔
''آپ سب فکر نہ کریں بہت جلد ماہا آپ کے ساتھ ہوگی۔'' ارسلان نے کہا اور چلا گیا۔
باقی ساری لڑکیاں بھی اپنی اپنی جگہ خوش و مطمئن ہوکر اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئیں۔

جناتی گھر

نظارت نصر۔ فیصل آباد

راستے کی گلی میں ایک عجیب بدشکل کھردرے چہرے والا آدمی کھڑا تھا، اور بولا۔ "اگر آج کے بعد تم نے ہمارے ساتھ پنگا لینے کی کوشش کی تو وہی حال تمہارا کروں گا جو کہ اس عامل کا کیا تھا اور پھر وہ اچانک نظروں سے غائب ہوگیا۔

ایک دہشت ناک جن کے بھیانک ٹکراؤ کی ناقابل فہم تحیر انگیز اور خونچکاں کہانی

''میرا کڑی نال میل کرادے تے رباتیرا کی جائے گا
ساڈا چھڑیاں دا ویاہ وی کرادے تے رباتیرا کی جائے گا''
غسل خانے سے گلزار کی بھدی آواز بڑے تواتر سے بلند ہورہی تھی۔ کچھ دیر تک امجد برداشت کرتا رہا پھر ایک دم پھٹ پڑا۔
''اے او کڑی کے عاشق! اب اگر تیری راگنی بجی تو سو جوتے گن کے ماروں گا تیرے سر پر صبح ہی صبح دماغ خراب کرکے رکھ دیا تو نے۔''
آج اس کی ناشتہ تیار کرنے کی باری تھی اور اسے کھانے بنانے کا کام نہ صرف بہت برا لگتا تھا بلکہ وہ اسے واجبی سا ہی کرتا تھا۔ ایک تو اس کا موڈ پہلے ہی بگڑا ہوا تھا اوپر سے گلزار کی بھدی پھٹی ہوئی آواز نے اسے مزید

آتش زیرپا کردیا۔ اس کی جھاڑ کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ اس کے بعد گلزار نے خاموشی سے نہانا شروع کردیا۔

وہ دونوں اپنے گاؤں سے ایک ساتھ مزدوری کرنے شہر میں آئے تھے۔ پہلے پہل تو انہیں سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر سونا پڑا۔ پھر جب چھوٹی موٹی نوکری ملی تو انہوں نے کرائے کے اس دڑبے نما فلیٹ کا بندوبست کرلیا۔ اس میں صرف ایک کمرہ تھا۔ اور ایک چھوٹا سا غسل خانہ۔ کمرے کے آگے چند گز کا صحن تھا جس کے ایک کونے میں چولہا اور چند برتن پڑے تھے۔ ان کی کمائی اور ضرورت کے مطابق انہیں یہ جگہ صحیح لگتی تھی۔

گلزار اس کے تولیے سے سر رگڑتا باہر آگیا۔

''کیا بات ہے لالے! صبح ہی صبح جھاڑ پلادی۔ کیا پتہ کہ میری دعا قبول ہو ہی جاتی تو میرے ساتھ ساتھ تیرا بھی بھلا ہوجاتا۔ اور تجھے یہ کام بھی کرنے نہ پڑتے جواب کررہا ہے۔''

امجد نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنس پڑا۔

''اچھا اچھا! زیادہ غصہ مت دکھا۔ لا چائے دے بلکہ کڑوہ قہوہ دودھ تو ہوگا ہی نہیں۔ اور پراٹھوں کی جگہ تو نے جلی ہوئی روٹیوں کو گھی میں تر کردیا ہوگا۔''

''اب اگر تو نے اپنی زبان ہلائی تو میں گدی سے کھینچ لوں گا۔ اگر اتنا ہی برا لگتا ہے میرا بنایا ہوا ناشتہ تو خود تیار کرلیا کر خود تو جیسے تو کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا شیف ہے ناں!''

امجد کے جلے بھنے انداز پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پھر مصالحت آمیز انداز میں بولا۔

''چل ٹھیک ہے۔ ایسا کرلے، تو کپڑے برتن دھویا کر اور سودا لایا کر اور میں تیری بیوی بن کر ہانڈی روٹی کروں گا۔'' امجد نے جلدی سے کہا۔

''کپڑے برتن بھی بیوی ہی دھوتی ہے صرف سودا شوہر لاتا ہے۔'' دونوں ہنسنے لگے۔ اس طرح کی نوک جھونک روز کا معمول تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوکر دونوں اپنے اپنے کام پر نکل گئے۔ امجد ایک ہوزری (بنیان کی فیکٹری) میں کام کرتا تھا۔ جبکہ گلزار جوتے بنانے والی فیکٹری میں ورکر تھا۔

شام کو جب امجد گھر لوٹا تو یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوگئے کہ صحن میں چولہے کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ آہٹ پر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ امجد کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ وہ عورت نہیں بلکہ بیس بائیس سال کی ایک انتہائی حسین لڑکی تھی۔ امجد اپنی جگہ جما کھڑا رہ گیا۔ لڑکی اسے دیکھتے ہوئے اٹھی اور انگلوتے کمرے کے اندر چلی گئی۔

امجد کو حیرت کی جگہ پریشانی نے گھیر لیا۔ دو کنوارے لڑکوں کے مکان میں ایک لڑکی کی موجودگی، ان کے لئے کیسے کیسے امتحان کھڑے کرسکتی تھی۔ امجد نے جھرجھری سی لی۔ محلے والے سب شریف لوگ تھے ''وہ تو جوتے مار کر ہمیں ابھی نکال دیں گے۔ آخر یہ لڑکی آئی کہاں سے ہے؟'' وہ بڑبڑاتا ہوا پلٹ کر گھر سے باہر نکل کھڑا ہوگیا۔ تب پہلی مرتبہ اسے خیال آیا کہ جب وہ آیا تھا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایسا عموماً ہوجاتا تھا۔ کیونکہ گلزار کی فیکٹری نزدیک تھی وہ امجد سے پہلے گھر پہنچ جاتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ ہوسکتا ہے یہ گلزار کی کوئی واقف کار ہو۔ ایسی صورت میں یقیناً گلزار بھی گھر میں ہی ہوگا۔ اس نے باہر کھڑے کھڑے اندر جھانک کر دیکھا۔ کمرے کا دروازہ جبکہ غسل خانے کا بھی کھلا ہوا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے گلزار کو بلند آواز سے پکارا۔ مگر کوئی جواب نہ پا کر خاموش ہوگیا۔

''کیا بات ہے۔ اپنا ہی گھر ہے۔ چوروں کی طرح کیوں جھانک رہے ہو۔'' اپنے پیچھے گلزار کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔ گلزار نے ہاتھ میں سودا سلف والے دو تین شاپر پکڑے ہوئے تھے امجد نے اسے نظر انداز کرکے تیز لہجے میں پوچھا۔

''اندر جو لڑکی ہے وہ کون ہے؟'' گلزار نے ایک نظر اسے دیکھ کر بے نیازی سے کہا۔

''ابے ہوگی کون تیری بھابھی ہے۔ چل جلدی سے اندر آجا، میں بازار سے کھانا لایا ہوں۔ ٹھنڈا نہ ہوجائے۔''

امجد ارے ارے کرتا رہ گیا۔ مگر گلزار تیزی سے گھر میں گھس گیا ناچار وہ بھی اندر آگیا۔ بہت سے سوالوں نے دماغ میں اودھم مچایا ہوا تھا۔ آخر گلزار جیسے معمولی شکل صورت والے غریب نوجوان کو اتنی حسین لڑکی مل کیسے گئی اور کہاں سے۔ پھر اچانک شادی، جس میں امجد تک شریک نہیں تھا۔ مگر ان سب سوالوں کے جواب دینے کے لئے گلزار وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اندر کمرے میں جاچکا تھا۔ امجد صحن میں حیران کھڑا تھا۔ کہ اب وہ کدھر جائے کہ کمرے سے گلزار کی ڈانٹ سنائی دی۔

''ابے گھامڑ اندر کیوں نہیں آجاتا۔ کیا کھانا ٹھنڈا کروائے گا۔'' جھجکتے ہوئے امجد نے کمرے میں قدم رکھا۔ گلزار اپنی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ امجد نے بے یقینی سے ادھر ادھر دیکھا کمرہ بالکل خالی تھا۔ اس میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ اور کمرے میں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں وہ چھپ سکتی۔ اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر گلزار حیران ہوگیا کھانا وہیں چھوڑ کر وہ اٹھ کر امجد کے قریب آگیا۔

''کیا بات ہے۔ تیرا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے۔''

امجد نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔ ''لڑکی......لڑکی......''

جواباً گلزار نے جھاڑ پلادی۔

''ابے کیا لڑکی، لڑکی لگا رکھی ہے۔ جب میں دعا مانگتا تھا کہ ہمارا ویاہ ہوجائے تب تجھے برا لگتا تھا اب لڑکی لڑکی کئے جارہا ہے۔ آرام سے روٹی کھا۔ اس وقت خالی پیٹ کو لڑکی کی نہیں روٹی کی ضرورت ہے۔''

امجد سمجھ گیا کہ گلزار اس کی بات سمجھ نہیں سکا ہے۔ اس نے سنبھل کر پوچھا۔

''تم ابھی دروازے پر کس کا ذکر کررہے تھے؟'' گلزار نے زوردار قہقہہ لگایا پھر ایک دھپ اس کے کندھے پر مار کر بولا۔ ''ابے بے وقوف! تو نے کہا کہ اندر کون لڑکی ہے؟ میں سمجھ گیا کہ تو مذاق کررہا ہے اس لئے کہہ دیا کہ تیری بھابھی ہے۔ اور کس کی بات کرنی تھی۔''

امجد نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

''نہیں گلزار میں مذاق نہیں کررہا تھا۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو ایک لڑکی چولہے کے پاس بیٹھی تھی، اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور اٹھ کر اندر کمرے میں آگئی۔ میں اسی لئے باہر کھڑا تھا وہ کمرے سے نہیں نکلی تھی اور اب کمرے میں بھی نہیں ہے۔''

لیکن بجائے اس کے گلزار سنجیدہ ہوتا۔ اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے امجد کا بہت مذاق اڑایا۔ اور پھر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ امجد نے بھی ٹھنڈا کھانا زہر مار کیا۔ اور گلزار کو یقین دلانے کی کوشش ترک کرکے خاموشی سے اپنے بستر میں لیٹ گیا۔ لیکن وہ اس بات کو جھٹلا نہیں سکتا تھا کہ اس نے صحن میں لڑکی پورے ہوش وحواس میں دیکھی تھی۔ اسے اپنی مرحومہ ماں کا کہنا یاد آیا۔

''بیٹا خالی گھروں اور ویران جگہوں پر جنات کا بسیرا ہوتا ہے۔'' ان کا گھر بھی سارا دن خالی رہتا تھا۔ اور کیا معلوم اس میں یہ جنات ان کے آنے سے پہلے ہی رہتے ہوں۔ یہ سوچ کر اسے جھرجھری سی آگئی کہ اس گھر میں پچھلے پندرہ دنوں سے وہ جنات کے ساتھ رہ رہے تھے۔ عجیب عجیب باتیں سوچتے سوچتے وہ بالآخر سوگیا۔ آدھی رات کے وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔

کروٹ بدل کر اس نے سونے کی کوشش کی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی بستر پر موجود تھا۔ اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ غیر محسوس انداز میں کھسک کر وہ تھوڑا پرے ہٹ گیا۔ اس کے اعصاب سن ہوتے جارہے تھے۔ امجد کے دل میں شدید خواہش جاگی کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے مگر اس کے ہاتھ پاؤں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کا دل رک رک کر دھڑک رہا تھا۔ کسی کے گرم سانسوں کو اپنی گردن پر وہ بخوبی محسوس کررہا تھا امجد کی آنکھوں میں اس حسین لڑکی کا سراپا گھوم گیا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ رات کے اس پہر وہ جن لڑکی اس کے بستر میں کیا کرنے آئی تھی۔

اسی وقت خراٹوں کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دینے لگی۔ امجد کو یہ جاننے میں ذرا دیر نہ لگی کہ اس کے بستر میں جن لڑکی نہیں بلکہ بذات خود جن موجود تھا۔ کیونکہ اس کے برابر سے ابھرنے والے خراٹے زنانہ نہیں مردانہ تھے۔

ایک جن کی اپنے بستر میں موجودگی کا احساس اتنا دہشت انگیز تھا کہ وہ اچھل کر بستر سے نکل گیا اگلے ہی لمحے اس نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر بلب جلا دیا۔ یہ دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کہ جن کی دہکتی ہوئی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ امجد کو ہی دیکھ رہا تھا۔ امجد نے اس کے چہرے سے نظر ہٹائی تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی کیونکہ اس کی نظر جن کی ٹانگوں پر پڑ گئی تھی۔ اس کی ٹانگیں اتنی لمبی تھیں چارپائی سے نیچے ایک ڈھیر کی۔ صورت میں پڑی تھیں۔ اور ڈھیر دھیرے دھیرے حرکت کر رہا تھا۔

امجد کی چیخ سن کر گلزار اٹھ گیا۔

”کک کیا ہوا......؟ تم ٹھیک تو ہو......؟“ وہ تیزی سے بستر سے اتر کر تھر تھر کانپتے امجد کے پاس آیا۔ لیکن امجد کوئی جواب دینے کے بجائے گر کر بے ہوش ہوگیا۔ گلزار پریشان تھا۔ بہر حال اس نے گلاس میں پانی لا کر اسے ہوش دلایا۔ ہوش میں آتے ہی۔ امجد گلزار سے لپٹ گیا۔

”گلزار تیرے سر کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے بستر میں لمبی ٹانگوں والا ایک جن تھا۔“ گلزار نے ایک طویل سانس لی پھر دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

”میں مانتا ہوں کہ جنوں کا وجود ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے تجھے واقعی کسی جن نے پریشان کیا ہو۔ اب آرام سے سو جاؤ صبح کسی مولوی سے مل لیں گے۔“

مگر امجد اکیلا اپنے بستر میں سونے سے صاف انکاری ہوگیا۔ گلزار نے اسے اپنے ساتھ لٹا لیا۔ گلزار تو چند لمحوں میں پھر سو گیا مگر امجد نے تمام رات جاگتے ہوئے گزار دی۔

اگلی صبح وہ دونوں کام پر جانے کے بجائے ایک بڑی مسجد کے امام صاحب کے پاس چلے گئے۔ جوان کے محلے سے قدرے فاصلے پر تھی۔ گلزار نے ان سے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ وہ بولے۔

”کہیں تم......اقبال گجر کے گھر میں تو کرائے پر نہیں رہ رہے؟“ دونوں حیران ہوگئے۔ امجد نے جلدی سے کہا۔

”جی جی......مولوی صاحب ہم اسی مکان میں رہ رہے ہیں ابھی پندرہ سولہ دن پہلے ہی کرائے پر لیا ہے۔ مولوی صاحب نے یوں سر ہلایا جیسے ساری بات سمجھ گئے ہوں۔ پھر بولے۔

”دیکھو! میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس مکان میں جنات ہیں، اسی وجہ سے کوئی بھی کرائے دار اس گھر میں نہیں ٹکتا۔ اور شاید تم دونوں نے دھیان نہ دیا اسی وجہ سے اس گھر کا کرایہ بھی بہت کم ہے۔ بہر حال اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اسے زیب نہیں دیتا کہ وہ جنوں کے ڈر سے گھر چھوڑ کر بھاگ جائے۔ تم حوصلہ رکھو میں تمہیں تعویز دوں گا۔ وہ جن تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ پھر تم روزانہ دم کیا ہوا پانی گھر میں چھڑکا کرنا۔ انشاء اللہ بہت جلدی جن گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔“

امجد کافی ڈرا ہوا تھا مولوی صاحب کی باتوں سے اسے کچھ ڈھارس تو بندھی مگر وہ مکمل طور پر پرسکون ابھی بھی نہیں تھا۔ مولوی صاحب کے دیئے ہوئے تعویز اور ایک بوتل میں پانی لے کر وہ دونوں واپس لوٹ آئے۔ تعویز ڈوریوں میں ڈال کر اسی وقت گلے میں پہن لئے۔ پھر گلزار اٹھ کر گھر میں چھینٹے مارنے لگا۔ امجد ابھی تک خوف کے زیر اثر تھا۔ وہ ادھر ادھر یوں دیکھتا جیسے ابھی کسی طرف سے کوئی اس پر حملہ کردے گا۔

دن تو خیریت سے گزر گیا۔ لیکن جب رات کو سونے کا وقت آیا تو امجد نے پھر اپنے بستر میں سونے سے انکار کردیا۔ اگرچہ تعویز کی وجہ سے اسے کافی ڈھارس تھی مگر وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ گلزار نے اسے اپنے بستر میں سونے کا کہا اور خود اس کی چارپائی پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ ابھی اسے سوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ گپ شپ کی تیز آوازوں سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چھلانگ لگا کر سوئچ بورڈ تک پہنچا اور بلب بجھا دیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کمرے کی سامنے والی دیوار پر چھت سے نیچے کی طرف خون بہہ رہا تھا۔ جیسے کسی نے بالٹی بھر کر وہاں انڈیل دیا ہو۔ دیوار سے نظر ہٹا کر اس نے امجد کی طرف دیکھا وہ سکون سے سویا ہوا تھا گلزار نے بے چینی سی محسوس کی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اس گھر سے نکل کر بھاگ جائے۔ لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا۔ اور آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد خون بہنا بند ہوگیا۔ گلزار پھر سے اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ لیکن اس نے بلب بند نہیں کیا تھا اندھیرے کے خیال سے ہی اسے وحشت ہو رہی تھی۔

اگلے دو تین دن خیریت سے گزر گئے۔ چوتھے دن وہ جب گھر لوٹے تو ایک عجیب منظر ان کا منتظر تھا۔ سارے گھر میں غلاظت بکھری ہوئی تھی جبکہ برتنوں اور چولہے میں بھی غلاظت بھری ہوئی تھی۔ گھر کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ بہر حال اب کیا ہوسکتا تھا۔

گلزار جا کر ایک بھنگی کو بلا لایا۔ اس نے ایک موٹی رقم لے کر سارا گھر صاف کیا۔ وہ برتن پھینک کر انہوں نے نئے برتن خرید لئے اور جب وہ اس سب سے فارغ ہوئے تو رات گہری ہو رہی تھی۔ ابھی تو مقام شکر تھا کہ کمرے میں موجود چیزیں یا بستر گندا نہیں ہوا تھا۔ بس فرش پر غلاظت بکھری تھی جو انہوں نے صاف کروالی۔

امجد اس روز سے گلزار کے بستر پر سو رہا تھا۔ اس کی چارپائی پر بیٹھ کر اس نے سنجیدگی سے گلزار سے کہا۔

”اس سے پہلے کہ ہمیں کوئی ناقابل تلافی نقصان ہوجائے ہمیں یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ جن بہت ظالم اور طاقت ور معلوم ہوتے ہیں کہ بجائے ان پر کوئی اثر ہونے کے وہ ہمیں مزید تنگ کرنے لگے ہیں۔“

گلزار خاموشی سے سنتا رہا۔ بات تو اس کی درست تھی مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس گھر کو چھوڑ کر وہ جائیں گے کہاں۔ اس علاقے میں کنوارے لڑکوں کو گھر بڑی مشکل سے ملا کرتا تھا۔ پہلے بھی بڑی خواری کے بعد وہ یہ گھر تلاش کر پائے تھے گلزار نے کہا۔

”ہم ایک کوشش اور کریں گے۔ ہم کسی اور عامل کا پتہ کریں گے۔ اگر پھر بھی بات نہ بن سکی تو پھر یہ گھر خالی کردیں گے۔“

امجد خاموش ہو کر لیٹ گیا۔ ابھی وہ پوری طرح نیند میں ڈوبا نہیں تھا۔ جب اس کو کمرے میں کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ امجد نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا مگر کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ حالانکہ اب وہ بلب جلتا چھوڑ کر سوتے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ گلزار کو آواز دیتا کسی نے اس کی چارپائی الٹ دی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اب وہ نیچے فرش پر پڑا تھا۔ اور چارپائی اس کے اوپر لدی ہوئی تھی۔ تب ہی اسے گلزار کی آواز سنائی دی۔

”امجد! یار ذرا یہ چارپائی تو ہٹاؤ مجھے اس نامراد جن نے زمین پر پھینک دیا۔ امجد نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”میں خود چارپائی کے نیچے دبا ہوا ہوں۔“

دونوں جوان لڑکے تھے ایک چارپائی کا وزن ہوتا ہی کتنا ہے۔ مگر ان سے اپنے اوپر لدی ہوئی چارپائی پرے نہیں ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے چارپائی کے اوپر منوں وزن رکھ دیا گیا ہو۔ مجبوراً دونوں ساری رات ننگے فرش پر بوجھ تلے پڑے رہے صبح جب فجر کی اذان ہوئی تو چارپائی کا بوجھ خود بخود ختم ہوگیا۔ دونوں نے دھکیل کر چارپائی دور کی اور باہر نکل آئے۔

آج پھر کام سے چھٹی کر کے وہ کسی عامل کی تلاش میں نکلے مگر جانے سے پہلے قرآنی آیات پڑھ کر گھر کا حصار باندھنا نہیں بھولے تھے۔ سارا دن وہ کسی کامل عامل کی تلاش میں شہر میں گشت کرتے رہے۔ کئی عامل یوں تو بڑے بڑے دعوے کر رہے تھے مگر ان کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ پھرتے پھراتے شام کو انہیں ایک ایسا عامل مل ہی گیا جو اپنے دعوے کی گارنٹی دے رہا تھا۔

”اگر آپ کا کام سو فیصد پورا نہ کروں تو جتنے پیسے آپ بطور فیس مجھے دیں گے میں دگنے آپ کو لوٹا دوں گا۔“

وہ راضی ہوگئے اور ایک ہزار روپے نکال کر اسے تھما دیئے۔

”بابا جی! کام جلد ہوجانا چاہیے۔ ہم آئندہ چارپائی کے نیچے دبنا نہیں چاہتے۔“

لمبی سی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں والے

بٹے کٹے شخص نے انہیں یقین دلایا کہ سات دن کے اندر اندر سب جنات کو یا تو قید کرلوں گا یا پھر جلا کر راکھ کر دوں گا۔"

دونوں مطمئن ہوکر گھر کو چل دیئے۔ راستے میں رک کر انہوں نے ایک ڈھابے سے کھانا کھایا اور سرِ شام ہی گھر پہنچ گئے وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آج ان کے جانے کے بعد جنات نے گھر کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا، دھک دھک کرتے دل کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوئے۔ یہ دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں کہ گھر صاف ستھرا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح خوش بھی نہ ہوئے تھے کہ گھر میں مٹی کے ڈھیلے برسنے لگے۔ وہ دونوں حواس باختہ ہوکر واپس گلی میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ گھر سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ ڈھیلے برسنا بند ہوگئے تھے۔ انہیں اس طرح بھاگتا دیکھ کر گلی کے مردوں نے وجہ پوچھنا شروع کردی۔ انہوں نے ساری کہانی سنا دی۔ عورتیں بھی دروازوں میں سے جھانک کر دیکھ رہی تھیں۔ ایک شخص نے انہیں مشورہ دیا کہ جان سے قیمتی چیز کوئی نہیں ہوتی۔ وہ یہ گھر چھوڑ دیں تو گلزار بولا۔

"جناب! چھوڑ تو دیں مگر پھر اور کہاں رہیں گے اگرچہ ہم شریف نوجوان ہیں مگر کوئی بھی کنوارے لڑکوں کو اپنا گھر کرائے پر نہیں دیتا۔"

ان آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔

"ہاں بھئی یہ بات تو ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ ہم میاں بیوی اکیلے ہی رہتے ہیں۔ ایک کمرہ خالی ہے وہ تم لے لینا۔ میری اپنی کوئی اولاد نہیں مگر اولاد کا درد تو جانتا ہوں نا۔ تمہارے ماں باپ کتنا پریشان ہوں گے تمہارے لئے۔"

امجد اور گلزار اتنے شکر گزار ہوئے کہ بے اختیار اس آدمی کے ہاتھ چوم لئے۔ مالک مکان بھی موجود تھا خاموشی سے یہ سب دیکھتا رہا۔ دونوں بھاگم بھاگ گھر میں داخل ہوئے۔

"او جنو! سن لو۔ ہم تمہارا مکان خالی کر کے جارہے ہیں۔ اب ہمیں پتھر مت مارنا۔ بس سامان لینے آئے ہیں۔"

گلزار نے صحن میں جاتے ہی بلند آواز سے کہا محلے کے آدمی بھی ساتھ تھے۔ سب ہنسنے لگے۔ مگر اسی وقت کمرے میں زبردست دھماکہ ہوا سب بھاگ کر اندر گئے۔ چھت کی لکڑیوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے اندھا دھند سامان صحن میں پھینکنا شروع کردیا تھوڑا سا سامان تھا دو منٹ میں کمرہ اور پھر گھر بھی خالی ہوگیا۔

ادھر ادھر کے گھر والوں نے آگ پر پانی پھینکنا شروع کردیا۔ لیکن جتنا پانی پھینکتے آگ اتنا ہی بھڑکتی جیسے پانی کے بجائے تیل پھینکا گیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا گھر جل کر خاک ہوگیا۔ فضا میں اتنی دہشت پھیلی ہوئی تھی کہ لوگ اس گھر کے قریب جانے سے ڈر رہے تھے۔ گلزار اور امجد نے شکر ادا کیا کہ وہ کسی بڑے نقصان سے بچ گئے تھے۔

اگلے دن وہ پھر سے اس عامل کے پاس پہنچ گئے۔ تاکہ اس سے اپنے روپے واپس لے سکیں۔ لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس عامل کا گھر بھی بالکل اسی طرح جلا ہوا تھا جیسے کہ خود ان کا جل گیا تھا۔

انہوں نے اردگرد کے لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اچانک ہی آگ بھڑک اٹھی بے چارے عامل کو نکل بھاگنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اور جل کر مرگیا۔ دونوں افسردہ ہوکر واپس آگئے۔ راستے میں ایک سنسان گلی میں ایک لمبا سا کھردرے چہرے والا آدمی کھڑا تھا۔ اس نے ان کا راستہ روک لیا۔

"اگر آج کے بعد تم نے ہمارے ساتھ پنگا لینے کی کوشش کی تو وہی حال کروں گا جو اس عامل کا کیا تھا۔"

اس کے ساتھ ہی وہ غائب ہوگیا۔ دونوں تھر تھر کانپتے گھر کی جانب بھاگے۔ انہوں نے عہد کرلیا تھا کہ آئندہ وہ اس مکان کے قریب سے بھی نہیں گزریں گے۔ وہ جلا ہوا مکان اب بھی اسی طرح اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کے مالک کو بھی دوبارہ اسے تعمیر کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

انتباہ

احسان سحر۔میانوالی

رات کا گھپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا کہ خیمے میں اچانک دودھیا روشنی پھیل گئی اور نوجوان کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ایک نازنین کھڑی ہے، اس نے نوجوان کا ہاتھ پکڑا اور ایک انجان دنیا میں لے کر پہنچ گئی۔

اللہ کا بھید اللہ ہی جانتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ دنیا سے جانے والے روح کی صورت میں موجود ہیں

مجھے آثار قدیمہ اور عجائبات دیکھنے کا بہت شوق تھا، اور میں ہر وقت اسی کوشش میں رہتا تھا کہ کسی انٹرنیشنل کمپنی میں جگہ مل جائے اور پھر قدرت مجھ پر مہربان ہوگئی ایک آثار قدیمہ تلاش کرنے والی برٹش بین الاقوامی کمپنی میں ملازمت مل ہی گئی۔

کمپنی والے مجھے عراق لے گئے، جہاں میں نے خانقاہوں کا دیدار کیا اور اس طرح بہت قدیم یادگاروں کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اور میرے دل میں یہ حسرت تھی کہ میں مصر جاؤں اور فرعون کے اہرام کو بھی دیکھ سکوں، قسمت نے یاوری کی اور ہماری کمپنی کو مصر کے شمال مغرب میں ہزاروں سال پہلے کا ایک دفن شدہ قدیم شہر اور اس کے آثار ڈھونڈنے کا ٹھیکہ مل گیا، وہ جگہ آبادی سے سینکڑوں میل دور پہاڑوں میں واقع تھی اور تاریخ سے پتہ چلتا تھا کہ اس جگہ بہت بڑا تاریخی

شہر آباد تھا۔ اور اب وہاں اونچے نیچے پہاڑ اور غاریں تھیں، ہماری کمپنی کے اسٹاف کو جہاں بھی جانا ہوتا ہیلی کاپٹر خوراک بمعہ ساز وسامان وہاں اتار آتا۔

مصر کی سرزمین پر جہاں ہمیں اتارا گیا تھا وہاں چاروں طرف پہاڑیاں اور غاریں تھیں، دور دور تک آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ یہاں ہزاروں سال پہلے ایک خوبصورت شہر آباد تھا۔ اب زمانے کے اتار چڑھاؤ زلزلے اور قدرتی تھپیڑوں سے غرق ہو کر اس جگہ دفن ہو چکا تھا۔ اور آثار قدیمہ والوں کو حکم ہوا تھا کہ اس تہذیب کا کھوج لگائیں تاکہ گزشتہ صدیوں کی تاریخ سے پردہ اٹھایا جاسکے۔ کھانے پینے اور رہن سہن کا ہر سامان ہمیں بذریعہ ہیلی کاپٹر مہیا ہوتا رہا۔ اور ہم خیمے لگا کر اس مٹی کا جائزہ لے رہے تھے۔ پہاڑوں کے پتھروں کا نمونہ ہیڈ آفس کو روانہ کر کے اور پھر مزید ہدایات پاکر کھدائی شروع کردی۔

"میری عمر اس وقت پچیس سال تھی، میں ایک بھرپور خوبصورت اور طاقت ور نوجوان تھا۔ ہماری کمپنی نے قاہرہ سے گائیڈ منگوالئے تھے جو راستوں کی رہنمائی کرتے تھے سب سے بڑا آفیسر ایک برٹش تھا۔ جو نہایت قابل اور اپنے کام میں ماہر استاد مانا جاتا تھا۔ وہاں پہنچ کر خیموں کا شہر آباد ہو گیا۔ ہم سب علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے خیموں میں رہتے تھے۔ صبح نو بجے تمام ملازم ایک جگہ اکھٹے ہوتے اور حکم کے مطابق اپنا اپنا کام کرتے، ہمیں جو سائیڈ دی گئی وہاں اونچی نیچی پہاڑیاں اور سرنگیں دکھائی دیتی تھی۔ ہم نے اس جگہ کو کھودنا تھا۔ اور اس گہرائی تک پہنچنا تھا جہاں وہ بدقسمت شہر دفن تھا۔ مشینیں دن رات کام کررہی تھیں۔ لیکن دو ہفتے گزر جانے کے بعد ایک گہرائی بھی نہ کھودی جاسکی، کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ زمین لوہے کی ہے یا پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ کافی دن ہم مزید محنت کرنے کے بعد ہمت ہار گئے۔ اور ہیڈ آفس کو اطلاع کردی گئی، وہاں سے حکم آیا کہ مشینوں کو بند کردو، اور افرادی قوت استعمال کر کے اس جگہ کو کھودا جائے۔

کئی دن اس شش وپنج میں رہے کہ جو زمین مشینیں نہیں کھود سکیں انسان کس طرح کھودے گا، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہمارا آفیسر ایک جہاندیدہ اور ماہر ارضیات تھا۔ اس نے حکم دیا کہ کام روک دیا جائے جب تک کہ میں اس پہاڑ اور زمین کا جائزہ نہ لے لوں، کئی دنوں تک ہم بیکار پڑے کمپنی کے خرچے پر پلتے رہے۔ ہمارا آفیسر صبح سے شام تک پہاڑوں میں گھومتا رہا تاکہ معلوم کر سکے کہ پہاڑ کس مٹی یا دھات کے بنے ہوئے ہیں۔

ٹھیک 20 دن بعد ہمیں حکم ہوا کہ ان پہاڑوں کے نیچے والے حصے میں ایک قدرتی سرنگ کھودنا شروع کردیں۔ ہم کئی دنوں تک لگے رہے اور ایک دن جب میرے پھاوڑے کی چوٹ سے ایک سیاہ اینٹ نیچے لڑھک گئی۔ جسے دیکھتے ہی تمام آدمیوں نے خوشی کا نعرہ مارا۔ اب ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ ہمارے آفیسر نے جو جائزہ لگایا ہے وہ درست ہے۔ اور یہ پہاڑیاں اسی طرح توڑی جاسکتی ہیں۔ ہم کئی دنوں تک زور لگاتے رہے اور آہستہ آہستہ سیاہ پتھر نکلتے رہے۔ یہ ہمارے لئے خوشی کی نوید تھی کہ ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ یہاں واقعی کوئی شہر آباد تھا۔ جس کے مکانات سیاہ اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ صورتحال کی اطلاع ہیڈ آفس کو دے دی گئی، وہاں سے ہدایات آئیں کہ ہم لوگ کھودتے جائیں۔

دو ماہ کی سخت محنت اور جدوجہد کے باوجود ہم مشکل سے 10 فٹ گہرائی کو کھود سکے۔ قدرت مجھ پر مہربان تھی ایک دن میں کھدائی کر رہا تھا کہ ایک جگہ سے ایک سرخ رنگ کی اینٹ برآمد ہوئی، اس اینٹ کے گرتے ہی روشنی کا ایک ہالہ نمودار ہوا اور پھر فوراً ہی ختم ہو گیا۔ نہ جانے پہاڑوں کے نیچے سے یہ روشنی کہاں سے نمودار ہوئی تھی۔ جب اس واقعہ کا علم کمپنی کو ہوا تو انہیں مکمل یقین ہو گیا کہ ان پہاڑوں کے نیچے کوئی پراسرار شہر آباد تھا۔ لہٰذا ہمیں اسی جگہ کو کھودنے کا حکم ملا۔ کھودتے کھودتے ہمیں سرخ اینٹیں نظر آنے لگیں۔ وہ

لوہے سے بھی زیادہ مضبوط تھیں۔ ہم ان کے اطراف سے مٹی اور پتھر ہٹاتے رہے۔ حتیٰ کہ ایک گول سا مینار نظر آ گیا۔ شاید وہ کسی عمارت کا مینار تھا۔ ہماری انتہائی کوشش کے باوجود اندر کا راستہ نہ مل سکا۔

یہ صورتحال دیکھ کر ہمارے آفیسر نے حکم دیا کہ تمام لوگ کوشش کر کے ایک ایک اینٹ نکالتے جائیں۔ اور اس کے بعد حالات کا جائزہ لے کر بتا دیا جائے گا۔ ہم لگے رہے اور دن رات ایک کر دیئے۔ ایک سرخ اینٹ کو نکالا۔ اسی طرح دوسری اور تیسری کو نکالا اور اس کے باوجود ریوالور کی موٹائی کا علم نہ ہو سکا۔ یہ دیوار کتنی موٹی ہے آگے پتھر ہیں کہ لوہا، ان باتوں کے باوجود بھی ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ ہمیں کامیابی ضرور ملے گی۔

دوسرے دن اتوار تھا چنانچہ ہمیں آرام کے لئے چھٹی دے دی گئی۔ میں جس شوق کی تکمیل کے لئے محکمہ آثار قدیمہ میں بھرتی ہوا تھا وہ سب دیکھنے کے لئے بے قرار تھا۔ عراق کے مقدس مقامات دیکھ چکا تھا۔ اور اب خواہش تھی کہ فرعون کا ملک دیکھوں وہ سرزمین جہاں ممیاں دفن ہیں۔ میں سنا کرتا تھا کہ ہزاروں سالوں سے فرعون کے خاندان کو حنوط کر کے دفن کیا گیا ہے وہ ممیاں اسی ملک میں دفن ہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جہاں ہم کھود رہے ہیں اس پہاڑ کے نیچے خوبصورت ممیاں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ میں ان کو دیکھوں گا اور پھر اس تمام داستان کو واپس جا کر اپنے لوگوں میں بیان کروں گا اور ان کو بتاؤں گا کہ یہ فقط فرضی باتیں نہیں، بلکہ حقیقت ہے اور مصر کے عجائبات میں پرانے شہنشاہوں، ان کی بیگمات، بیٹیوں، اور کنیزوں کی ممیاں موجود ہیں۔ جن کو انہوں نے اس لئے حنوط کر دیا کہ وہ ایک دن ضرور زندہ ہو جائیں گی۔

اتوار کے دن میں نے خوب آرام کیا اور رات کو انہی خیالات میں سو گیا...... دماغ میں یہ یقین جگہ بنا گیا کہ کل کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نظر آ جائے گا۔ جو ہمیں غرق شدہ شہر کے کسی مکان یا بازار میں لے جائے گا......

ابھی رات آدھی سے تھوڑی گزری تھی کہ مجھے

کسی نے جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ میں گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ آخر کسی کے بار بار مجبور کرنے پر میں اٹھ گیا۔ چونکہ میرے خیمے میں میرے علاوہ کوئی نہ تھا، میں پریشان ہوگیا، یہ سب کچھ کیا ہے جب میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا تو میرے قریب ایک لڑکی بیٹھی ہوئی دکھائی دی، جس کے گلے میں سیکڑوں طرح کے چمکتے ہوئے موتیوں کا ہار نظر آرہا تھا وہ ٹکٹکی باندھے بڑے انہماک سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھی اور ان پہاڑوں میں کہاں سے آگئی تھی۔ یہ تو محض ایک خواب ہی ہوسکتا تھا، چند لمحوں بعد وہ یکدم غائب ہوگئی۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھا اور دوبارہ سوگیا۔

دن چڑھا تو اپنا ساز وسامان لے کر پہاڑ کی کھدائی کے لئے گینگ میں شامل ہوگیا۔ آج ہم نے بہت کھودا، لیکن سرخ اینٹوں کی گول محراب نما دیوار کے علاوہ کچھ بھی معلوم نہ ہوسکا۔ کافی گہرا کھودنے کے بعد ہمیں چند لکیر نما دھبے ملے جن سے یہ اشارہ ملتا تھا کہ یہ کوئی راستہ تھا ہماری محنت رنگ لائی اور ہمیں اس گول دائرہ نما سرخ اینٹوں کے ایک کنواں کا راستہ مل گیا تھا۔ کام کے بعد شام کو اپنے خیمے میں واپس آیا تو یہی خیال مجھے بار بار ستا رہا تھا اور مجھے نیند نہیں آرہی تھی فقط آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ رہ رہ کر مجھے رات والا منظر یاد آرہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے کسی حنوط شدہ ممی میں جان پڑگئی ہو۔ اور وہ رات کو اٹھ کر ان پہاڑوں کا طواف کرتی رہتی ہو۔ کام کے دوران بھی مجھے یہی خیال ستائے جارہا تھا۔ کہ رات والی لڑکی کا بسیرا انہی پہاڑوں کے نیچے ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ کسی فرعون کے خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ یہ خیال میرے ذہن میں پختہ ہوگیا تھا۔

رات کوئی بارہ بجے کا عمل ہوگا کہ میرے خیمے میں مدھم مدھم روشنی دکھائی دینے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ زلزلے کے ہلکے ہلکے جھٹکے بھی محسوس ہونے لگے۔ اس کے باوجود بھی میں نہ اٹھ سکا اور سوچنے لگا کہ یہ عمارت تو نہیں جس کے گرنے سے کوئی نقصان ہوگا۔ [illegible]

یہ سوچ رہا تھا کہ کسی نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

جب میں نے آنکھ کھولی اور دیکھا تو میرے حواس گم ہوگئے۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جس کی ٹانگوں اور بازوؤں پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی تھیں میرے قریب کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں فرعون کی ایک چہیتی ملکہ اطانیہ کا غلام ہوں اور میری مالکن نے پیغام دے کر بھیجا ہے کہ میرے غلام کے ساتھ آجاؤ۔ میں تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتی۔ چونکہ اس مقبرہ کی پہلی اینٹ تم نے اکھیڑی تھی اس لئے ہم نے چاہا کہ تم ہمارے پاس آجاؤ۔ ہزاروں سال کے بعد ہمیں امید کی کرن نظر آئی ہے کہ ہم دوبارہ انسانی جسم پانے کے مسالا جات اور خوشبو لگا کر دفنایا گیا تھا۔ ایک وقت آئے گا۔ ہم موت کے بندھنوں پر فتح پاکر دوبارہ زندہ ہوجائیں گے مجھے ملکہ اطانیہ نے یہی کچھ کہہ کر بھیجا ہے تاکہ تم آکر دیکھ سکو، کہ ہزاروں سال پہلے والی ملکہ آج بھی ایسی ہے جیسی موت کے وقت تھی۔"

ہڈیوں کا خوفناک چہرہ میں نے آج تک نہ دیکھا تھا، وہ میرے اور بھی قریب آکر جواب کا منتظر تھا۔ میں نے ڈر کر آنکھیں بند کرلی تھیں لیکن وہ بند آنکھوں میں بھی مجھے نظر آرہا تھا، ڈر کر میں نے منہ پھیر لیا لیکن پھر بھی وہ مجھے نظر آرہا تھا۔ نہ جانیں وہ کب تک کھڑا رہا۔ دن کی روشنی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ وہ میرا جواب لئے بغیر ہی یکدم غائب ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے بخار ہوگیا۔ اور میں نے آرام کے لئے چھٹی لے لی تمام لوگ کھدائی کے لئے جاچکے تھے۔ فقط میں اکیلا ہی اپنے خیمے میں پڑا ہوا تھا، جب دوپہر کی گرمی تیز ہورہی تھی تو اچانک وہی غلام حاضر ہوا ......اس نے کہا۔

"ملکہ اطانیہ نے مجھے فوراً بھیجا ہے کہ ان کی رضامندی سے آپ کو آگاہ کردوں......" میں پھر بھی خاموش رہا۔ چند لمحوں بعد وہ غلام ڈھانچہ بغیر جواب کے [illegible] ہوگیا۔ [illegible] کے جانے کے چند لمحے بعد خیمے میں [illegible]

زمین ہلنا شروع ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین پھٹی۔ ایک دھواں سا اوپر اٹھا۔ آہستہ آہستہ دھواں ہوا میں تحلیل ہوتا گیا۔ اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھواں ایک لڑکی کا وجود اختیار کرگیا۔ وہ آداب بجالائی اور کہنے لگی۔

"میں ملکہ اطانیہ ہوں، میں نے اپنے غلام کو حکم دے کر بھیجا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی سختی نہ کی جائے اور جو کچھ کہہ کر بھیجا تھا اس کا جواب مجھے نہیں ملا۔ اس لئے میں خود آگئی ہوں، ڈرو مت، میرے ساتھ چلو، میں تمہیں اپنے محلات کی سیر کراؤں گی......"

اتنا کہہ کر اس نے فوراً میرا ہاتھ تھام لیا......اور ہم دونوں پلک جھپکتے ہی ایک خوبصورت شہر میں داخل ہوگئے......جدھر سے گزرتے دربان جھک جھک کر سلام کرتے، گھومتے ہوئے ہم ایک گنبد نما عمارت کے قریب پہنچ گئے، وہاں اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور غائب ہوگئی......چاروں طرف بھول بھلیاں تھیں روشنی ہونے کے باوجود راستہ نہیں مل رہا تھا۔

میں پریشان ہوگیا کہ کہاں کھوگیا ہوں۔ راستے کی تلاش میں جب میں آگے بڑھا تو حنوط شدہ لاشیں ہی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے جسم سفید پٹیوں سے کس کر بندھے ہوئے تھے۔ فقط ہاتھ اور منہ ننگے تھے، چاروں طرف سے خوشبوئیں آرہی تھیں۔ میں اپنے خیمے میں جانے کے لئے راستہ تلاش کررہا تھا، جب ناکام ہوگیا۔ اور گھبرا کر گرنے کو تھا کہ فوراً ہی وہی ہڈیوں کا ڈھانچہ نمودار ہوا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سنبھالا دیا۔ اور اپنے پیچھے آنے کو کہا......چلتے چلتے وہی سرخ اینٹوں والی گنبد گول عمارت نظر آئی، بالکل وہی اینٹیں جو ہم اکھیڑ رہے تھے۔ مگر یہاں بھی اس کے اندر جانے کا راستہ نہ ملا۔ اس عمارت کے گرد چکر لگانے کے بعد اس غلام ڈھانچے نے ایک اینٹ کو ہلکا سا دبایا......انسانی قد کے برابر ایک دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا......اس کے کھلتے ہی وہی روشنی کا ہالہ جو ہم نے پہلے بھی دیکھا تھا نظر آیا اور اس روشنی کی رہنمائی میں ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔

اس عمارت کے اندر مدھم ملگجی سی روشنی [illegible]

پھیلی ہوئی تھی، کوئی چراغ نہ جل رہا تھا پھر بھی عمارت بقعہ نور بنی ہوئی تھی چلتے چلتے وہ ڈھانچہ ایک حنوط شدہ لاش کے قریب رک گیا اور جھک گیا اور ہاتھ باندھ لئے۔ تابوت میں وہ کسی ملکہ کی ممی تھی۔ اس کا تمام جسم سوائے منہ کے پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا، اس کی چھاتی پر کئی قسم کے جواہرات ہیرے اور سونے کے زیورات پڑے ہوئے تھے۔ اور اس ممی کے چاروں طرف دولت اور جوہرات کا انبار لگا ہوا تھا، طرح طرح کے ہیروں سے نکلنے والی روشنی کی کرنیں اس عمارت کو روشنی سے منور کررہی تھیں، جب میں نے اس کو غور سے دیکھا تو مجھے وہی چہرہ نظر آیا جو میرا ہاتھ پکڑ کر اس جگہ لایا تھا، وہ ملکہ اطانیہ تھی، جس کی آنکھوں کی پتلیاں حرکت کرتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آنکھیں میری طرف دیکھ رہی ہیں۔

اچانک ہی اس عمارت کی دیواریں ہلنا شروع ہوگئیں۔ جسے دیکھتے ہی غلام ڈھانچے نے اپنا سر جھکا لیا اور پھر چند لمحوں بعد سکوت چھا گیا۔ تابوت کی طرف دیکھ کر ڈھانچے نے کہا۔

"یہ میری مالکن ملکہ اطانیہ ہیں اور میں ان کا غلام ہوں۔" اس کے بعد وہ غلام مجھے واپس لے آیا اور نہ جانے مجھے کس طرح میرے خیمے میں پہنچا دیا۔ میں خیمے میں واپس پہنچا تو فوراً ہی گہری نیند نے مجھے آدبوچا...... پتہ نہیں کب تک سوتا رہا چونکہ کمپنی نے مجھے بخار کی وجہ سے چھٹی دی ہوئی تھی۔ میں پرسکون تھا۔ جب آنکھ کھلی تو باہر اندھیرا ہی تھا لیکن میرے خیمے میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی جیسی کہ میں اس گنبد نما عمارت میں دیکھ چکا تھا، مجھے شدت سے بھوک کا احساس ہوا۔ اٹھ کر کچھ کھانے کے لئے تلاش کرنے لگا، کیا دیکھتا ہوں کہ کئی قسم کے کھانے میرے سرہانے پڑے ہوئے ہیں میں سوچنے لگا چونکہ میں بیمار تھا، اور کمپنی کے لوگوں نے مجھے جگانا مناسب نہ سمجھا اور پھل وغیرہ بمعہ کھانا رکھ کر چلے گئے ہیں۔

ان سب چیزوں کو دیکھ کر میری بھوک اور بھی تیز ہوگئی۔ میں کھانے پر جھپٹ پڑا اور خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پانی [illegible] تھا۔

لیکن آج ایک جگہ سرخ رنگ کے شربت کی صورت میں پاس پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے چکھا تو اس کا ذائقہ بہت ہی مزیدار لگا۔ چنانچہ میں وہ پورا جگ اٹھا کر پی گیا۔ کھانے کے بعد مجھ پر غنودگی چھانے لگی اور پھر دوبارہ میں نیند کی دنیا میں کھو گیا۔

دوسرے دن کمپنی کے ڈاکٹرز نے کہا کہ اسے کوئی تکلیف نہیں ہے اب اس کام پر جانا چاہیے چنانچہ دوسرے روز کھدائی کے لئے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چلا گیا۔ میری غیر موجودگی میں وہ تقریباً 20 فٹ نیچے گہرائی میں چلے گئے تھے۔ لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود ان کو عمارت کے اندر جانے کا راستہ نہ ملا۔ اور وہ دفن شدہ شہر کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ شام کو تمام لوگ فارغ ہو کر آئے اور چونکہ دن بھر کی مشقت کی وجہ سے تھکے ہوئے تھے، اپنے خیموں میں چلے گئے۔

آج ہم سب کو کمپنی کی طرف سے کھانا سائیٹ پر بھجوا دیا گیا کہ وقت ضائع نہ ہو۔ جب میں اپنے خیمے میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی کل جیسا کھانا اور شربت کا جگ پڑا ہوا تھا۔ حالانکہ میں سائیٹ پر کھانا کھا کر آیا تھا۔ پھر بھی وہ سب کچھ دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی اور میں سب کچھ کھا پی کر سو گیا، سونے سے پہلے میرے خیمے میں مدھم روشنی پھیلنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے روشنی تیز ہو گئی، اس کے باوجود خیمے کے باہر بالکل اندھیرا تھا۔ اور اس روشنی کا رخ صرف میرے خیمے میں تھا، میں حیران ہو کر وہ سب دیکھ رہا تھا، کہ فوراً ہی اطانیہ حاضر ہو کر مسکرانے لگی۔ اس نے میرا نام لے کر پکارا اور کہا۔

”ہمارے حرم کی پہلی اینٹ تم نے گرائی تھی اور اس طرح ہوتے ہوتے کھدائی والے کافی گہرائی تک پہنچ چکے ہیں۔ ان کو بتا دو کہ ہزاروں سال سے سونے والوں کو تنگ نہ کرو۔ ان کو سونے دو، اور وہ وقت بھی آئے گا جب تمام ممیاں زندہ ہو کر آسانی سے انسانی جامے پہن لیں گی...... سنو! ہمیں تنگ کرنے والے جلد ہی نابود ہو جائیں گے، لیکن تم محفوظ رہو گے ہم تمہیں اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتے ہیں۔ سوچ کر جواب دینا کہ کیا تم ہمارے پہلو میں رہنا پسند کرو گے؟“

اس سے اگلے دن ہمیں حکم ملا کہ ڈائنا میٹ لگا کر اس محراب نما عمارت کو توڑا جائے۔ تاکہ دفن شدہ شہر کے آثار اور ممیاں نظر آ جائیں، حکم کے مطابق سینکڑوں ٹن بارود 20 فٹ کی گہرائی میں اتار دیا گیا اور اس گول محراب نما عمارت کے ساتھ لگا دیا گیا۔ جب بارود کو آگ لگنے کا وقت آیا تو مجھے حکم ہوا کہ میں ہیڈ آفس اطلاع کر آؤں کہ ہم کامیابی کی منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں...... میرے جانے کے بعد بارود کو آگ لگا دی گئی۔ زبردست دھماکے سے پہاڑ کا ایک بڑا حصہ اس خالی جگہ میں جا گرا، جہاں کئی دنوں کی محنت کے بعد مزدور 20 فٹ کی گہرائی تک جانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ پہاڑ کے نیچے گرنے سے تمام مزدور بمعہ افسران نیچے دب گئے اور ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئے۔ 20 فٹ کی گہرائی والا پہاڑ مٹی اور پتھروں سے دوبارہ بھر گیا۔ لیکن اس عمارت کو کوئی نقصان نہ پہنچا......

میرے تمام ساتھی او وہ سب لوگ جو دھماکہ دیکھنے آئے تھے خوش تھے۔ کہ عمارت کی دیوار پھٹ جائے گی...... اور ہم اندر جا کر دفن شدہ شہر کو ڈھونڈنے والے پہلے ہوں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور وہ تمام کے تمام راہئ عدم ہو چکے تھے۔ مجھے ملکہ اطانیہ کی بات یاد آ گئی کہ ہمیں تنگ کرنے والے سب ختم ہو جائیں گے اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ صرف میں اکیلا ہی جو ہیڈ آفس والوں کو اطلاع دینے گیا تھا بچا رہا۔ اطانیہ نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ پہاڑ کے ٹکڑوں نے قیامت کا سماں پیدا کر دیا تھا سینکڑوں ٹن بارود کے دھماکے تھے اور ارد گرد کے پہاڑوں میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ ہماری مشینری ناکارہ ہو کر رہ گئی، ہمارے خیموں کا نام و نشان نظر نہ آتا تھا۔ آگ سب کچھ کھا گئی تھی۔

تیسرے دن اس بات کی تصدیق کرنے ہیڈ آفس سے کئی لوگ آئے...... تاکہ جائزہ لے سکیں کہ ہم لوگ دفن شدہ شہر کو ڈھونڈنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ کمپنی کے چند ہیلی کاپٹر اس جگہ آ کر اترے۔ نیچے آ کر انہوں نے دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا ہر طرف جلی ہوئی چیزیں منہ چڑا رہی تھیں۔ کوئی زندہ انسان نظر نہ آ رہا تھا۔

ہر طرف تباہی پھیلی ہوئی تھی۔ فقط میں اکیلا ہی خیموں والی جگہ سے کچھ دور بیٹھا اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ اچانک ایک پائلٹ کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ 20 فٹ گہری سرنگ میں بارود ڈال کر ایک محراب نما عمارت کا راستہ تلاش کرنے کے لئے ایک زبردست دھماکہ کیا اور پہاڑوں کا بڑا حصہ ٹوٹ کر اس سرنگ میں آ گرا اور پھر چاروں طرف آگ پھیل گئی اور دھماکوں نے ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیا، جو جگہ ہم نے کھودی تھی وہ جوں کی توں بھر گئی تھی۔ اور اب پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ وہ کون سی سائیٹ ہے۔ نئے آنے والوں نے بذریعہ وائرلیس ہیڈ آفس اطلاع دی اور تمام واقعات بتا دیئے۔

دوسرے دن مزدوروں اور ملازموں کی لاشوں کا کھوج لگانے کے لئے مزید دو ہیلی کاپٹر جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ اس واقعہ کے کچھ دن بعد میں اپنے نئے خیمے میں بیٹھا اپنے ہلاک شدہ ساتھیوں کو یاد کر رہا تھا کہ خیمے میں بجلی جیسی مدھم روشنی پھیلنے لگی اور پھر خیمہ جگمگا اٹھا، میں اطانیہ کو بھلا چکا تھا۔

رات آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی کہ ملکہ اطانیہ کا غلام حاضر ہوا اور میرے ساتھیوں کی ہلاکت کا افسوس کرنے لگا، اس نے بتایا کہ ”مجھے ملکہ نے بھیجا ہے کہ ہمیں تمہارے ساتھیوں اور تمام ساز و سامان کے جل جانے کا بہت افسوس ہے۔“ میں نے اسے کچھ جواب نہ دیا۔ چند لمحوں بعد اس ڈھانچے نے سخت گیر لہجے میں کہا۔

جو نئے لوگ آئے ہیں ان کو کہہ دو کہ یہاں سے چلے جائیں۔ مصر کا ہزاروں سال پرانا یہ شہر جو دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے مگر زمین کے نیچے آج بھی آباد ہے۔ فرعون قہر خداوندی کے خاندان کے لوگوں کو تنگ نہ کریں۔“ اتنا کہہ کر وہ ڈھانچہ غائب ہو گیا۔

میں سوچنے لگا کہ ”اطانیہ تو ایک لاش ہے ایک ممی ہے جو ہزاروں سالوں سے پٹیوں میں جکڑی خوشبوؤں میں بسی ایک بے جان ممی ہے۔ اب اس کے زندہ ہو جانے کی بات محض خام خیال ہے۔“ ابھی میں نے یہ سوچا ہی تھا کہ میرے پیچھے ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی، مڑ کر دیکھا تو ملکہ اطانیہ سنہری تاج پہنے جاہ و جلال کے ساتھ کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ مصر سے فوراً ہی واپس چلا جاؤں۔

”تم تو مصر میں ممیاں دیکھنے آئے تھے۔ کیا ابھی سے جی بھر گیا۔ ابھی تو تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں قہر فرعون اعظم کے اہرام میں لے چلتی ہوں۔“ اس نے مجھے چھوا اور فوراً ہی ہم دونوں انہی پہاڑوں کے نیچے حسین وادی میں اتر گئے......

وہاں نہ سورج تھا نہ چاند نہ ستارے پھر بھی وہ علاقہ روشنی سے منور تھا...... پھر وہ مجھے حنوط شدہ لاشیں دکھاتی رہی، میں ٹکٹکی باندھے وہ سب کچھ دیکھتا رہا اچانک وہ غائب ہو گئی۔ اور ایک ممی کی شکل اختیار کر کے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ میرے چاروں طرف حنوط شدہ لاشیں تھیں، میں گھبرا گیا کہ میں کہاں آ گیا ہوں اب باہر کیسے جاؤں گا...... یا ادھر اسی طرح ایک ممی بن کر ملکہ اطانیہ کے قدموں میں سویا رہوں گا مجھے اپنے عزیز، بہن بھائی یاد آ رہے تھے، یہ سوچ کر میں بے ہوش ہو گیا...... چند لمحوں بعد اسی غلام نے مجھے اٹھایا۔

”میرے ساتھ آؤ میں تمہیں تمہاری دنیا میں چھوڑ آتا ہوں۔ تمہیں اس لئے زندہ رکھا گیا ہے کہ جا کر اپنی دنیا والوں سے کہہ دو کہ آئندہ اس طرف کا رخ نہ کریں، ورنہ ان کا بھی یہی انجام ہو گا......“

کمپنی والوں کی تمام محنت رائگاں گئی...... بہت ساری جانیں ضائع ہو گئی تھیں۔ لہٰذا حکم ملا کہ ہم واپس چلے آئیں۔ میں نے ہیڈ آفس والوں کو استعفیٰ دیا اور اپنے ملک آ گیا...... آج بھی جب مجھے ملکہ اطانیہ کی یاد آتی ہے تو سوچتا ہوں کاش وہ زندہ ہو جائیں۔

بلیک ٹائیگر

ایم الیاس

قسط نمبر 5

دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بہاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے

''**اچھا**...... اچھا...... چنتا نہ کرو۔'' شنکر نے اسے جیسے دلاسا دینے کے انداز میں کہا۔ ''فکر نہ کرو میں ان سے کہوں گا کہ تم بغیر درد اور تکلیف کے شانتی سے مرنا چاہتے ہو...... آسان موت اور آسان طریقے سے...... وہ تمہیں باہر لے جا کر گولی مار دیں گے...... ان کے پاس جو ریوالور ہے اس کی گولی بڑی خطرناک ہے۔ آدمی کو سانس لینے کی مہلت بھی نہیں دیتی ہے...... اس جگہ میں نے کشن لال کو دو ماہ قید رکھا تھا...... اور اس پر خوب تشدد کیا۔ ایذائیں دیں...... میں اسے بھی خنجر سے ختم کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی آخری خواہش تھی کہ گولی مار کر ختم کر دیا جائے۔ میں نے اس کی آخری خواہش کا احترام کیا۔ پھر اسے گولی مار کر دریا برد کر دیا۔ اس کا ڈھانچا کہیں نہ کہیں پڑا ہوگا۔ کیوں کہ گوشت تو مچھلیوں نے کھا لیا ہوگا...... یہ جگہ ایسی ہے کہ یہاں کوئی نہیں آتا ہے...... اس لئے میں نے لاکھوں کے نوٹ لا کے یہاں ڈال دیئے ہیں۔''

''ایک گلاس اور......'' ٹائیگر نے کہا۔ ''اس سے مجھ پر نشہ طاری نہیں ہو رہا ہے۔''

شنکر نے اس کے خالی گلاس میں بیئر بھر دیا اور پھر اسے تھما دیا۔ ''یہ تم پر نشہ طاری کر دے گا اور تم......؟''

ابھی اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ باہر سے فائر کی آواز آئی۔ شنکر نے چونک کر حیرت سے دروازے کی طرف دیکھا۔

''کیا یہ نشانے کی مشق کر رہے ہو......؟'' وہ تیز لہجے میں بولا۔ ''ان سالوں کو اس کی ضرورت تھی؟''

اس کے ماتھے پر ناگواری کی شکن نمودار ہو گئی تھی۔ اس نے بھی دروازے کی طرف دیکھا اور شراب شنکر کے منہ پر اچھال دی۔ کیوں کہ اس نے شعبہ قتل کے انسپکٹر رام دیال کا لمبا سایہ دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے ہزاروں میں دور سے ہی پہچان سکتا تھا۔

شنکر وقتی طور پر اندھا ہو گیا تھا۔ اس نے ٹائیگر کو گالی دی۔ یوں بھی ٹائیگر نے اپنی حفاظت کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ گو کہ اس کے ہاتھ آزاد تھے۔ اس کے قریب ہی ریت سے بھری پھٹی ہوئی بوری رکھی تھی۔ جب اسے گولی مارنے لے جانے کے لئے بدمعاش آتے تو وہ ان کی آنکھوں میں اور شنکر کی آنکھوں میں بھی جھونک دیتا...... وہ ابھی قدم اٹھاتے ہوئے اس لئے رک گیا تھا کہ اس نے مائیکروفون دیکھ لیا تھا اور پھر ادھر رام دیال بھی آ گیا تھا۔ اس لئے نوبت نہیں آئی تھی۔ اس

وقت انسپکٹر اندر آ گیا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ شنکر آنکھیں کھولتے ہی منجمد سا ہو گیا تھا۔

”بڑی دیر کردی مہرباں آتے آتے......؟“ ٹائیگر نے شوخی سے کہا۔

”یہ تم نے کی...... ذرا پہلے بتا دیتے کہ شنکر کے پاس ریوالور نہیں ہے۔“ انسپکٹر رام دیال نے کہا۔

”میں صرف تمہاری جان کے خیال سے رکا رہا...... میرا خیال تھا کہ مائیکروفون دیکھ لوگے۔“ انسپکٹر رام دیال نے توقف کے بعد پھر کہا۔

”مائیکروفون......؟“ شنکر نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔ ”میں سمجھا نہیں۔ کہاں ہے؟“

”ہاں...... میں دیو کے سوالات کی داد دیتا ہوں۔“ انسپکٹر دیال نے کہا۔ ”اس نے تم سے اول تا آخر سب کچھ پوچھ لیا...... اب تمہارا اقبال جرم تمہاری اپنی آواز میں ہمارے پاس ٹیپ کی صورت میں موجود ہے۔“ وہ ہتھکڑی لے کر آگے بڑھا۔

”شنکر نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیئے۔

چند لمحوں کے بعد انسپکٹر رام دیال نے شنکر کے خنجر سے ٹائیگر کی رسیاں کاٹ دیں۔ پھر اس نے آزاد ہو کر ہاتھ اٹھا کے کسی حسینہ کے انداز میں توبہ شکن سی انگڑائی لی......

پھر اس نے انسپکٹر سے بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم یہاں میری مدد کے لئے نہیں پہنچے ہو۔“

انسپکٹر رام دیال نے اثباتی انداز میں سر ہلایا اور ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

”یہ کیبن کوئی دو سال سے زیر نگرانی تھا...... جب کشن لال مارا گیا تو ہم نے دن رات باہر آنے جانے والوں پر نگاہ رکھی اور کشن لال کے دست راست یہاں آتے دیکھ کر ہم چوکس ہو گئے...... خفیہ پولیس کے شعبے سے بھی ہمارا واسطہ رہا جو جعلی نوٹوں کی تفتیش کر رہا تھا...... تمہاری مدد سے جرم بے نقاب ہوئے اور ہمارے سامنے حالات کی مکمل تصویر سامنے آ گئی......

تمہیں کیا معلوم کہ ہم چوبیس گھنٹے تم پر بھی نظر رکھے تھے...... ہر جگہ تمہارے پیچھے ہوتے تھے کیوں کہ تم مجرموں سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھے...... مجرم خود تمہارے پاس آتے تھے...... جال تم پھیلا رہے تھے اور ہم دور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔“

”ایسی صورت میں تم نے ان مجرموں کو گرفتار کرنے میں قدم کیوں نہیں اٹھایا......؟“ ٹائیگر نے کہا۔

”اس لئے کہ ہم بنے بنائے کھیل کو بگاڑنا نہیں چاہتے تھے۔“

”اس کے تین آدمی باہر تھے۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”ان کا کیا بنا......؟“

”ایک مارا گیا...... دوسرا جو دبلا پتلا تھا اور پہلوان ٹائپ پکڑا گیا۔“ انسپکٹر رام دیال نے جواب دیا۔

”گدھ مارا گیا...... اور گوریلا پکڑا گیا۔“ اس نے کہا۔ ”روزی سنے گی تو خوش ہو جائے گی۔“

”خوش تو تمہیں ہونا چاہئے۔“ رام دیال مسکرا دیا۔ ”زندہ بچ جانے پر بھی اور اس انعام پر بھی جو تمہیں ملے گا...... خفیہ پولیس کی خدمات اسٹیٹ بینک نے جعلی نوٹوں کا سراغ لگانے کے لئے حاصل کی تھیں اور انعام کا اعلان بھی کیا تھا......؟ پچیس ہزار روپے کا انعام...... اور ہم نے متفقہ طور پر طے کیا ہے اس کے لئے تمہارا نام بھیجا جائے اور ہم کا مطلب...... میں نے اور تمہارے ہی خفیہ پولیس کے درست انسپکٹر وشوا ناتھ نے...... تم نے جو بہادری کی وہ ہمارا انعام ہے...... کشن لال کے قاتل کو میں نے پکڑا...... جعلی نوٹ چھاپنے والے کو تمہارے دوست نے...... حقیقت یہ ہے کہ تمہاری مدد کے بغیر یہ کامیابی ناممکن تھی۔

☆......☆......☆

جب ٹائیگر مے خانے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ روزی اور مے خانے کا مالک بہت پریشان ہیں۔ دونوں کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ ان کے علم میں شاید یہ بات آ چکی تھی کہ ٹائیگر شام سے ہی گدھے کے سر

...ینگ کی طرح غائب ہے...... شاید اسے اغوا کر لیا ...ہے اور پھر اس کے دفتر سے ایک زخمی و بے ہوش ...ت میں ایک شخص ملا ہے جسے پولیس لے گئی۔

سب سے پہلے اس پر مے خانے کے مالک ...در گپت کی نظر پڑی۔ وہ کاؤنٹر سے نکل کر تیزی سے ...س کی طرف لپکا۔

”دیو کمار......!“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ...تم کیسے ہو......؟ خیریت تو ہے نا...... رات بھر کہاں ...ہے......؟“

”میں اب بالکل ٹھیک ہوں......“ ٹائیگر نے ...واب دیا۔ ”میں صبح تک بے ہوش رہا تھا۔ کیوں کہ مجھے ...بے ہوش کر دیا گیا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد مجھے ...جان سے مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔“

”لیکن تم صحیح سلامت ہو......“ وہ خوش ہو کر ...۔ ”وہ ناکام رہے نا......؟ کیا وہ غارت ہو گئے؟“

”میں اس لئے ان کے ہاتھوں سے مر نہیں سکا ...... مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ...ہے......“ اس نے جواب دیا۔ ”پولیس انسپکٹر رام ...دیال نے میرا کھوج لگا کر مجھے بچا لیا...... اب وہ ...بدمعاش قانون کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اسے پھانسی کی ...سزا ہو جائے گی۔“

”کس نے تمہیں اغوا کیا تھا......؟“ چندر گپت ...نے پوچھا۔ ”اور کس لئے......؟“

”شنکر نے...... اس لئے کہ میرے علم میں آ چکا ...تھا کہ اس نے کشن لال اور راجن کو قتل کیا ہے۔“ اس ...نے جواب دیا۔ ”انسپکٹر رام دیال نے اسے گرفتار کرنے ...کے لئے جال بچھایا ہوا تھا۔ اس میں وہ پھنس گیا۔“

”دیو کمار......! تم کاؤنٹر پر آؤ...... مجھے تم سے ...ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

جب ٹائیگر اس کے ساتھ کاؤنٹر کی طرف ...چلا تو اس وقت روزی کی نظر ٹائیگر پر پڑی تو وہ گلاب ...کی طرح کھل اٹھی۔ اس کا چہرہ دمک گیا اور اس کی بڑی ...بڑی نیلی آنکھوں میں ان گنت برقی قمقمے روشن ہو گئے۔ اس سے وہ اتنی پیاری لگی کہ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

روزی نے ٹائیگر پاس آ کر پوچھا۔ ”دیو......! تم کیسے ہو......؟ میں نے سنا تھا کہ تمہیں گدھ اور گوریلا اٹھا کر لے گئے......؟“

”ہاں......!“ اس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ”گدھ پولیس کے ہاتھوں مارا گیا...... گوریلا کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ اب ان دونوں سے نجات مل گئی ہے۔ کشن لال کا قاتل بھی گرفتار ہو گیا ہے۔“

پھر اس نے چندر گپت اور روزی کو انعام کے بارے میں بھی بتایا۔

”دیو کمار......!“ چندر گپت کہنے لگا۔ ”رات میں نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ یہ شراب خانہ بند کر دوں اور اس کی جگہ ہوٹل کھول لوں۔ اس کے لئے کچھ سرمائے کی ضرورت ہے۔ میں کہیں سے قرض لے لوں گا۔ میں شراب خانے سے سخت بیزار ہو گیا ہوں۔ نفرت ہو گئی ہے۔ کیوں کہ نئی نسل خراب ہو رہی ہے۔ میں نے روزی سے بات کی تھی وہ خود بھی یہی چاہتی ہے...... میں چاہتا ہوں کہ تم سراغ رسانی کا دھندا چھوڑ دو۔ ہوٹل سنبھال لو...... اور ہاں تم کیا کہتے ہو......؟ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

”ہوٹل روزی سنبھال لے گی...... سراغ رسانی میرا شوق اور جنون ہے۔ آپ کو شراب خانے کو ہوٹل میں تبدیل کرنے کے لئے کتنی رقم کی ضرورت پڑے گی......؟“ اس کا اندازہ اور حساب کتاب ہے؟“

”دو لاکھ روپے......“ چندر گپت نے کہا۔ ”میں سوچ بچار کر رہا ہوں کہ اپنا فلیٹ بیچ دوں اور ہوٹل میں ایک کمرہ بنا لوں۔“

”نہیں...... آپ کو فلیٹ بیچنے کی ضرورت نہیں۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”دو لاکھ روپے میں دوں گا۔“ یہ قرض نہیں ہوگا۔“

”دو لاکھ روپے......؟ تم دو گے......؟“ چندر گپت نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ ”تم بن بیٹے بہک

رہے ہو...... نشے میں ہو......"

"میں نشے میں نہیں ہوں......" اس نے کہا۔ "میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں یہ ہال خرید سکتا ہوں...... میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میرے پاس کتنی دولت ہے...... میں اصل میں کون ہوں......؟ کیا ہوں......؟"

☆......☆......☆

روزی جس وقت اپنی ڈیوٹی ختم کرکے مے خانے سے نکلی اس وقت ٹائیگر عمدہ قسم کے سوٹ میں تھا۔ اس کی نئی گاڑی جس کے بارے میں روزی نہیں جانتی تھی۔ وہ کار کے پاس کھڑا ہوا اس کا انتظار کررہا تھا۔

روزی نے اسے اوپر سے نیچے دیکھا۔ وہ بگڑ کر بولی۔

"ابھی انعام نہیں ملا...... اور تم نے قرض لے کر اڑانا شروع کردیا؟"

"پیسہ خرچ کرنے کے لئے ہوتا ہے اس پر ناگ بن کر بیٹھنے کے لئے......" ٹائیگر مسکرایا۔ "سنو...... ان فاتحانہ باتوں کو چھوڑو...... میں تمہیں پرتکلف ڈنر پر شیرٹن لے جانا چاہتا ہوں...... مہارانی......! کیا چلنا پسند کروگی......"

"کیوں نہیں......" روزی نے اپنا خوش نما سر ہلایا۔ "تم نے پہلی بار اتنے خلوص سے دعوت دی ہے۔ میں کیسے انکار کرسکتی ہوں۔"

"تم نے خلوص کے ساتھ محبت کا لفظ شامل کیوں نہیں کیا......؟"

"اس لئے کہ خلوص میں محبت شامل ہوتی ہے۔ محبت نہ ہوتو خلوص بھی نہیں ہوتا ہے۔"

جب اس نے ہوٹل شیرٹن کے بجائے مالابار ہل کے سپریم ہائٹس اپارٹمنٹ کے سامنے گاڑی روکی تو روزی نے کہا۔

"یہ تم کہاں لے آئے......؟ کیا نشے میں ہو...... یہ ہوٹل شیرٹن تو نہیں ہے......؟"

اس نے کہا۔ "یہاں میرے ایک دوست میاں بیوی رہتے ہیں......" اس نے کہا۔ "چلو...... انہیں بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔"

اس عمارت میں جو فلیٹس تھے ان میں شہر کے دولت مند اور اداکارائیں رہتی تھیں۔ اس میں اس کا اپنا ذاتی لگژری فلیٹ تھا۔ وہ سحر زدہ سی اس نہایت آراستہ فلیٹ کو دیکھنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد وہ دوست میاں بیوی کو نہ دیکھ کر بولی۔

"یہ تمہارا اپنا ہے...... لیکن دیوکمار......؟"

جب ٹائیگر نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو وہ تحیر زدہ لہجے میں بولی۔ "او بھگوان......! کیا تم دہری زندگی گزار رہے تھے...... وہ کس لئے؟"

"صرف تمہارے لئے......" اس نے جواب دیا۔ "تمہارا مستقبل تابناک بنانے کے لئے......"

"لیکن......! دیوکمار......!" وہ حیران سی ہوکر بولی۔ "میں ایک معمولی عورت ہوں...... شراب خانے کی ویٹرس...... اور تم......"

"اس لئے کہ تم ایک بہت اچھی لڑکی ہو...... جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو میں تم سے بے حد متاثر ہوا...... اس غلاظت کے ماحول میں بھی تم کنول ہو۔ تم نے کبھی بھی اپنے آپ کو سستا نہیں کیا...... گرایا نہیں...... کسی کی جھولی میں گری نہیں...... تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی تو اپنے آپ کو میلا کرتیں اس لئے میں تمہیں ایک بڑے انعام سے نوازنا چاہتا ہوں...... تمہارا وہ گھر بسانا چاہتا ہوں جس کے لئے تم نے یہ ملازمت کی...... میں تمہارا ہاتھ آنند شرما کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں......"

"آنند شرما......؟" وہ اچھل سی پڑی۔ "تم...... تم آنند شرما کے بارے میں کیسے جانتے ہو......؟" وہ سرخ ہوگئی۔

"بے وقوف......! تم یہ بھول گئیں کہ میں ایک سراغ رساں ہوں...... میں کیا کچھ نہیں جانتا ہوں۔ وہ تم سے بغیر جہیز اور لین دین کے شادی کرنا چاہتا ہے...... لیکن تمہاری اس کے لئے تیاری نہیں ہے کہ تم

سسرال جاکر ساس، نندوں اور دیوروں کے طعنے سنو...... میں تمہاری شادی آئندہ ہفتے کروں گا۔ اتنا جہیز اور لین دین دوں گا کہ ان کا منہ بند رہے...... شادی کے بعد ہنی مون منا کر آؤ گی تو چندر گپت کے ہوٹل کو سنبھالوگی...... اور آنند شرما کو اس کی ملازمت کرنے دوگی...... وہ بہت پیارا اور تمہارا جوڑ ہے۔"

"دیوکمار......!" روزی سسک کر اس کے سینے میں آگئی...... "تم کتنے عظیم دوست، بھائی...... باپ کی طرح ہو......" اس کی آنکھیں بھرائیں۔

"لیکن بھول رہی ہو کہ میں ٹائیگر سراغ رساں بھی ہوں......" ٹائیگر نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

روزی...... روتے روتے ہنس پڑی۔

ٹائیگر نے روزی کی شادی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس نے روزی سے کہا تھا کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ وہ دہری زندگی گزار رہا ہے...... وہ دیوکمار ہے...... ٹائیگر نہیں ہے...... اس نے روزی کی ماں کے ہاتھ پر چار لاکھ کی رقم رکھتے وقت کہا تھا کہ...... وہ اس رقم کے بارے میں اور اس کے متعلق کسی کو نہ بتائے...... کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ جب روزی پیدا ہوئی تھی اس روز سے اس کے نام بینک میں پس انداز کی ہوئی رقم جمع کرتی آئی تھی...... یہ اس کی محنت کی کمائی ہے جو سلائی کے کارخانے میں ایک ورکر تھی یہ اس کا محنتانہ ہے۔ وہ پس پردہ ہی رہا تھا۔ اس نے البتہ روزی کی شادی میں شرکت کی تھی۔ آشیرباد بھی دیا تھی۔

☆......☆......☆

ٹائیگر آج جب اپنے لگژری فلیٹ میں بستر پر دراز تھا اسے اپنا ماضی یاد آگیا۔ اس وقت وہ ٹائیگر نہ تھا۔ اس کی مجرمانہ زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ اس واقعہ اور حالات نے اسے جیل پہنچایا تھا۔ اس وقت وہ صرف وسیم احمد تھا۔

وسیم سات برس کے ایک لمبے اذیت ناک اور صبر آزما عرصے کے بعد کل رہا ہونے والا تھا۔ جب

اس نے سات برسوں کو سات صدیوں کی طرح کاٹا تھا یہ اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس پر اس عرصے میں کیا بیتی...... وہ ماہئی بے آب کی طرح تڑپتا رہا تھا۔

اگر اس کے سینے میں انتقام کی آگ نہ بھری ہوتی تو یہ سات برس کی ستر برس بھی جیل میں سکون و اطمینان سے کاٹ لیتا اور اپنی رہائی کا کبھی بھی نہ سوچتا۔ اسے اپنی رہائی کی کوئی خواہش ہوتی اور نہ تمنا...... یہ انتقام کی آرزو تھی جس نے ایک دن کو ایک صدی بنادیا تھا۔

سات برس پہلے جب اس نے جیل میں قدم رکھا تھا تو اس دن فیصلہ کرلیا تھا وہ عاصم کو ہر صورت میں قتل کرکے رہے گا...... ہر قیمت پر اس سے انتقام لے گا...... اسے اس رقم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جو عاصم نے بغیر ڈکار لئے ہضم کرلی تھی...... اسے صرف اور صرف عاصم کی جان کی ضرورت تھی...... وہ اسے ایک پل بھی زندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا...... اس شخص کے لئے کسی کی زندگی کو ختم کردینا مشکل نہیں تھا جو جیل واپس جانے اور ہر سزا بھگتنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو۔ اب اسے جیل سے باہر کی دنیا...... اس کی رنگینیاں اور رونقوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اسے یہ دنیا زہر لگتی تھی۔ جس میں مکروفریب، خودغرضی اور بے ضمیری کے سوا کچھ نہ تھا...... اس دنیا میں جتنی ریاکاری اور منافقت تھی اس کا آدمی پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا...... اس نے جیل میں جرائم پیشہ لوگوں سے دوستی کرلی تھی۔ وہ ان سے تربیت حاصل کرنے لگا۔ ان کا دوست بن گیا کیوں کہ اسے اپنے دشمن کو قتل کرنے کے لئے ہر فن میں طاق ہونا ضروری تھا۔

جب وہ جیل سے باہر آیا تو اسے ذرہ برابر بھی کوئی خوشی نہیں ہوئی...... خوشی کیا ہوتی ہے......؟ خوشی کسے کہتے ہیں......؟ وہ یہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اس کے لئے یہ سب کچھ بے معنی ہوچکا تھا۔

اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ ان سات برسوں میں یہ دنیا اتنی بدل گئی تھی جیسے سات صدیاں بیت گئی ہوں...... یہ دنیا پہچانی نہیں جاتی۔ اجنبی

اور غدار بن گئی تھی۔ ہر شخص اپنی غرض میں اندھا ہو کر ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا...... انسان بڑی تیزی سے واپس اپنی پرانی تہذیب کی طرف لوٹ رہا تھا جب اخلاق نے اسے چھوا تک نہیں تھا...... یہ ایک جنگل تھا انسانی حیوان اور ہر انسان خون آشام بھیڑیا بنا ہوا تھا۔ درندہ صفت...... کوئی قانون نہیں تھا...... فرق صرف اتنا تھا کہ وہ آج یہ سب کچھ انسانیت کی آڑ میں کر رہا تھا۔

اس کا اپنا گھر تھا جس میں دو کمرے اور ایک بہت بڑا صحن تھا جس میں سپاری اور ناریل کے درخت تھے۔ یہ مکان اسے ورثے میں ملا تھا۔ اس گھر کی چابی وہ صابرہ خالہ کو بطور امانت دے آیا تھا جو اس کی پڑوسن تھیں اور اس کی ماں کی سہیلی بھی...... انہوں نے اسے گودوں پالا بھی تھا...... اس کا خیال تھا کہ صابرہ خالہ کے کسی بیٹے نے اس مکان کو ہڑپ کر لیا ہوگا۔ ان کے دو جوان بیٹے تھے۔ اسے ان پر اعتماد نہیں تھا۔ یہ مکان اس کے نام پر تھا۔ لیکن اس بددیانتی سے اس پر کیا فرق پڑتا۔ مکان کے کاغذات بھی گھر میں ہی رکھے تھے۔ جعلی کاغذات بنتے کیا دیر لگتی۔ پیسہ ہر کام کرا سکتا تھا۔ کرتا تھا۔ پھر بھی وہ نہ جانے کیوں وہ دل میں ایک مدھوم سی امید لئے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس کے مکان کو ان لوگوں نے اپنے نام کرا لیا ہوگا...... یا بیچ دیا ہوگا تو وہ خاموشی سے واپس چلا آئے گا۔ کیوں کہ قانونی چارہ جوئی کرنے کے لئے اس کے پاس اتنی بڑی رقم اور وقت کہاں تھا اور پھر اسے شہر میں رہنا کہاں تھا۔ اگر وہ مکان کے حصول کے چکر میں پڑا تو برسوں لگ جائیں گے۔ کیوں کہ مقدمہ برسوں چلے گا۔ عدالتی نظام آج بھی بڑا ناقص فرسودہ تھا۔

وہ بس میں بیٹھا سارے راستے شہر کی رونق اور گہما گہمی دیکھتا رہا تھا۔ پھر وہ بس اسٹاپ پر اتر کر اپنے محلے کی طرف بڑھا۔ محلہ بھی پہچانا نہیں جا رہا تھا...... پرانے مکانوں کی جگہ نئے اور بلند و بالا گھروں نے لے لی تھی۔ ایک بہت بڑا اور بارونق شاپنگ سینٹر بھی بن گیا تھا۔ کچھ مکانوں کے سامنے مختلف ماڈل کی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ البتہ اس کی گلی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ صرف دو ایک نئے مکان دکھائی دیئے تھے۔ یہ ویسی ہی تھی جب کہ اس کے محلے میں کسی کے پاس گاڑی نہ تھی۔ سات برسوں میں بھی اس گلی کی وہی حالت زار تھی جو پہلے تھی۔ کچھ مکان جو بہت پرانے تھے ان کی حالت مزید خستہ ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ طوفان آندھی یا موسلا دھار بارش سہہ نہ سکیں گے۔

جب اس کی اپنی گلی کے ایک مکان پر نظریں پڑیں تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر جو مکان تھا وہ نیلو کا تھا۔ اس کا اصل اور پورا نام نیلوفر تھا۔ لیکن اسے نہ صرف گھر والے بلکہ باہر کے لوگ بھی نیلوفر کے نام سے ہی پکارتے تھے۔ نیلو جو اس کے سپنوں کی شہزادی...... ملکہ اور مہارانی تھی۔ وہ نیلو سے محبت کرتا تھا۔ نیلو بھی تو اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ وہ اس کی محبت میں پاگل تھی۔ وہ اسے بنگالی ساحرہ کہتا تھا۔

جس روز عدالت میں فیصلہ سنایا جانا تھا نیلو بھی فیصلہ سننے آئی تھی...... اسے صابرہ بیگم اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔ وہ فیصلہ سن کر رونے لگی تھی...... اور اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اس نے نیلو کے صاف شفاف موتیوں جیسے آنسوؤں کو رومال میں جذب کرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''نیلو...... ! سات برس کا عرصہ کسی بھی جوان لڑکی کے لئے بہت طویل ہوتا ہے...... تم میرا انتظار نہ کرنا۔ اور بیاہ کر کے اپنا گھر بسا لینا...... اگر تم نے انتظار کیا تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا...... کیوں کہ کوئی بھی باپ برے آدمی کو اپنا داماد نہیں بناتا...... میں آج سے برا آدمی بن چکا ہوں؟...... قانون نے مجھے مجرم بنا دیا ہے۔''

نیلو نے اس کی بات کے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ بس وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی۔

اپنی آنکھوں پر ساڑھی کا پلو رکھ لیا تھا۔ پھر وہ سپاہیوں کے ساتھ چل پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلک پڑے تھے۔ اس لئے کہ اس نے کبھی نیلو کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے بلکہ خوشیاں دیکھتا آیا تھا۔ اس کا دل بھر آیا تھا۔ اگر نیلو نے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ لیا ہوتا تو اس کے دل پر خدا جانے کیا گزرتی......؟ وہ یہ سوچ کر رہ گیا تھا۔

اس نے جیل میں نیلو کو بھولنے کی بڑی کوشش کی اور اپنے آپ کو اس قدر مصروف کر لیا اور استاد اور دوست پیدا کر لئے تھے کہ جس کے کارن وہ کسی حد تک نیلو کو بھول بھی گیا...... اور وہ یہ بات جانتا تھا کہ نیلو کی شادی جلد ہو جائے گی...... کیوں کہ وہ جتنی حسین اتنی ہی نازک بھی...... شاخ گل جیسی لچک اور ایک عجیب گداز اس کے پرشباب بدن میں موجود ہے...... اس میں جو جاذبیت...... دل کشی اور رعنائی ہے وہ بہت کم نوجوان لڑکیوں میں ہوتی ہے، جوانی کے نکھار نے اس کی حشر سامانیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ وہ شخص دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب ہوگا جسے نیلو کی رفاقت ملے۔

آج نیلو کے مکان کے سامنے پہنچ کر ماضی اس کی نظروں میں گھوم گیا تھا...... ماضی حال بن کر یادوں کو تازہ کرنے لگا...... اس کے ذہن کے بند دریچے ایک ایک کر کے کھلتے گئے تھے...... اس نے سوچا۔ نیلو کی شادی ہو گئی ہوگی۔ وہ دو تین پیارے پیارے بچوں کی ماں ہوگی...... اور شاید اسے بھی یاد تو کرتی ہوگی...... وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک خوش گوار اور پرمسرت زندگی گزار رہی ہوگی...... معلوم نہیں اس کی شادی کس سے ہوئی ہوگی...... محلے میں کئی جوان اس سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے...... کئی گھرانے اسے اپنی بہو بنانا چاہتے تھے...... شاید اس کے باپ نے کسی اور بستی اور محلے میں بیاہ دیا ہو......؟

جب وہ نیلوفر کے بارے میں سوچتا صابرہ خالہ کے ہاں پہنچا تو وہ اسے اچانک اور غیر متوقع دیکھ کر جتنی حیران اور خوش ہوئیں کہ اس کی والدہ بھی زندہ ہوتیں تو شاید اتنی خوش نہ ہوتیں...... انہوں نے اسے سینے سے لگا کر خوب پیار کیا...... بلائیں لیں اور اس پر اپنی ممتا اس طرح نچھاور کی جیسے وہ ان کا سگا بیٹا ہو...... برسوں کے بعد گھر آیا ہو۔ ان کے گھر میں بڑی تبدیلی اور رونق تھی...... مکان خاصا خوب صورت اور نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ اس میں دو کمروں کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ آرائش و زیبائش اور آسائش کے لوازمات بھی دکھائی دیئے تھے۔ جو بڑی رقم ہاتھ لگنے پر خرچ کی گئی تھی۔ ان کے دونوں بیٹوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

اسے خوب پیار کرنے کے بعد وہ ساتھ کھڑی ہوئیں اپنی بہوؤں سے بولیں۔

''یہ تم دونوں کھڑی کھڑی منہ کیا تک رہی ہو......؟ جلدی سے جاؤ...... میرے بیٹے کے لئے عمدہ اور شان دار کھانا بناؤ...... سات برس کے انتظار کے بعد تو اپنے بیٹے کو دیکھ رہی ہوں...... اس نے جیل میں بھلا ایک دن بھی اچھا کھانا نہ کھایا ہوگا؟''

اس کے دل کے کسی کونے میں ایک خیال سانپ کی طرح لہرایا...... صابرہ خالہ نے اتنی محبت اور خوشی کا اظہار کیا اس کی آمد پر کیا ہے اس لئے تو نہیں کہ اس کا مکان ہڑپ کر لیا ہے...... یہ خوشامد اور چاپلوسی اور پذیرائی کہیں اس وجہ سے تو نہیں......؟ اگر یہ جذبہ کار فرما ہے تو وہ کیا کر سکتا ہے......؟ کیا بول سکتا ہے......؟

اس نے اپنے مکان پر جو تالا لگا ہوا دیکھا تھا وہ زنگ آلود نہ تھا بلکہ صاف ستھرا بھی تھا۔

صابرہ بیگم نے اسے دسترخوان پر بڑی محبت اور اصرار سے بہت کچھ کھلایا۔ اس خاطر مدارات سے وہ سمجھ گیا کہ اس کی اتنی خاطر مدارات ہو رہی ہے کہ انہوں نے اس کا مکان ہتھیا لیا ہے۔ کھانے کے بعد وہ اس مکان پر قبضے کے بارے میں کوئی جواز پیش کریں گی۔

جس وقت وہ کھانے سے فراغت پا کر چائے پی رہا تھا۔ صابرہ خالہ نے اس کے مکان کی چابی رکھ دی۔

”لو بیٹا...... اب تم اپنی امانت سنبھالو۔“

وہ اپنی منفی سوچ پر دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ اس دنیا سے ابھی محبت اور خلوص کے جذبے رخصت نہیں ہوئے تھے...... بے لوث، بے غرض اور پر خلوص عظیم لوگ بھی موجود تھے۔ صابرہ خالہ جیسی ہستیوں سے ہی تو یہ دنیا قائم تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ آپ نے......“ جذبات سے مغلوب ہو کر فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

”بیٹے...... ! شکریہ تو میں تمہارا ادا کرنا چاہتی ہوں۔“ صابرہ خالہ نے ایک لمبی پر سکون سانس لے کر کہا۔

”میرا شکریہ......؟“ اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ وہ متعجب لہجے میں بولا۔ ”کس بات کا شکریہ خالہ...... !“

”اس بات کا شکریہ کہ تم نے مجھے ایک بہت بڑی اذیت سے نجات دلائی۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”میں ایک رات بھی سکون کی نیند سو نہ سکی ہوں۔“

اس نے حیران ہو کر صابرہ خالہ کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر بلا کی طمانیت تھی۔ ”کیسی اذیت......؟“ اس نے پوچھا۔

”بیٹا...... ! ایک اذیت ہو تو بتاؤں۔“ وہ کہنے لگیں۔ ”تمہیں سزا کیا ہوئی۔ محلے والوں نے میری زندگی عذاب کر دی...... تمہارے اس مکان پر ہر ایک کی نظر تھی جیسے لوٹ کا مال ہو...... راستے کا مال ہو...... جسے دیکھو چلا آ رہا ہے...... پچاس ہزار لے لو...... ایک لاکھ لے لو...... اس مکان کی چابی دے دو...... صرف دس ہزار میں...... ہم وسیم سے نمٹ لیں گے...... جب وہ رہا ہو کر آئے گا تب دیکھا جائے گا...... اور تو اور میرے دونوں بیٹوں کے منہ میں پانی بھر آیا تھا...... ان کی نیت میں فتور آ گیا تھا...... میں نے کس طرح اس مکان کی حفاظت کی بس میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا چین و سکون حرام ہو کر رہ گیا تھا۔“

”اگر آپ یہ مکان اپنے نام کروا لیتیں تو یقین جانیے مجھے ذرہ برابر بھی ملال نہیں ہوتا صابرہ خالہ!“ اس نے بڑے جذبے سے کہا۔

”تمہیں کیوں دکھ نہیں ہوتا بیٹے......؟“ صابرہ بیگم نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے رسمی بات نہیں کی ہے۔ دل سے یہ بات کہی ہے۔

”اس لئے کہ آپ میری ماں کی جگہ ہیں۔“ اس نے ان کے ہاتھوں کو لے کر چوما۔ آنکھوں سے لگایا۔ ”میں نے ہمیشہ آپ کو ماں کی جگہ سمجھا ہے۔“

”ارے بیٹا...... ! مجھے تمہارا مکان لے کر کرنا کیا تھا؟“ وہ پیار سے اس کا گال تھپ تھپاتے ہوئے بولیں۔ ”کیا یہ میرا مکان...... ہم لوگوں کے لئے کافی نہیں ہے...... اور پھر کس چیز کی کمی ہے جو تمہارے مکان پر نظر رکھتی...... اللہ تمہیں ایسے دس مکان نصیب کرے...... آمین۔“ انہوں نے دعا دی۔ ”تمہارا دل کتنا بڑا اور خوب صورت بھی ہے۔“

پھر اسے اچانک نیلو کا خیال آیا تو وہ چند لمحوں تک تذبذب میں رہا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

”خالہ...... ! کیا نیلو کی شادی ہو گئی......؟ وہ آج کل کہاں ہے......؟“

”ہاں بیٹے...... ! اس کی شادی کو پورے پانچ برس ہو رہے ہیں۔“ صابرہ بیگم نے جواب دیا۔ ”اس کے دو بچے بھی ہیں۔ بہت پیارے اور خوب صورت ہیں...... اسے شوہر بھی بہت اچھا اور نیک ملا ہے...... بے چارے کے نصیب اچھے نہیں ہیں۔“

”کیوں کیا ہوا خالہ...... !“ اس نے گھبرا کر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی؟“

”ہاں بیٹے...... !“ صابرہ بیگم نے ایک لمبی سانس لے کر افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”یہی سمجھو وہ غریب آج کل بڑی مصیبت اور...... پریشانیوں میں گری ہوئی ہے۔“

اسے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ نیلو کے دو بہت ہی پیارے پیارے بچے ہیں اور اسے شوہر بھی بہت اچھا ملا ہے اور نیک آدمی بھی ہے...... لیکن ان کے آخری جملے کو سن کر اس کے دل پر ایک چوٹ لگی اور گہرے صدمے کا احساس ہوا۔ وہ نیلو کو دکھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن قسمت اسے کس بات کی سزا دے رہی تھی۔

”لیکن مصیبت......؟ کیسی پریشانیاں......؟“ اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ مجھے کچھ بتائیں تو سہی......؟“

”کوئی سات آٹھ مہینے پہلے کی بات ہے اس کے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔“ صابرہ بیگم نے اسے بتانے لگیں۔ ”اس کا شوہر شوکت اس روز سائیکل پر دفتر سے گھر آ رہا تھا کہ ایک تیز رفتار کار نے ٹکر مار دی...... کار والا اسے اسپتال پہنچانے کے بجائے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ایک انسان دوست شخص نے اسے سرکاری اسپتال پہنچایا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ نہ صرف ہاتھ بلکہ ایک ٹانگ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی ہے...... وہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا اور کسی معذور کی طرح پلنگ پر پڑا رہتا ہے...... اگر اس غریب کے پاس پیسہ ہوتا تو ہڈی جوڑ کے اسپتال میں علاج کروا کر ٹھیک ہو گیا ہوتا...... اس پرائیویٹ اسپتال میں خرچ بہت آتا ہے...... اس کے پاس جو شادی کے زیورات تھے اس نے فروخت کر دیئے۔ کیوں کہ سرکاری اسپتال میں بھی بڑا خرچ آیا۔“

”نیلو کا گھر کس طرح چلتا ہے......“ اس نے فکر مندی سے دریافت کیا۔ ”کیا شوکت کے والدین اور بھائی بہن بھی ساتھ ہیں۔“

”نیلو کے ساس سسر تو نہیں ہیں البتہ اس کے شوہر کے جو بڑے بھائی ہیں وہ الگ رہتے ہیں۔“ صابرہ بیگم کہنے لگیں۔ ”لیکن اس مصیبت میں بھی دونوں بھائی اپنے چھوٹے بھائی کے کام نہیں آئے...... جیسے ان کا خون سفید ہو گیا ہے۔“

”پھر گھر کیسے چل رہا ہے......؟“ اس نے اداسی سے پوچھا۔ ”شوہر بستر پر پڑ گیا ہے۔ دو بچے بھی ہیں اور کوئی پرسان حال بھی نہیں۔“

”غریب نیلو ایک زچہ خانہ میں نرس کا کام کر کے گھر چلا رہی ہے۔“ صابرہ بیگم نے جواب دیا۔ ”وہ اپنے شوہر کی خدمت بھی کر رہی ہے اور اس کے ماتھے پر بل تک نہیں آتا اور نہ ہی بیدار ہو جاتی ہے...... بڑی عظیم عورت ہے بے چاری...... !“

پھر وہ اپنا گھر دیکھنے چلا گیا۔

اس کا گھر نہ صرف صاف ستھرا اور آئینے کی طرح چمک رہا تھا بلکہ اس گھر کی ہر چیز اپنی جگہ جوں کی توں تھی جس طرح وہ چھوڑ گیا صابرہ خالہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ ہفتے میں دو مرتبہ خود ہی گھر صاف کرتی تھیں۔ کبھی انہوں نے بہوؤں کو گھر میں گھسنے اور صفائی کرنے نہیں دیا...... کیوں کہ انہیں اس بات کا خوف اور اندیشہ تھا کہ ان کی بہو کوئی چیز اٹھا کر اپنے میکے نہ لے جائے۔“

وہ شام تک بستر پر دراز رہا۔ صرف نیلو کے بارے میں سوچتا رہا۔ نیلو جب اس گھر میں کسی نہ کسی کام سے آتی تھی تو یہ گھر اس کے وجود سے مہک اٹھتا تھا۔ اس گھر سے ان کی محبت کی بہت ساری یادیں وابستہ تھیں۔ انہوں نے کبھی اپنی محبت کو میلا نہیں کیا تھا۔ ایک پاکیزگی تھی...... وہ چاہتا تو من مانیاں کرتا...... لیکن اس نے ہمیشہ اس بات سے گریز کیا۔ نیلو کبھی تعرض نہیں کرتی۔ محبت کے اس رشتے نے ہمیشہ انہیں قلب کی طمانیت اور ایک عجیب سی جذبہ محبت کو سرشار کیا تھا...... لیکن آج یہ گھر اس کے بغیر کسی کھنڈر کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

جب وہ رات کے کھانے پر صابرہ بیگم کے ہاں گیا تو ان کے دونوں بیٹے بھی موجود تھے۔ وہ بھی بڑی محبت اور خلوص سے ملے تھے۔ اس نے رات کا کھانا کھاتے ہوئے ان کے بیٹوں سے کہا۔

"میں اپنا مکان فوری طور پر فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی اچھا خریدار ہو تو بتائیں۔"

"کیوں بیٹا......! تم اپنا مکان کیوں بیچ رہے ہو......؟" صابرہ بیگم نے چونک کر تعجب سے پوچھا۔ "یہ تمہارے ماں باپ کی نشانی اور یادگار ہے۔"

"اسلئے کہ اب میں کسی اور شہر میں جا کر اپنی نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"تم نئی زندگی یہاں بھی شروع کر سکتے ہو۔" صابرہ بیگم بولیں۔ "تم یہاں پیدا ہوئے، آنکھیں کھولیں۔ اب شادی کر کے یہ گھر بسالو۔ میں تمہارے لئے چاند سی دلہن ڈھونڈ کر لاؤں گی...... دو ایک لڑکیاں میری نظر میں ہیں۔"

"اگر میں یہاں رہا تو مجھ پر انگلیاں اٹھتی رہیں گی۔ لوگ طعنے دیتے رہیں گے۔" اس نے کہا۔ "مجھ پر جو داغ لگ چکا ہے وہ کبھی مٹ نہیں سکے گا۔ ایک برے آدمی کو اپنی بیٹی کون دے گا......؟"

صابرہ خالہ کے بڑے بیٹے نے اس سے پوچھا۔ "تم یہ مکان کتنے میں بیچنا چاہتے ہو؟"

"میں آج ہی تو جیل سے رہا ہو کر آ رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے کیا معلوم کہ مکان کی آج کل کیا قیمت چل رہی ہے۔ آپ ہی بتا سکتے ہیں یہ مکان کتنے میں بک جائے گا......؟ کوئی اندازہ ہوگا آپ کو......؟"

"دس لاکھ ٹاکا تو کوئی بھی آنکھ بند کر کے دے دے گا......" حمید نے کہا۔ "ان سات برسوں میں مکان کی قیمتوں میں تین چار گنا اضافہ ہو چکا ہے۔"

"کاش......! ہمارے پاس اتنی رقم ہوتی تو ہم یہ مکان خرید لیتے۔" صابرہ بیگم نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ "ہمیں اب یہ مکان چھوٹا پڑنے لگا ہے۔ اور مستقبل میں تو یہ اور بھی چھوٹا پڑے گا......"

"آپ لوگوں کے پاس کتنی رقم ہے......؟" اس نے حمید کی طرف دیکھا۔ "میں اس مکان کو کم قیمت پر آپ کے ہاتھ بیچنے کے لئے تیار ہوں۔"

"سات لاکھ ٹاکا ہیں بیٹے......!" حمید سے پہلے صابرہ بیگم بول اٹھیں۔

"ٹھیک ہے...... سات لاکھ ٹاکا دے دیجئے اور یہ مکان لے لیجئے......" وہ بولا۔ "مجھے رقم کی اشد ضرورت ہے...... بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ دو ایک روز میں رقم مل جائے تو اچھا ہے تاکہ میں جتنا جلد ہو سکے اس شہر کو خیرباد کہہ دوں۔"

"کل صبح دس بجے سات لاکھ ٹاکا لے لیجئے۔" حمید نے کہا۔ "ہم آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولیں گے۔"

"پورے سات برسوں تک اس مکان کی حفاظت کر کے جو احسان آپ لوگوں نے مجھ پر کیا ہے وہ میں کیسے بھول سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "اگر مجھے رقم کی ضرورت نہ ہوتی...... میں تہی دست نہ ہوتا میں یہ مکان اپنی ماں کے نام کر دیتا...... آپ کی ماں میری ماں جیسی ہیں...... مجھے بڑی ندامت ہو رہی ہے کہ...... شرم آ رہی ہے کہ ایک بیٹا...... ماں کو مکان بیچ رہا ہے......"

"اگر تم مفت میں بھی مکان دیتے تو میں نہیں لیتی۔" صابرہ بیگم نے جواب دیا۔

دوسرے روز حمید نے سات لاکھ ٹاکا بڑے اور کچھ چھوٹے نوٹوں کی صورت میں لا کر دے دیئے۔ دو دن قانونی اور کاغذی کارروائیوں میں لگ گئے۔ تیسرے دن اس نے ایک چھوٹے سے اٹیچی کیس میں اپنے چند جوڑے اور ضرورت کی چیزیں رکھیں۔ اس نے صبح یہ شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا...... اس نے دو تین دن یہاں اس لئے بسر کئے تھے کہ عاصم کا پتا چلا سکے...... اس نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اس کا پتا چلا لیا تھا۔ وہ اس شہر میں موجود نہ تھا...... اس نے سات برس پہلے ہی یہ شہر چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ کسی مفرور قاتل کی طرح روپوش تھا۔ اس نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ ہر قیمت پر اسے تلاش کر کے رہے گا۔ چاہے وہ دنیا کے کسی کونے میں کیوں نہ ہو۔ اس کے سینے میں انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی انتقام لینے پر ہی بجھ سکتی تھی۔ جیل سے رہا

ہوتے ہی انتقام کا آتش فشاں اندر ہی اندر بھڑکنے لگا اور وہ یک لخت جیسے پھٹا تھا۔

شام کے وقت اس نے ایک کوارٹر نما مکان کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا تو وقت کی نبض جیسے رک گئی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے نیلو کھڑی تھی۔

سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز میں...... ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی ابھی ڈیوٹی دے کر آئی ہو...... یہ وہی نیلو تھی جو کبھی اس کی محبت تھی...... اس کا سندر سا سپنا تھی...... اس کی زندگی تھی جو آج کسی اور کی زندگی بن گئی تھی...... وقت اور حالات نے ان کے درمیان بڑے فاصلے پیدا کر دیئے تھے...... اب وہ کسی کی بیوی اور بچوں کی ماں تھی۔ اپنے گھر کی عزت تھی۔

نیلو نے اسے پہچان لیا تھا...... وہ اسے کیسے نہیں پہچانتی...... بچپن سے لے کر جوانی تک وہ دونوں جنم جنم کے ساتھی کی طرح رہے تھے۔

نیلو کا دل دھڑک اٹھا تھا...... اس لمحے اس کی آنکھوں میں ہزاروں برقی قمقمے جیسے جل اٹھے تھے...... دوسرے لمحے نہ جانے کہاں سے احساس کی لہر آئی کہ اس کی آنکھوں میں آئی روشنی بجھا دی۔

چند لمحوں کے بعد نیلو نے اسے ساکت نظروں سے دیکھتے ہوئے دل گرفتہ لہجے میں آہستگی سے پوچھا۔

"آپ رہا ہو کر کب آئے......؟"

"تین دن پہلے......" اس نے جواب دیا۔ "صابرہ خالہ نے تمہارا اپتا دیا تھا۔"

اس نے جواب دے کر گہری نظروں سے نیلو کو دیکھا...... ان سات برسوں میں گردش ایام نے اس کا رنگ روپ چھین لیا تھا...... پھر بھی اس کے چہرے پر کسی قدر جاذبیت اور دلکشی موجود تھی۔ اس کے جسم میں ایک گداز پن آ گیا تھا...... لیکن وہ اب سات برسوں پہلے کی نیلو نہیں تھی...... حسن ماند پڑ گیا تھا۔ وقت کتنا بدل گیا ہے...... اس نے سوچا۔

نیلو نے ایک دم سے چونک کر اس سے پوچھا۔

"آپ اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں......؟"

"اپنا ماضی دیکھ رہا ہوں جو حال بن گیا ہے......" اس نے جواب دیا۔ "کیا اندر آنے کو نہیں کہو گی؟"

"تم یہ سمجھ کر اندر آنا کہ یہ میرے ابو کا نہیں بلکہ میرے شوہر کا گھر ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "اور میں اس شخص کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں ہوں۔"

"میں یہی جان اور سوچ کر آیا ہوں۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تمہیں ایک اچھا، نیک اور پیارا سا شوہر ملا ہے...... میں اس سے ملنے آیا ہوں......"

"مگر وسیم......!" اس کی آواز بھرا سی گئی۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تموج اٹھا...... اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میں بڑی بدنصیب اور منحوس ہوں......" آواز اس کے سینے میں دم توڑ گئی۔

"اس دھرتی پر صرف تم ہی ایک دکھی اور بدنصیب عورت نہیں ہو نیلو......؟" اس نے کہا۔ "درد کی کشتی میں جانے کتنے مسافر سوار ہیں...... چلو...... آنسو پونچھ لو...... میں تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھنے نہیں آیا ہوں۔"

پھر نیلو اسے اپنے ساتھ لے کر اس کمرے میں پہنچی جہاں اس کا شوہر ایک چوکی پر بچھے بستر پر معذوروں کی طرح پڑا ہوا تھا۔ نیلو کے بچے بستر پر باپ کے ساتھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، ان کی معصومانہ باتیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

شوکت نے چونک کر اس کی طرف حیرت اور سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔

"میں آپ کی سسرال کے محلے کا ہوں...... آپ کی شادی سے دو برس قبل اپنا یہ دیش چھوڑ کر ذریعہ معاش کے لئے پڑوسی ملک چلا گیا تھا۔ نیلو میری پڑوسن تھی۔ اب میں دو تین دن کے لئے آخری بار آیا ہوں...... اس لئے سوچا کہ آپ سے اور نیلو سے ملتا چلوں۔"

"آپ نے مجھ پر بڑا کرم کیا......" اس نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نفسا نفسی کا دور ہے...... ہر شخص خود غرض اور مطلب پرست ہے اس مصیبت کی گھڑی میں کون کسی کو پوچھتا ہے۔"

"کرم تو اوپر والا کرتا ہے۔" اس نے کہا۔ "اللہ نے چاہا تو مصیبت کی گھڑی بھی جلد ٹل جائے گی۔"

پھر وہ بڑی دیر تک بیٹھا نیلو اور اس کے شوہر سے باتیں کرتا رہا تھا...... نیلو چائے بنا کر لائی تھی...... ان تینوں نے ایک ساتھ چائے پی تھی...... چائے پینے کے بعد وہ بچوں سے کھیلتا رہا...... باتیں کرتا رہا...... ان کے لئے وہ کھلونے بسکٹ اور ٹافیاں بھی لے کر آیا تھا۔ اس کے پیارے پیارے بچوں نے اس کا دل موہ لیا تھا۔ وہ نیلو کا ہو بہو عکس تھے...... نیلو نے اسے بتایا تھا کہ اسے اسپتال والے بارہ سو روپے ماہانہ دیتے ہیں۔ چھ سو ٹاکا تو شوکت کی دواؤں پر خرچ ہو جاتے ہیں...... اس کے شوہر کو پوری طرح تندرست ہونے میں ایک برس سے زیادہ عرصہ لگے گا۔

وسیم نے رخصت ہوتے وقت اپنے اٹیچی کیس سے ایک چھوٹا سا بریف کیس نکال کر شوکت کی طرف بڑھایا۔

"یہ ایک حقیر سا نذرانہ ہے...... آپ کے ٹھیک ہونے اور ملازمت تلاش کرنے تک نیلو کو کسی ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں......"

شوکت نے بریف کیس لے کر اسے کھولا تو لمحے بھر کے لئے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں...... اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔ دوسرے لمحے دھند چھٹی تو شوکت نے وسیم کی طرف دیکھا۔

"یہ تو لاکھوں کی رقم ہے...... اتنی بڑی رقم کس لئے بھیا......؟" وہ بھونچکا سا ہو کر بولا۔

شوکت کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ نیلو...... شوکت کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر دیکھنے لگی۔

"یہ چھ لاکھ ٹاکا ہیں......" اس نے جلدی سے کہا کہ کہیں نیلو مشکوک نہ ہو جائے۔ "میں نے اپنا مکان صابرہ خالہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ چوں کہ میں بنگلہ دیش سے باہر اتنی بڑی رقم لے جا نہیں سکتا...... اس لئے سوچا کہ آپ کو دے دوں۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے...... نہ ماں باپ اور نہ بہن بھائی...... جو رشتہ دار ہیں اس لئے مجھ سے ملتے نہیں اور کتراتے ہیں کہ میرے پاس دولت نہیں ہے۔ دولت ہوتی تو میرے تمام عیب چھپ جاتے...... نیلو کے ناطے آپ کا مجھ پر کچھ حق بنتا ہے کہ اس مشکل گھڑی میں آپ کے کام آؤں...... نیلو میرے محلے کی ہے...... محلے کے لوگ، اڑوس پڑوس ایک خاندان کے فرد کی طرح ہوتے ہیں...... ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں...... خدارا آپ انکار نہ کیجئے...... ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔"

چھ لاکھ ٹاکا......!" نیلو پر جیسے لمحہ بھر کے لئے سکتہ سا چھا گیا۔ "یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ ان کے بھائیوں نے کبھی چھ سو ٹاکا تو کیا چھ روپے بھی نہیں دیئے۔"

"ایک طرح سے یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ دونوں ان کے کسی بھی احسان کے زیر بار نہیں ہوئے۔" اس نے کہا۔

"نیلو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے بریف کیس اپنے شوہر کے پاس رکھ دیا۔

"اچھا...... اجازت دیجئے...... اب میں چلتا ہوں۔" وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے بڑی گرم جوشی سے شوکت سے ہاتھ ملایا۔

"آپ مجھے دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔"

شوکت اس کے جذبہ خلوص سے بہت متاثر ہوا۔ وہ بھی رو رہا تھا...... اسے یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔

اس نے نیلو کے بچوں کو خوب پیار کیا...... کچھ دیر بعد نیلو اسے دروازے تک رخصت کرنے کے لئے

کمرے سے نکلی...... صحن میں پہنچ کر اس سے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی تو وہ اسے تسلی دے کر چلا آیا۔

نیلو کی مدد کر کے اس کے دل کو جو طمانیت اور مسرت ملی تھی اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں پائی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس کے پاس اور دولت ہوتی تو وہ بھی نیلو کو دے دیتا...... اس نے نیلو سے شادی کرنے اور اس کو سکھ سے رکھنے کے لئے تو قتل کیا تھا...... عاصم نے اسے سات لاکھ کی رقم کا لالچ دے کر قتل کرایا تھا۔ اسے سات لاکھ کی رقم کیا ملتی سات برس کی قید بامشقت ہوگئی...... اور نیلو کسی اور کی ہوگئی تھی۔ ایک لاکھ کی رقم اس نے اس لئے اپنے پاس رکھ لی تھی کہ اسے عاصم کو تلاش کرنا تھا۔ عاصم کو تلاش کرنے میں سات دن بھی لگ سکتے تھے اور سات مہینے بھی......

اسے شوکت سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی......

وہ نہ صرف بہت خوب صورت اور وجیہہ بلکہ سیدھا سادا شخص بھی تھا۔ مزاج میں بھی بڑی نرمی تھی...... وہ ہر لحاظ سے ایک اچھا شوہر تھا۔ اسے نیلو کے گھر کا سکھ اور خوشیاں عزیز تھیں۔ وہ اسے دکھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا...... اور وہ اس خیال سے مسرور ہو رہا تھا کہ اب نیلو کو کہیں ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ شوکت کا علاج اب کسی اچھے اسپتال میں ہوگا۔ وہ جلد ہی چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا اس کے بچے بھی آسودہ زندگی گزاریں گے۔

☆......☆......☆

عاصم کی تلاش میں اسے کئی شہروں کی خاک چھاننا پڑی تھی۔ وہ کومیلا...... چاند پور...... لکشام، باری سال اور کھلنا بھی گیا تھا۔ اسے کھلنا میں اتفاق سے ایک ایسا شخص مل گیا تھا جو عاصم کو بہت قریب سے جانتا تھا۔ اس نے ایک برس قبل عاصم کو چٹا گانگ میں دیکھا تھا۔ اسے عاصم ایک بازار میں خریداری کرتا نظر آیا تھا۔

وسیم چٹا گانگ جا رہا تھا۔ اس کے دل میں چٹا گانگ دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ جب وہ سترہ برس کا تھا اپنے والد کے ساتھ اس شہر میں گیا تھا۔ اس نے نا صرف کاکس بازار بلکہ رنگا ماٹی کی بھی سیر کی تھی۔ وہاں ہر برس میلہ لگتا تھا...... اس نے کئی برسوں کے بعد نیلو سے شادی کرنے کے بعد رنگا ماٹی میں ہنی مون منانے کا سوچا اور خواب دیکھا تھا...... اسے رنگا ماٹی بہت پسند آیا تھا...... یہ نہ صرف خوب صورت تھا بلکہ پر فضا تھا اور ایک طرح سے وادی بھی تھا...... اس کے بعد وہ دوبارہ وہاں کی سیر کو نہ جا سکا تھا۔ اور پھر نیلو سے شادی اور ہنی مون کے خواب بھی ادھورے رہ گئے تھے...... آج اسے انتقام کی آگ چٹا گانگ لے جا رہی تھی...... اس کا دشمن اس شہر میں تھا۔ وہ اپنے دشمن کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ اسے اس بات کی بہت خوشی ہوئی تھی کہ عاصم کا بالآخر پتا چل گیا تھا...... اب وہ اس کی دسترس سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتا تھا...... اب وہ اسے قتل کئے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔

وہ کوئی تیرہ چودہ برس کے بعد چٹا گانگ شہر پہنچا تھا...... اب یہ شہر پہلے کے مقابلے میں بہت خوب صورت ہو گیا تھا۔ اب کسی بین الاقوامی شہر سے کم نہیں تھا۔ اس نے بہت سارے غیر ملکی سیاحوں کو بھی یہاں دیکھا تھا جو رنگا ماٹی اور کاکس کی سیاحت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ اس شہر کی آب و ہوا اسے بہت پسند آئی تھی۔ لوگ بھی بڑے ملنسار اور خوش اخلاق تھے۔

اس نے چٹا گانگ پہنچ کر مسکہ ہوٹل میں کمرا لے لیا تھا...... اس نے یہاں پہنچنے کے دوسرے ہی دن سے عاصم کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اس شخص نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ عاصم کسی کمپنی میں ایم ڈی کے عہدے پر فائز ہے...... سات روز تک اس شہر کی خاک چھاننے کے بعد ایک روز اس نے عاصم کو ایک شان دار گاڑی میں جاتے ہوئے دیکھ لیا...... اس نے فوراً ہی ایک ٹیکسی اور ڈرائیور کو تاکید کہ وہ غیر محسوس انداز سے اس گاڑی کا تعاقب کرے...... جب اس نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو سو ٹاکا کا نوٹ دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ عاصم اپنے دفتر جا رہا تھا...... اس عمارت میں اور بھی دفاتر تھے۔ لیکن عاصم کی کمپنی کا دفتر بڑا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ افراد ملازمت کرتے تھے۔

اس عمارت کے دربان نے اسے بتایا تھا کہ عاصم نیشنل کاسمیٹکس کمپنی میں منیجر ہے اور وہ اس فرم میں پانچ برس سے ملازمت کر رہا ہے...... دربان نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ عاصم بہت مغرور اور خود پسند شخص ہے...... اور پھر اچھے کردار کا مالک بھی نہیں ہے اس لئے لڑکیاں اور عورتیں ملازمت کچھ عرصہ بعد چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔"

دربان کے دل میں عاصم کی طرف سے جو نفرت بھری ہوئی تھی وہ اس کی زبان پر آ گئی تھی...... اس نے عاصم کے بارے میں اور بھی کئی باتیں اگل دی تھیں۔ وسیم خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ یہ انکشافات اس کے لئے نئے نہیں تھے کیوں کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ عاصم کس قسم کا شخص ہے۔ جتنا وہ اسے جانتا تھا کوئی اور نہیں جانتا تھا۔

اگر وہ چاہتا تو اس وقت عاصم کے دفتر میں گھس کر اسے بڑی آسانی سے قتل کر سکتا تھا۔ اور اسے خون میں نہلانا مشکل نہ تھا۔ اس کی جیب میں بھرا ہوا پستول موجود تھا...... اس پستول میں چھ گولیاں تھیں جب کہ عاصم کے لئے صرف ایک ہی گولی کافی تھی۔

مگر وہ عاصم کو قتل کرنے میں عجلت سے کام لینا نہیں چاہتا تھا...... اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی وجہ سے عاصم بچ جائے یا پھر خطرے کی بو سونگھ کر فرار ہو جائے...... وہ عاصم کو اس طرح اور ایسی جگہ گھیر کر قتل کرنا چاہتا تھا جہاں اس کے فرار کی ہر راہ مسدود ہو۔ گو کہ عاصم کو دفتر یا باہر قتل کرنا آسان تھا لیکن اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ صرف شدید زخمی ہو جائے اور بروقت طبی امداد سے بچ جائے۔ تب اس کی حسرت دل میں رہ جائے گی۔

عاصم کو قتل کرنے کے لئے منصوبہ بنانا تھا...... عاصم کو قتل کرنے سے پہلے اسے کچھ مہلت دینا چاہتا تھا تاکہ اس سے کچھ باتیں کر سکے۔ پھر اس نے دربان سے دفتر کی چھٹی کا وقت دریافت کیا اور وہاں سے چلا آیا۔

پھر وہ وہاں سے بازار کی طرف بڑھ گیا۔ جو اس کے ہوٹل کے قریب ہی تھا۔ اسے وہاں سے کچھ چیزیں خریدنی تھیں۔ کوئی دس منٹ اس نے خریداری میں وقت صرف کیا۔ پھر وہ اپنے ہوٹل آ کر اپنے منصوبے پر غور کرنے لگا۔

وہ شام کے وقت دفتر کی چھٹی سے تھوڑی دیر پہلے اس عمارت کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے حلیے میں ایسی تبدیلی کر لی تھی کہ عاصم اسے پہچان نہ سکے...... وہ جانتا تھا کہ عاصم اس کی رہائی سے بے خبر ہوگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ جیل سے رہا ہو چکا ہے۔ وہ کوئی بڑا یا سیاسی آدمی نہیں تھا جس کی رہائی کی خبر اخبار میں تصویر کے ساتھ شائع ہو...... اس جیسے مجرم روز دو ایک دو ایک اپنی سزا بھگت کر رہا ہوتے تھے۔ وہ بڑے سکون اور اطمینان سے زندگی گزار رہا تھا کہ کبھی وسیم یہاں اس سے انتقام لینے آ بھی سکتا ہے۔ اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ فرشتہ اجل اس سے انتقام لینے آ پہنچا ہے۔

ٹھیک پانچ بجے اس بلڈنگ سے جتنے دفاتر تھے ان کی چھٹی ہوئی تو لڑکے، مرد، نوجوان لڑکیاں اور عورتیں باہر آ رہی تھیں، وہ پارکنگ لاٹ کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے عاصم کو دیکھا...... عاصم اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک حسین و جمیل پرکشش عورت تھی۔ جو عاصم کے ساتھ بڑی لگاوٹ سے باتیں کرتی ہوئی اس کی گاڑی کی طرف جا رہی تھی...... اس عورت کے انداز اور حرکات و سکنات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ عاصم کی محبوبہ ہے وہ اس عورت کے حسن اور دل کش سراپا کو سراہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

دربان نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ عاصم جس عورت اور لڑکی کو بستر کی زینت بنانا چاہتا تھا وہ اسے ہراساں کر کے فائدہ اٹھاتا تھا...... جو اس کی بات سے انکار کر دیتی تھی اسے چھٹی دے دیتا تھا، ویسے وہ شادی شدہ عورتوں کا زیادہ رسیا تھا...... وہ شادی شدہ عورت ہی لگ رہی تھی۔

جبھی وہ جوان لڑکیاں اس کے سامنے سے باتیں کرتی ہوئی گزریں۔ ان میں سے ایک لڑکی اپنی وضع قطع سے ہندو دکھائی دیتی تھی جب کہ دوسری عیسائی تھی۔ اس نے اسکرٹ پہن رکھی تھی...... عیسائی لڑکی...... ہندو لڑکی کے مقابلے میں زیادہ پرکشش تھی۔

عیسائی لڑکی نے اپنی ساتھی ہندو لڑکی کو مخاطب کرکے کہا۔

"شانتی......! اس حرافہ نے عاصم کو پھانس کر ہی دم لیا......"

"یہ کوئی بات تو نہیں ہے......" ساڑھی والی لڑکی نے کہا۔ "اس میں حیرت کی کیا بات ہے بھلا...... ارے منیجر صاحب بڑے رنگین مزاج واقع ہوئے ہیں...... دفتر کی کتنی ہی غیر شادی شدہ لڑکیوں...... شادی شدہ اور بچوں والی عورتوں کے ساتھ محبت کا کھیل...... کھیل چکے ہیں۔ بلکہ کھیلتے ہی رہتے ہیں۔"

ان دونوں کی باتیں سن کر وہ ان کے پیچھے پیچھے غیر محسوس انداز سے چل پڑا۔ اسکرٹ والی لڑکی نے کہا۔

"اگر یہ کمینی بیچ میں نہ پڑتی تو میں نے عاصم صاحب کو پھانس لیا ہوتا۔" پھر اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"وہ نہ صرف پرائیویٹ سیکریٹری ہے بلکہ دو برس پہلے...... چٹاگانگ سروسز کلب کے مقابلہ حسن میں مس چٹاگانگ بھی منتخب ہو چکی ہے...... قیامت کی حسین ہے...... اس لئے عاصم صاحب اس کے جال میں پھنس گئے۔

"تم ایک اسٹینو گرافر ہو لیکن تم بھی کم قیامت کی نہیں ہو......" ساڑی والی بولی۔ "میرا خیال ہے کہ کسی دن شاید منیجر صاحب کو پھر سے تمہارا خیال آجائے...... تم یوں بھی ان کے ساتھ دو دن کے لئے رنگامانی بھی تو جا چکی ہو...... پھر تمہارا سحر کیسے ماند پڑ گیا؟"

"ایسے کہ میں بھی انہیں ہر طرح سے خوش نہیں کر سکی۔" عیسائی لڑکی ہوں۔ "وہ چار دن رکھنے کے لئے کہہ رہا تھا لیکن میں اس کے لئے تیار نہ ہوئی۔"

پھر وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرتی ہوئی ایک چوراہے کے قریب پہنچ کر رک گئیں۔ ساڑی والی لڑکی نے اسے دلاسا دیا۔

"تم مایوس نہ ہو...... اس عورت کا کوئی بھروسا نہیں...... وہ شاید اور اونچا ہاتھ مارنے کے لئے کسی اور اونچے آدمی کو پھانس لے...... ایسی عورتیں کسی تگڑے شکار کی تلاش میں رہتی ہیں...... ان کے خواب دیکھتی ہیں...... چارہ ڈالتی رہتی ہیں...... کچھ دن صبر سے کام لو...... تمہارا نصیب جاگ اٹھے گا...... میں نے اس کے بارے میں سنا ہے کہ اس نے کبھی کسی ایک مرد پر اکتفا نہیں کیا ہے...... وہ ایک زہریلی ناگن ہے جو ڈستی رہتی ہے۔"

ساڑی والی لڑکی...... اس اسکرٹ والی لڑکی سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ بھی اسٹاپ کی طرف تھا۔ جو قدرے فاصلے پر دکھائی دیا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی کہ بس آئے تو چھوٹ نہ جائے۔

کرسچن لڑکی زنانہ ملبوسات کی ایک دکان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ اس دکان کے شوکیس میں لگے ملبوسات کو بڑے غور سے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس کے پاس جا کر لاتعلق سا کھڑا ہو گیا۔ اس لڑکی نے وسیم کی موجودگی کو اس کی طرف گردن گھما کر دیکھا۔

وسیم نے بڑے مہذب اور شائستہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا آپ نیشنل کاسمیٹکس کمپنی میں ملازمت کرتی ہیں۔"

اسکرٹ والی لڑکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی خوب صورت گردن اثبات میں ہلا دی۔

"جی ہاں......! لیکن آپ یہ بات کیسے جانتے ہیں......؟ میں نے کبھی دفتر میں آپ کو نہیں دیکھا۔"

"کچھ دیر پہلے میں نے دفتر کی عمارت سے آپ کو ایک لڑکی کے ساتھ باہر آتے ہوئے دیکھا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ دونوں کی گفتگو سے لگا آپ اس دفتر میں ملازمت کرتی ہیں۔"

"آپ نے صحیح کہا۔" وہ بولی۔ "میں اور میری سہیلی اس دفتر میں سروس کرتی ہیں۔"

"اگر آپ کچھ خیال نہ کریں تو میں آپ کا کچھ قیمتی وقت لینا چاہتا ہوں۔" اس نے چند قدم پر جو ریسٹورنٹ تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا خیال ہے۔ اس ریسٹورنٹ میں کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کر لی جائیں۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ آپ سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

وسیم نے جس ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کیا وہ اس شہر کا سب سے بہترین اور اعلیٰ درجے کا ریسٹورنٹ تھا۔ اس علاقے میں بڑی بڑی فرموں کے دفاتر تھے۔ اس ریسٹورنٹ میں ایک عام آدمی قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا...... وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔ اسے کسی مرغے کی ضرورت تھی تا کہ آج کی شام پرلطف اور اچھی گزرے۔

"چلئے......" وہ خوش دلی سے بولی۔ "میرے پاس وقت تو ہے لیکن بہت زیادہ وقت نہ دے سکوں گی۔"

وہ اس لڑکی کے ساتھ ریسٹورنٹ میں اندر داخل ہوا۔ وسیع و عریض ہال کا ماحول بڑا خواب ناک تھا۔ ایک بے حد جوان اور خوبصورت عورت جو منی اسکرٹ میں ملبوس تھی...... انہیں لے کر ایک گوشے میں پہنچی۔ وہاں ایک میز خالی تھی۔

اس لڑکی نے اپنے لئے اسپیشل کلب سینڈوچز اور کریم کافی کا آرڈر دیا۔ اس نے اپنے لئے بھی یہی منگوایا۔ جب ویٹریس چلی گئی تو اس نے سوچا کہ اب تعارف ہو جانا چاہئے۔ پھر اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"میرا نام وسیم احمد ہے۔ میں ڈھاکا سے تیرہ چودہ برس کے بعد رنگامانی اور کاکس بازار کی سیاحت کے لئے آیا ہوں۔"

"میرا نام مس جولی ہے۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔ "میں اس فرم میں اسٹینو گرافر ہوں۔ پہاڑتلی میں رہتی ہوں۔"

جولی نے تعارفی رسم ادا کرنے کے بعد اس سے مصافحہ کرنے کے لئے اپنا مرمریں، خوب صورت اور سڈول ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ہاتھ کے لمس نے اس کے سارے بدن میں سنسنی دوڑا دی تھی۔ وہ ڈھاکا سے عاصم کی تلاش میں نکلا تو اس کے پاس ایک لاکھ کی رقم تھی۔ وہ ہر شہر کے اعلیٰ ہوٹلوں میں ٹھہرا تھا...... عیاشی کے لئے لڑکیوں اور جواں سال عورتوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ مگر اس نے کبھی کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ کیوں کہ اسے عورت کی نہیں عاصم کی ضرورت تھی۔ مگر اس لڑکی کے ہاتھ کے لمس نے اس کے اندر سویا ہوا مرد ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھا۔ جولی کس قسم کی لڑکی تھی۔ یہ اس نے جولی اور ہندو لڑکی کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اندازہ کر لیا تھا...... وہ انجانی راہوں پر چلنے والی اور جیب سے مشروط ہونے والی لڑکی تھی۔

تاہم اس نے خود پر قابو پا کر محسوس انداز سے عاصم کے بارے میں پوچھنا شروع کیا تو وہ جیسے عاصم کے خلاف بھری بیٹھی تھی۔ اس نے عاصم کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ وہ جلتی پر تیل گراتا رہا تھا۔

وسیم نے دن ڈوبنے کے بعد ایک ٹیکسی کی اور جولی کو اس کے گھر ڈراپ کر کے ہوٹل پہنچا۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے بستر پر دراز ہو گیا...... اس کے دل و دماغ پر عاصم چھایا ہوا تھا...... وہ عاصم کے بارے میں سوچنے لگا...... جولی نے اسے بتایا تھا کہ عاصم کی بیوی فرخندہ ایک خوب صورت اور پیاری سی عورت ہے...... ایک مثالی اور شوہر پرست عورت ہے...... آج کے دور میں ایسی عورت دکھائی نہیں دیتی ہے۔ اس کے باوجود عاصم کی کمزوری حسین اور نوجوان لڑکیاں ہیں۔ وہ رنگین تتلیوں کا دیوانہ ہے۔ آج کل اپنی پرائیویٹ سیکریٹری چمپا کے ساتھ خوب رنگ رنگلیاں منا رہا ہے۔ چمپا نے اسے جس طرح اپنی مٹھی میں کیا ہوا ہے اس سے اس بات کا امکان ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے تا کہ اس سے شادی کر لے...... قرائن و حالات بھی بتا رہے ہیں کہ اس کی تین برس کی بیٹی ہے...... اسے اپنی پیاری بیوی اور بیٹی کی بھی کوئی فکر نہیں ہے۔ بڑا ظالم اور

صوردں کس ہے۔

فرخندہ غریب اس طوفان سے بے خبر ہے۔ جو اس کی زندگی میں کسی وقت آ کر اس کے لئے بسے بسائے گھر کو تباہ کرنے والا ہے...... گو کہ چمپا بے حد حسین ہے لیکن فرخندہ تو اس سے بھی کہیں حسین ہے...... ایک بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ چمپا پر کیوں مرمٹا ہے...... تندہ پورہ جو عالی شان مکان ہے وہ عاصم کا اپنا نہیں ہے بلکہ فرخندہ کا ہے۔

وہ دوسرے دن صبح دس بجے تندہ پورہ جا کر عاصم کا مکان دیکھ آیا جو اس علاقے کی خوب صورت اور شان دار مکانوں میں سے ایک تھا۔ پھر وہ وہاں سے بپانی بتن مارکیٹ آ گیا تا کہ کچھ چیزوں کی خریداری کر سکے۔ وہ ایک دکان کی طرف بڑھ رہا تھا اسے سامنے سے جولی آتی دکھائی دی۔ اسے یہاں اس وقت دیکھ کر تعجب ہوا اور خوشی بھی ہوئی...... جولی اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔ وہ اسے اس مارکیٹ کی دوسری منزل پر بنے ہوئے ریسٹورنٹ میں لے آیا۔ جولی نے اسے کل بتایا تھا کہ عمدہ اور اعلیٰ ریسٹورنٹ اس کی کمزوری ہیں۔

"اس وقت تم یہاں کیا شاپنگ کر رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔ "کیا آج تم نے دفتر سے چھٹی لی ہوئی ہے؟"

"میں یہاں انشورنس کمپنی میں مسٹر اینڈ مسز عاصم کے لائف انشورنس کا پریمیئم جمع کرانے آئی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "اس کے علاوہ کوچز کے ٹکٹ کی بکنگ کرانے بھی آئی تھی...... عاصم صاحب اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ پندرہ دن کے لئے کاکس بازار جا رہے ہیں۔"

"لائف انشورنس......؟" وہ جولی کی بات سن کر بڑے زور سے چونکا۔ "اس نے اپنا اور اپنی بیوی کا کتنا انشورنس کرایا ہوا ہے؟"

"سات لاکھ ٹاکا کا......" جولی نے جواب دیا۔ "یہ پالیسی کوئی سات ماہ پہلے لی ہوئی ہے۔"

"اچھا......" اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ وہ تہہ میں پہنچ گیا تھا...... عاصم اپنی دوسری بیوی کے ساتھ بھی وہی کھیل کھیل رہا تھا۔ ایک گھاگ شکاری اپنا جال بچھا رہا تھا۔

اس نے چند لمحوں تک کچھ سوچا اور پھر موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"اتنا تو میں جانتا ہوں کہ کاکس بازار دنیا کا سب سے بڑا ساحل سمندر ہے...... اتفاق سے مجھے وہاں ابھی تک جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن کاکس بازار اتنا خوب صورت مقام ہے کہ وہ وہاں پندرہ دن قیام کرے گا؟"

"کاکس بازار نہ صرف پرفضا مقام ہے بلکہ بہت ہی خوب صورت ساحل سمندر بھی ہے۔ وہاں جانے کے بعد واپس آنے کو دل نہیں چاہتا ہے۔" جولی نے کہا۔ "میں ایک دو مرتبہ وہاں اپنے گھر والوں کے ساتھ جا چکی ہوں۔ پھر جانے کی بڑی خواہش ہے۔ اگر آپ جانا چاہیں تو میں آپ کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں...... لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کو میرے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے۔"

وسیم کے سارے بدن میں ایک ہیجانی سنسنی دوڑ گئی۔ چشم تصور میں ان جانے مناظر گھومنے لگے۔ پھر اس نے کہا۔

"تمہاری شرط منظور ہے...... لیکن ابھی نہیں...... جب موقع ہوگا بتا دوں گا۔"

"ابھی کیوں نہیں......؟" جولی نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ "آج کل وہاں بہت ہی خوش گوار موسم ہے۔"

اسے سمجھتے دیر نہیں لگی کہ جولی وہاں گھر والوں کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے شکاروں کے ساتھ جا چکی ہے۔ تاہم اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

"اس لئے کہ تمہارا باس مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر تمہارے بارے میں کیا سوچے...... جب وہ اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ واپس آ جائے گا پھر ہم چلیں گے...... کیوں کیا خیال ہے...... اس طرح تمہارے باس کی نظروں میں نہیں آئیں گے۔ پھر سکون واطمینان سے کسی ہوٹل میں دو ایک دن نہیں بلکہ پورے سات دن رہیں گے...... پھر ہم وہاں ہر قسم کی آزادی ہی آزادی ہوگی...... ہم ہنی مون منائیں گے۔"

جولی سرخ ہو گئی۔ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح...... اس نے جولی سے جو کچھ کہا وہ سن کر خوش ہو گئی۔ کوئی آبرو والی لڑکی ہوتی تو اسے یہ بات پسند نہ آتی۔ وہ اٹھ کر چلی جاتی...... جولی کا اصل چہرہ بے نقاب ہو گیا تھا۔

پھر اس نے جولی کے ساتھ شام کے وقت ایک پارک میں ملنے کا پروگرام بنایا۔ شام سات بجے جولی آئی تو اپنے جلو میں حشر سامانیاں لے کر آئی...... اس کی حسین اور بڑی بڑی آنکھوں میں انجانا پیغام تھے اور ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ جو دل پر بجلی گرا رہی تھی۔ جس لباس میں تھی وہ مردوں کو متوجہ کرنے والا تھا۔ بے نیام تلوار سی لگ رہی تھی۔

وہ جولی کو اپنے ساتھ لے کر جونا ریسٹورنٹ پہنچا۔ کیوں کہ جولی کی خواہش تھی کہ وہی ڈنر کیا جائے...... یہاں کے کھانے نہ صرف اس شہر میں بلکہ پورے بنگلہ دیش میں مشہور ہیں...... ایسے مزے دار اور لذیذ کھانے کسی ہوٹل میں نہیں ہوتے تھے۔ دور دراز سے لوگ یہاں کھانا کھانے آتے تھے۔

وہ اس ہوٹل کے سبزہ زار میں ایک پرسکون گوشے میں بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے عاصم کو دیکھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہ اپنی پرائیویٹ سیکریٹری محبوبہ دل نواز...... اور ایک شخص کے ساتھ تھا۔ وہ چمپا اور اس شخص کو لے کر ایک ایسی میز پر جا بیٹھا جو اس کی اور دوسری میزوں سے قدرے دور تھی۔ ان تینوں میں سے کسی نے ان کی طرف دیکھا نہیں۔ ہر میز پر ایک موم بتی روشن تھی۔ مدھم سی روشنی تھی۔ اس روشنی میں دور بیٹھے لوگوں کے خدوخال واضح نہیں ہوتے تھے...... اسے اس بات کا خطرہ نہیں تھا کہ عاصم اسے اتنے فاصلے سے پہچان لے گا۔ یوں بھی عاصم کی پشت اس کی جانب تھی۔

جولی نے ان تینوں سے نگاہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"آپ نے اس شخص کو پہچانا......؟"

"نہیں تو......" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں تمہارے سوا کسی کو بھی نہیں جانتا...... تم اس شخص کو دیکھ کر خوف زدہ اور ہراساں کیوں ہو رہی ہو......؟ یہ شخص ضرور عاصم کا دوست ہوگا......"

"اس شخص کا نام جانو ہے......" جولی سرگوشی میں کہنے لگی۔ "یہ شخص یہاں کا خطرناک ترین بدمعاش مانا جاتا ہے...... اس سے نہ صرف شہر کے بڑے بڑے جرائم پیشہ کانپتے ہیں بلکہ پولیس بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کانپتی ہے...... کیوں کہ اس کی پشت پر ایک بہت بڑا خفیہ ہاتھ ہے...... لیکن اس شخص کا عاصم سے کیا کام ہو سکتا ہے...... حیرت کی بات یہ ہے کہ چمپا بھی ساتھ ہے...... کیوں اور کس لئے......؟"

"ان باتوں کو تم نہیں سمجھو گی......" وسیم نے اپنے شانے اچکاتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ "کاش......! اس وقت میرے پاس کیمرہ ہوتا۔"

"کیا آپ عاصم کے ساتھ اس شخص کی تصویر اتارنا چاہتے تھے......؟" جولی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"اس شخص کے ساتھ نہیں بلکہ چمپا کے ساتھ......" اس نے کہا۔ "میں ان تصویروں کی مدد سے ان کے تعلقات ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا آپ بلیک میل کریں گے عاصم صاحب کو......؟" جولی مسکرا دی۔ "پھر اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

"حاصل کیوں نہیں ہوگا......؟" وسیم نے سوالیہ نظروں سے جولی کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اس لئے کہ عاصم صاحب کی بیوی اپنے شوہر کو حد سے زیادہ چاہتی ہے...... وہ یہ تصویریں پھاڑ کر پھینک دے گی۔" جولی مسکرائی۔

"نہیں...... بلیک میل کرنے کے لئے......" وہ بھی جواباً مسکرا دیا۔ "اس لئے کہ میرے ذہن میں ایک اور تدبیر ہے...... میں کچھ اور بھی سوچ رہا ہوں...... میں ان دونوں کی اکٹھے تصویر بنانا چاہتا ہوں۔"

"اگر ایسی بات ہے تو میں ان دونوں کی تصویریں فراہم کر سکتی ہوں۔" جولی کہنے لگی۔ "میرے پاس ان دونوں کی دس بارہ تصویریں موجود ہیں...... رومانی اور جذباتی مناظر...... تصویریں ساحل سمندر پر اتاری گئی ہیں...... اگر آپ ان تصویروں سے کام لینا چاہتے ہیں تو میں آج رات ہی ہوٹل میں تصویریں لا کر دے دوں گی۔"

"نہیں...... تمہیں تکلیف ہوگی۔" وہ جلدی سے بول اٹھا۔ "کیوں نہ یہاں سے اٹھ کر تمہارے گھر جا کر تصویریں لے لوں۔"

"میرے گھر والے رات کے وقت آپ کو دیکھ کر کچھ خیال کریں۔" وہ بولی۔ "میں خود تصویریں پہنچا دوں گی۔"

"وہ رات نو بجے وہاں سے پرتکلف ڈنر کر کے اٹھے تھے۔ واقعی اس ریسٹورنٹ کے کھانے بہت مزے دار تھے۔ اسے بہت پسند آئے تھے...... پھر جولی نے عاصم کی طرف دیکھا...... اس میز پر ان تینوں کی میٹنگ ابھی تک جاری تھی۔ وہ سر جوڑے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

جولی ہوٹل سے باہر آ کر ایک ٹیکسی میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ وسیم بھی اپنے ہوٹل میں آ گیا۔

رات گیارہ بجے جولی تصویریں لے کر اس کے ہوٹل پہنچ گئی۔

تصویریں تو ایک بہانہ تھیں...... وسیم...... جولی کا تمنائی نہیں تھا...... حالاں کہ وہ غیر معمولی پرکشش تھی...... شعلہ مجسم جس کے انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی...... اس میں ایک پکے پھل جیسا رسیلا پن تھا...... کون ایسا تھا جو اسے دیکھتا تو خواہش نہیں کرتا تھا کہ یہ پکا پھل اس کی جھولی میں آ گرے...... اب اسے دنیا تو کیا عورت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی...... اس کا دل ان دونوں سے اچاٹ ہو چکا تھا...... اس کے کہنے کے باوجود وہ واپس نہیں گئی...... صبح تک ٹھہری رہی...... اسے کفران نعمت نہیں ہو سکا۔

جونا ہوٹل کے سبزہ زار پر جب اس نے چمپا اور عاصم کو ایک بدمعاش کے ساتھ دیکھا تھا تو اس نے سوچا تھا کہ کیوں نہ وہ ان تینوں کو موت کی نیند سلا دے...... خس کم جہاں پاک...... اس کا جیب میں بھرا ہوا پستول موجود تھا...... ان تینوں کو قتل کر کے وہ اس دنیا اور انسانیت کو غلاظت سے محفوظ کر سکتا تھا۔ ان کی موت پر کسی کو افسوس نہ ہوتا...... بلکہ خوش ہوتے...... کہتے ہیں خس کم جہاں پاک اور اسے پھانسی چڑھتے وقت اسے غم کے بجائے بے پناہ خوشی ہوتی کہ وہ دنیا سے ایک نیک کام کر کے جا رہا ہے۔

لیکن اس دنیا میں ایک ہستی ایسی بھی تھی جو عاصم کا قتل پسند نہیں کرتی...... وہ عاصم کی بیوی فرخندہ تھی۔ فرخندہ کبھی اسے معاف نہیں کرتی...... ساری زندگی اسے کوستی...... روتی اور بددعائیں دیتی...... اس لئے وہ چاہتا تھا کہ عاصم کو فرخندہ کے سامنے قتل کرے تاکہ فرخندہ اسے معاف کر دے...... لیکن کیا ایسا ممکن ہوگا......؟ جولی نے اسے بتایا تھا کہ فرخندہ ایک شوہر پرست عورت ہے۔

وسیم دوسرے دن بھیس بدل کر عاصم کے دفتر کی عمارت کے باہر کھڑا رہا...... پانچ بجے چھٹی ہوئی تو جولی اس ہندو لڑکی کے ساتھ باہر آئی جو اس کی گہری سہیلی تھی۔ وہ اس کے ہوٹل سے سیدھا دفتر آ گئی تھی۔ وہ اس کے قریب سے گزری تھی اور ان کی نگاہیں چار بھی ہوئی تھیں۔ جولی اسے پہچان نہ سکی تھی۔ اس لئے کہ اس نے کنٹیکٹ لینس پہنا ہوا تھا۔ وہ اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی کہ...... "شانتی! چل کر کسی ریسٹورنٹ میں اسٹرانگ کافی پیتے ہیں۔" "رات بھر کی کہانی تجھے سناتی ہوں۔ بڑے زور کی نیند بھی آ رہی ہے اور جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔"

اب وہ جولی کے ساتھ وقت گزارنا نہیں چاہتا تھا...... اس لئے اس نے ہوٹل بدل لیا تھا کہ کہیں جولی نہ آ جائے۔ اس نے جس ہوٹل میں کمرا لیا وہ فرضی نام سے...... کیوں کہ جولی بہت تیز اور ہوشیار تھی۔ وہ اس کا پتا چلا لیتی۔ اس نے جولی کے رخصت ہوتے وقت ایک ہزار کی رقم دی تھی۔ وہ رقم کے لالچ میں پھر آ سکتی تھی۔

جب عاصم اور چمپا کافی دیر تک دفتر سے باہر نہ آئے تو دربان سے پوچھا...... دربان نے بتایا کہ وہ دونوں آج دفتر نہیں آئے۔

وسیم تیسرے دن صبح دس بجے سے آدھا گھنٹہ پہلے بس ٹرمینل پر پہنچ گیا...... جولی نے اسے بتایا تھا کہ عاصم آٹھ بجے کی کوچ سے اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ کاکس بازار جا رہا ہے۔ اس نے اپنے لئے کاکس بازار میں جو ہٹ بک کروائی ہے اس کا نمبر ایک سو پانچ ہے۔ جو نہ صرف پوری طرح آراستہ و پیراستہ بلکہ مہنگا ترین بھی تھا۔

وہ کاکس بازار جانے کے لئے جس کوچ میں سوار ہوا تھا اس کی روانگی دس بجے تھی۔ عاصم اس سے دو گھنٹے پہلے روانہ ہوا تھا۔ لیکن اسے کوئی ایسی جلدی نہیں تھی۔ وہ دو دن کے بعد بھی جاتا تو اس کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ شکار اس کے جال میں خود ہی آ گیا تھا۔ اب اسے شکار گھیرنے کے لئے کچھ نہ کرنا پڑا تھا۔

اس کی اگلی سیٹ پر ایک نوبیاہتا جوڑا ہنی مون منانے جا رہا تھا...... دلہن کی عمر بمشکل سترہ برس کی ہوگی۔ بہت حسین تھی۔ بڑی موہنی تھی۔ اس کے چہرے پر حیا اور ان جانے جذبوں کی سرخی تھی۔ جس نے اس کے حسن کو نکھار دیا تھا۔ وہ بہت بھولی اور معصوم سی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم رقصاں تھا۔

دلہا کی عمر پچیس برس کی ہوگی۔ وہ بہت وجیہہ تھا۔ یہ جوڑا بہت اچھا اور پیارا تھا...... جب بس نے خاصی مسافت طے کر لی تو وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ لیکن وہ ان کے

جملے صاف سن رہا تھا۔

دلہن نے اس لڑکے سے جو اس کا شوہر تھا رسیلی آواز میں پوچھا تھا۔

"تم نے کتنے دنوں کے لئے ہوٹل میں کمرا لیا ہے......؟ بتایا نہیں......"

"صرف سات دن کے لئے......" لڑکے نے جواب دیا۔ "میں نے جس ہوٹل میں کمرا بک کرایا ہے اس کا نام چاندنی ہے۔"

"چاندنی......؟" لڑکی چونک کر بولی۔ "لیکن وہ بہت سستا اور عام قسم کا ہوٹل ہے...... جب ایک برس پہلے کالج کی لڑکیاں یہاں سیر اور تفریح کے لئے آئی تھیں تو ہم وہاں ٹھہری تھیں۔ ہم تین دن کے لئے آئی تھیں۔ لیکن ہم دوسرے دن ہی دوسرے ہوٹل میں چلی گئی تھیں۔"

"وہ کس لئے......؟" لڑکے نے حیرت سے سوال کیا۔ "اس میں کیا خرابی تھی......" اس کا لہجہ شوخ ہوگیا...... "کیا اس میں بھوت بھوتنی ہنی مون منانے آئے تھے......؟ جو تم لڑکیاں وہاں سے خوف زدہ ہوکر بھاگ گئیں......؟"

"نہیں...... یہ بات نہیں تھی۔" دلہن بے اختیار ہنس پڑی تھی...... اس کی ہنسی بھی اس کی طرح دل کش تھی۔ "معلوم نہیں کیوں اس ہوٹل کا نام چاندنی ہے...... اس کا نام تو گندگی ہونا چاہئے۔ کیوں کہ اس کے کمرے نہ تو صاف ستھرے اور نہ ہی بستر...... یہی حال اس کے غسل خانوں اور فرنیچر کا تھا...... اس کے علاوہ کھانے بھی اچھے نہ تھے...... کیا تمہیں کسی نے یہ باتیں نہیں بتائیں......؟"

"نہیں......" لڑکے نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا تو پھر میں تمہیں رنگا ماٹی لے جاتا۔ لیکن وہاں بھی ہوٹل بہت مہنگے ہیں۔"

"میرا مشورہ یہ ہے کہ ہم وہاں کسی موٹل میں کمرا کرائے پر لے لیتے ہیں۔" دلہن بولی۔ "موٹل میں سنا ہے ہوٹل سے سستا پڑتا ہے۔"

"ہاں......" لڑکے نے سر ہلا دیا۔ "اس وقت جب سیزن نہ ہو...... یہ سیزن کا وقت ہے...... ہٹس، کاٹیج، ہوٹلوں اور موٹلوں کے تمام کمرے پندرہ پندرہ...... بیس بیس دنوں کے لئے بک ہوجاتے ہیں...... میرے پاس صرف پانچ ہزار ٹاکا ہیں جو میں نے ہنی مون منانے کی غرض سے دفتر سے قرض لیا...... شادی پر بھی میری خاصی رقم خرچ ہوچکی ہے۔ میں مزید رقم کہاں سے لاؤں......؟ کسی اچھے ہوٹل اور موٹل میں کمرا لے کر سات دن بھی ٹھہرتے ہیں تو دس بارہ ہزار ٹاکا بھی کم ہوں گے...... ہم آف سیزن میں شادی کرکے ہنی مون منانے آتے تو نہیں آسکتے تھے۔ کیوں کہ مون سون شروع ہوجاتا ہے۔ سمندر میں بڑی طغیانی ہوتی ہے۔ کنارے کی ریت دلدل بن جاتی ہے۔"

"تم نے شادی سے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ ہنی مون منانے کے لئے تم دفتر سے قرض لوگے......؟" لڑکی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ باتیں بتانے کی تھوڑی ہوتی ہیں۔" لڑکے نے کہا۔ "میں نے اپنی مجبوری بیان کی ہے...... چلو سات دن کی تو بات ہے۔ سات برس تو نہیں...... یہ سات دن پلک جھپکتے گزر جائیں گے۔ کٹ جائیں گے۔"

"تم سات دن کی بات کہہ رہے ہو وہاں سات گھنٹے بھی رہ نہیں پاؤ گے۔" دلہن نے کہا۔ "تم چوں کہ وہاں رہے نہیں ہو جو اس لئے یہ بات کہہ رہے ہو۔"

"اب کیا کریں......؟" لڑکے نے بے بسی سے کہا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے...... کاش! میں نے یہ سب کچھ کسی سے معلوم کرلیا ہوتا۔"

"اب یہی ہوسکتا ہے کہ ہم یہاں شام تک رہ کر واپس چلے جائیں۔" لڑکی پریشان ہوکر بولی۔

"واپس چلے جائیں......؟" لڑکا بھی پریشان ہوکر بولا۔ "تم جانتی ہو کہ واپس جانے کا مطلب کیا ہوگا......؟ لوگ کیا کہیں گے......؟" کیا ہوگا......؟"

لڑکی کے چہرے پر تحیر سا چھا گیا۔ اس نے ساکت پلکوں سے دیکھا۔

"ہمارے واپس جانے سے چہ میگوئیاں ہوں گی......" لڑکا کہنے لگا۔ "میرے اور تمہارے گھر والے بھی حیران اور پریشان ہوں گے...... شاید وہ یہ سمجھیں گے کہ ہم دونوں نے چوں کہ محبت کی شادی ہمارے منع کرنے کے باوجود کی ہے اس لئے کسی بات پر ناچاقی ہوگئی ہے اور ہم واپس آگئے ہیں...... تمہاری سہیلیاں اور میرے دوست معنی خیز باتیں کریں گے...... ہم دونوں کس کس کو اصل بات بتاتے اور سمجھاتے پھریں گے......؟ یہ بھی سوچا تم نے......؟"

"اچھا......" دلہن مسکرادی۔ "میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے جس سے سانپ بھی مرجائے گا لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی......؟"

"وہ کیا......؟" لڑکے نے تجسس بھری نظروں سے اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکا۔

"ہم کہیں گے سیزن کی وجہ سے کمرا نہیں ملا...... ہم نے جس ہوٹل میں کمرا بک کرایا تھا وہ ایک دن کی تاخیر کی وجہ سے کسی اور کو دے دیا گیا۔" دلہن نے کہا۔ "یہ ایسا جواز ہے جسے ہر کوئی سن کر مطمئن ہوجائے گا...... میری سہیلیاں اور تمہارے دوستوں کے پیٹ میں درد اٹھے گا...... وہ ختم ہوجائے گا...... کیوں کیسی ہے یہ تدبیر......؟"

"تدبیر تو بہت اچھی ہے...... اور شان دار ہے...... اس طرح سب کے منہ بند ہوجائیں گے...... کاش! ہم تنہائی میں ہوتے تو میرے ہونٹ تمہارا منہ بند کردیتے...... کتنی مٹھاس ہے......"

"شش......!" لڑکی نے سرخ ہوکر اس کو کہنی ماری...... اسے پیار بھری خفگی سے گھورا۔ "ہم گھر میں نہیں بس میں ہیں۔"

"لیکن گلنار......؟" لڑکے نے تفکر لہجے میں کہا۔

"یہ ارمان...... حسرتیں اور خواب بھی کیا چیز ہیں......" لڑکے نے ایک گہرا سانس لیا۔ "محرومیاں آدمی کو زہریلے سانپ کی طرح ڈستی ہیں...... ہم نے کیا سوچا تھا......؟ کیا کیا خواب دیکھے تھے......؟ کیسی کیسی حسرتیں اور ارمان دل میں تھے...... ہم سات دنوں تک ساحل سمندر پر رہیں گے...... ہوٹل میں کمرا لیں گے...... سمندر میں آزادی سے نہائیں گے...... شرارتیں کریں گے...... چاندنی راتوں کا نظارہ کریں گے...... ایک ایک لمحہ ایک دوسرے کی معیت میں گزاریں گے...... یہ سات دن ہماری زندگی کے یادگار اور ناقابل فراموش ہوں گے...... آگے چل کر جانے کیسے حالات اور مسائل ہوں...... جانے ہم پھر یہاں آسکیں یا نہ آسکیں۔"

"ہاں...... تم ٹھیک کہتے ہو......؟" لڑکی بھی قدرے سنجیدہ اور جذباتی ہوگئی۔ "لڑکی...... مرد کے مقابلے میں ہنی مون منانے کے بارے میں زیادہ سنجیدہ اور جذباتی ہوتی ہے...... پر اب کیا کیا جائے...... مجبوری ہے...... کوئی بات نہیں...... کیا یہی مسرت اور خوشی کی بات نہیں ہے کہ ہماری شادی ہوگئی...... شریک سفر بن گئے...... دو محبت بھرے دل مل گئے...... جو سپنا دیکھا وہ پورا ہوگیا جس کی کوئی امید دور دور تک دکھائی نہیں دیتی تھی...... ورنہ دنیا نے ہماری محبت کی شدی میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی نہیں کیں...... آخر محبت کی جیت ہوئی...... ہم واپس چلتے ہیں شام کے وقت...... تم نے دفتر سے جو رقم قرض لی ہے وہ واپس کردو...... خوابوں کا کیا ہے انور...... یہ بڑے دغا باز اور فریبی ہوتے ہیں......"

پھر ان کے درمیان خاموشی طاری ہوگئی...... دونوں افسردہ...... دل گرفتہ اور غم زدہ ہوگئے تھے...... دلہن کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ باہر جھانک نہیں رہی تھی...... بلکہ اپنے آنسوؤں کو چھپا رہی تھی۔ وہ اپنے آنسو اپنے جیون ساتھی کو دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

وسیم نے دلہن کی خوب صورت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسوؤں کو بھرے ہوئے دیکھا تو اس

کے دل پر چوٹ لگی۔

اس نے ایسے ہی آنسو نیلو کی آنکھوں میں بھی دیکھے تھے...... اسے نیلو یاد آ گئی تھی...... اسے نیلو کے آنسو یاد آ گئے تھے...... ایک نوجوان دلہن رو رہی تھی...... جذباتی ہو رہی تھی...... اس کے آنسوؤں نے ساری فضا...... ساری دنیا کو اداس کر دیا تھا...... لڑکا بھی بہت افسردہ ہو گیا تھا...... وہ آنکھیں بند کر کے جانے کیا سوچنے لگا تھا...... اس کے چہرے پر کرب ابھر آیا تھا۔

اس نے بھی سوچا تھا کہ نیلو سے شادی کرنے کے بعد وہ ہنی مون منانے پہلے رنگا مائی جائے گا...... پھر کاکس بازار جائیں گے...... وہاں کسی ہوٹل میں کمرا لیں گے...... اس کمرے کو حجلہ عروسی کی طرح سجائیں گے...... رجنی گندھا کے پھولوں کی لڑیاں مسہری کے چاروں کناروں پر ہوں گی...... لیکن نیلو کے بدن کی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک ان پھولوں میں کہاں ہوگی...... وہ اس خوشبو کو چرا لے گا...... اس کے ہونٹ ساری رات نیلو کے ہونٹوں کو بولنے نہیں دیں گے...... ان ہونٹوں کی مٹھاس اس کے ہونٹوں میں جذب ہوتی رہے گی...... وہ مٹھاس سے بندھ جائیں گے...... لیکن اس کے خواب ادھورے رہ گئے...... وہ پورے نہ ہو سکے تھے۔

وہ دل کی اداسی دور کرنے کے لئے چمپا اور جانو کو دیکھنے لگا...... وہ دونوں اس کوچ میں اس وقت سوار ہوئے تھے جب کوچ کی روانگی میں دس منٹ باقی تھے...... لیکن وہ دونوں ان کی کوچ میں الگ الگ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے لاتعلق اور بیگانے سے تھے جیسے ایک دوسرے کو جانتے نہیں...... پہچانتے نہیں...... وہ غیر محسوس انداز سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتے تھے۔

عاصم کا سارا کھیل اس کو سمجھ میں آیا تھا۔ دو ایک دن کے بعد عاصم کی بیوی سمندر کی لہروں کی آغوش میں موت کی نیند سونے والی تھی۔ پولیس کو ذرہ بھر بھی شک و شبہ نہیں ہوتا کہ یہ قتل تھا۔ وہ اسے حادثاتی موت قرار دیتی...... اسے موت کی نیند سلانے کے لئے خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ عاصم نے اپنی بیوی کی موت کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ اس طرح کا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے......

تین گھنٹے کی مسافت کے بعد کاکس بازار آ گیا۔ جب وہ کوچ سے اترا تھا وہ نو بیاہتا جوڑا بھی اترا تھا۔ ان کے پاس صرف ایک اٹیچی کیس اور دستی بیگ تھا...... وہ دونوں اب بھی دل گرفتہ دکھائی دیتے تھے اور لڑکی کی آنکھوں میں غم کے گہرے بادل تھے۔

وسیم ان کے پاس گیا۔ اس نے لڑکے سے کہا۔

"آپ دونوں کی شادی نئی نئی ہوئی ہے...... آپ دونوں کیا ہنی مون منانے آئے ہیں؟"

دلہن کا چہرہ لمحے کے لئے حیا آلود ہو گیا۔ لڑکا گڑبڑا سا گیا اور سنبھل کر بولا۔

"یہ آپ کو کیسے اندازہ ہوگا......؟ کیا کسی نے آپ کو بتایا......؟"

"میں کوچ میں آپ کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔" وسیم نے جواب دیا۔ "میں نے آپ دونوں کی باتیں سن لی تھیں جو اگرچہ سرگوشیوں میں ہو رہی تھیں۔ اس سے اندازہ ہو گیا کہ آپ دونوں ہنی مون پر آئے ہیں...... اور آپ دونوں کی شادی حال ہی میں ہوئی ہے۔"

"کیا...... کیا...... آپ نے ہماری ساری گفتگو سن لی......؟" دلہن نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اس کے چہرے پر کرب نمودار ہوا۔

"نہ صرف گفتگو سن لی...... بلکہ میں نے آپ کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے جنہیں چھپانے کے لئے آپ باہر جھانک رہی تھیں۔" وسیم نے کہا۔

لڑکے نے اپنی دلہن کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اسے جیسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

"گلنار......! تم سارا راستہ روتی رہی تھیں......؟ کیوں......؟ مگر مجھے دلاسا دیتی رہی تھیں۔"

گلنار نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس نے مڑ کر اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو امڈ آئے تھے۔

"میں آپ دونوں کو شادی کی خوشی میں لنچ کی دعوت دینا چاہتا ہوں۔ لنچ کا وقت بھی ہو گیا ہے۔" وسیم نے لڑکے سے کہا۔ "آپ دونوں میری دعوت قبول کر لیں گے تو مجھے کتنی خوشی ہوگی میں بتا نہیں سکتا...... پلیز! انکار نہ کریں...... ورنہ مجھے بہت دکھ ہوگا۔ میں دکھ سہہ نہیں سکتا۔"

"لیکن ہم آپ کو نہیں جانتے ہیں اور پھر آپ کی دعوت سمجھ سے بالاتر ہے۔" انور مشکوک ہو رہا تھا۔

"خلوص کے علاوہ کوئی اور جذبہ کارفرما نہیں ہے......" وسیم نے کہا۔ "آپ مشکوک نہ ہوں۔ آپ چل کر لنچ کر لیں...... میں کھانے کی میز پر بتاؤں گا کہ میں نے آپ کو کیوں دعوت دی...... آپ کی تسلی کے لئے بتائے دیتا ہوں کہ...... میں جب کبھی بھی آتا ہوں یہاں جو جوڑے ہنی مون منانے آتے ہیں میں انہیں لنچ یا ڈنر ضرور دیتا ہوں۔ جوان جوڑوں کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔"

وسیم کے لہجے میں ایسا خلوص، سچائی اور جذبہ تھا کہ وہ انکار نہ کر سکے۔ وہ اس کے ساتھ ہو لئے۔ جب وہ انہیں لے کر ڈریم لینڈ ہوٹل کے سامنے پہنچے تو دلہا دلہن کو یقین نہ آیا...... اس ہوٹل کے بارے میں اسے جولی نے بتایا تھا...... اس نے باتوں باتوں میں کاکس بازار کے ہوٹلوں کے بارے میں معلوم کر لیا تھا۔ اور پھر گلنار بھی جانتی تھی۔ اس ہوٹل کی عمارت بتا رہی تھی کہ وہ کس درجے کا ہوٹل ہے۔

جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے۔ ہال کے خوابناک ماحول نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان دونوں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسے ہوٹل میں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ سحر زدہ سے تھے۔

وسیم انہیں لے کر ایک پرسکون گوشے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ میز پر بیٹھے تو ویٹریس آرڈر لینے آ گئی...... یہ بری جواں سال عورت تھی۔ بہت ہی خوب صورت اور طرح دار تھی...... کاکس بازار سے پہلے راموگاؤں آتا تھا اس راموگاؤں میں بنگال کم۔ بری اور مگ قبیلے کی آبادی زیادہ تھی۔ یہاں کی لڑکیاں اور عورتیں ہوٹلوں اور ریسٹورنٹوں میں ملازمت کر رہی تھیں۔ سیاحوں کی دل بستگی سے بھی ان کی آمدنی ہوتی تھی اور بخشش بھی اچھی خاصی مل جاتی تھی...... جب ویٹریس کھانے کا آرڈر لے کر چلی گئی تو وسیم...... "ابھی آیا" کہہ کر استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا...... دلہا دلہن ہال کا جائزہ لینے لگے۔ بہت ساری میزیں بھری ہوئی تھیں۔

"انور......!" گلنار نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "جانے کیوں مجھے ایک انجانا سا خوف آ رہا ہے...... کہیں یہ شخص فراڈ تو نہیں ہے......؟ وہ ہمیں لنچ کے بہانے یہاں لے آیا...... کہیں وہ کوئی چکر تو نہیں چلا رہا......؟"

"نہیں......!" انور نے اسے دلاسا دیا۔ "وہ چکر باز معلوم نہیں ہوتا...... بالفرض محال ایسا ہوا تو تم پریشان اور ہراساں نہ ہو...... میں جو ساتھ ہوں...... اگر اس نے کوئی چکر چلایا تو میں نمٹ لوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد وسیم واپس آ گیا۔ اتنے میں ویٹرس نے میز پر کھانا چن دیا۔ کھانا بہت پرتکلف تھا۔ خاصی مقدار میں تھا۔ ان تینوں نے کھانا شروع کیا۔ دلہا دلہن تکلف کرنے لگے تو وہ انہیں بڑے اصرار سے کھلاتا رہا تھا۔ جب وہ کھانے سے فراغت پا چکے تو وسیم نے اپنی جیب سے چابی نکال کر انور کی طرف بڑھا دی۔

"یہ کیا؟" انور نے حیرت سے چابی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کس چیز کی چابی ہے؟"

"یہ کمرا نمبر ایک سو ایک کی ہے......" اس نے جواب دیا۔ "میں نے اسے سات دنوں کے لئے بک کرایا ہے۔ اس کا سات یوم کا کرایہ اور تینوں وقت کے

کھانے کی ادائیگی کردی ہے...... اب آپ دونوں آرام وسکون سے ہنی مون منائیں...... کسی بات کی فکر نہ کریں...... اس سنہرے موقع سے پوری طرح لطف اندوز ہوں۔"

انور اور گلنار نے حیران ہوکر اس کی شکل دیکھی۔ انہیں اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔

وسیم نے جیب سے ایک رسید نکالی اس کی طرف بڑھائی۔ "ہوٹل والوں کو جو میں نے ادائیگی کی ہے یہ اس کی رسید ہے۔"

"تمیں ہزار ٹاکا......؟" انور نے رسید پر درج رقم دیکھ کر کہا۔ "آپ نے اتنی بڑی رقم ادا کردی...... کیوں......! کس لئے......؟"

"بات یہ ہے کہ میرے پاس کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے۔" وسیم نے کہا۔ "اللہ نے بہت کچھ دیا ہے...... میں ایسے لوگوں کی مدد کرتا ہوں جو خوشیوں سے محروم اور دور ہوتے ہیں۔ مجھے کسی کے کام آکر بہت خوشی ہوتی ہے۔"

"اللہ نے آپ کو دولت بھی دی تو ساتھ ساتھ بڑا دل بھی دیا ہے۔" گلنار انور جذبات سے مغلوب ہو کر بولی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ "نہ جانے کیوں یقین نہیں آرہا ہے...... ایسا لگتا ہے کہ ہم کوئی سندر سپنا دیکھ رہے ہیں۔"

"آپ کا یہ احسان شاید ہی کبھی بھلا سکیں۔" انوار کی آواز بھرا گئی۔ "کاش! ہم اس کا صلہ دے سکتے......؟"

"صلہ......؟" ہاں...... آپ اس کا صلہ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "نہ دینا چاہیں تو کوئی بات نہیں ویسے میں نے کسی صلے کی غرض سے آپ کی مدد نہیں کی ہے......"

ان دونوں نے متوحش ہوکر اسے دیکھا......؟ انہیں ایک ان جانا سا خیال آیا تھا...... گلنار نے سوچا کہ...... ایک طرف تو یہ کہہ رہا ہے کہ اس کا صلہ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں...... دوسری طرف بے غرض کی بات کررہا ہے۔ اتنی بڑی رقم خرچ کی ہے تو وہ اس کا کوئی نہ کوئی صلہ چاہے گا...... اگر ایسا ہوا تو وہ انکار کردے گی۔"

"آپ......! آپ کیا صلہ چاہتے ہیں......؟" گلنار نے پوچھا۔ اسے اپنی آواز گلے میں گولے کی طرح اٹکتی محسوس ہورہی تھی۔

"دعا......!" اس نے سنجیدہ ہوکر جواب دیا۔ "آپ دونوں کی دعاؤں سے بڑھ کر کیا صلہ ہوسکتا ہے؟"

ان دونوں نے سکون واطمینان کا سانس لیا۔ گلنار کو ایسا لگا جیسے اس کے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہوگئے ہیں۔

"اگر آپ نہ بھی کہتے تو ہم ساری زندگی آپ کو دعاؤں میں یاد کرتے رہتے۔" گلنار نے کہا۔

"ویسے کیا آپ ہمیں اپنے بارے میں بتانا پسند کریں گے......؟ ہم لوگ ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہوئے ہیں۔"

"میرا تعارف اتنا ہی کافی ہے کہ میرا نام وسیم ہے۔" اس نے بتایا۔ "مزید تعارف بعد میں ہوجائے گا...... اب آپ لوگ چل کر آرام کرلیں۔ سفر نے تھکا دیا ہوگا...... میں نے بھی اس ہوٹل میں کمرا لیا ہوا ہے۔ کمرا نمبر دو سو تین ہے۔ جب کبھی میری ضرورت اور کسی قسم کی بھی خدمت درکار ہو بغیر کسی جھجک اور تکلف کے یاد کریں۔"

جانو اور چمپا کس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں اسے کچھ پتا نہیں تھا...... اس نے آج کا دن آرام کرنے اور شام کا وقت انوار اور گلنار کے ساتھ گزارا تھا۔ اس نے شاپنگ بھی کرائی تھی اور پھر ڈنر کے لئے دوسرے ہوٹل میں لے گیا تھا۔ جہاں باربی کیو تھا۔ اس نے اپنے پاس اتنی رقم رکھ لی تھی کہ دو تین دن تک کام دے سکے۔ کیوں کہ وہ اپنے منصوبے کو طول دینا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے دوسرے دن یہ بات معلوم کرلی تھی کہ جانو اور چمپا الگ الگ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس نے وہ ہٹ بھی دیکھ لی تھی جس میں عاصم اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کی ہٹ سب سے آخر میں تھی۔ یہاں سیاح نہیں آتے تھے۔ پھر اس نے رات دس بجے عاصم کو ہٹ سے نکلتے دیکھا تو اس نے عاصم کا تعاقب کیا...... عاصم اس ہوٹل میں گیا جہاں چمپا ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ عاصم کے انتظار میں باہر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے جانو کو بھی جاتے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد پہلے جانو باہر آیا۔ پھر عاصم...... جانو عاصم کے انتظار میں قدرے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ ان دونوں نے آپس میں کچھ دیر کھسر پھسر کی۔ پھر دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔

تیسرے دن صبح وسیم نے اوور کوٹ پہننے کے بعد سر پر اونی ٹوپ چڑھالیا۔ اس لئے کہ آج موسم بے حد خنک تھا۔ رات کے آخری پہر خاصی تیز بارش ہوئی تھی۔ دسمبر کا سرد مہینہ تھا۔ صبح سورج طلوع ہوا تو آسمان صاف تھا۔ بادل کا ایک ٹکڑا تک نہ تھا۔ اس کے پاس آٹو میٹک پستول بھی تھا۔ اس نے اٹیچی کیس سے پستول نکال کر جیب میں رکھ لیا اور دوسری جیب میں ساتھ آٹھ گولیاں بھی رکھ لیں تاکہ جانو سے سامنا ہو تو کام آئیں۔

جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر پہلی منزل کے زینے پر آیا تو اس نے انور اور گلنار کو دیکھا جو اپنے کمرے سے نکل کر ناشتا کرنے نیچے ڈائننگ ہال میں جارہے تھے۔ ان دونوں کے چہروں پر شب بیداری کا فسانہ لکھا ہوا تھا۔ گلنار کی آنکھیں مخمور تھیں اور ان میں نیند کا خمار بھرا ہوا تھا۔

وہ ہوٹل سے نکل کر بازار کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں ایک بہت بڑا اسٹور تھا اس نے وہاں سے خریداری کی۔ اس نے ٹافیاں، چاکلیٹ اور بسکٹ خریدے، پھر وہ عاصم کے ہٹ کی طرف تیزی سے بڑھ گیا۔ اسے امید تھی کہ عاصم گھر پر نہیں ہوگا۔

اس نے چھ سات منٹ میں مسافت طے کرلی۔ وہ شارٹ کٹ سے گیا تھا۔ اس نے ہٹ کے دروازے پر دو مرتبہ وقفے وقفے سے دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ بے آواز کھل گیا۔

اس کی نظروں کے سامنے ایک تمیں برس کی بھرپور، طرح دار اور بلند قامت عورت کھڑی تھی۔ اس میں بڑی دلکشی اور جاذبیت تھی۔ جولی نے غلط نہیں کہا تھا کہ عاصم کی بیوی فرخندہ نہایت حسین وجمیل عورت ہے۔ وہ آسمانی حور دکھائی دیتی تھی...... اس نے سوچا کہ اس عورت کے چہرے پر جو تقدس ہے وہ شاید جنت کی حوروں پر بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا...... وہ ایک سیدھی سادی عورت لگ رہی تھی۔ اسے اس لمحے ایسا لگا کہ جیسے اس کے سامنے نیلو کھڑی ہوئی ہے...... اس میں اور نیلو میں کسی قدر مماثلت تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ اسے نیلو ہی سمجھ بیٹھا تھا۔ اس عورت کے چہرے پر دل آویز مسکراہٹ ابھر کر ہونٹوں کے گوشوں میں پھیل گئی۔ اس نے بڑی شائستگی اور نفیس لب ولہجے میں پوچھا۔ اس کی آواز بڑی رسیلی اور کھنکتی ہوئی تھی۔

"فرمائیے...... آپ کو کس سے ملنا ہے......؟"

"مسٹر عاصم سے......" اس نے جواب دیا۔ "کیا وہ تشریف رکھتے ہیں۔ ان سے کہیے کہ......"

"تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے وہ اپنے کسی دوست سے ملنے ریڈ کارپٹ ہوٹل گئے ہیں۔" فرخندہ نے درمیان میں کہا۔ "وہ کہہ گئے تھے کہ ان کی واپسی میں آدھا گھنٹہ لگ جائے گا۔"

"کیا میں اندر بیٹھ کر ان کا انتظار کرسکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "مجھے ان سے ایک نہایت ضروری کام ہے۔"

"ضرور...... ضرور...... کیوں نہیں......" فرخندہ نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر کا راستہ دیا۔

جب وہ اندر داخل ہوگیا تو فرخندہ دروازہ بھیڑ کر اسے لے کر نشست گاہ کی طرف بڑھی۔ نشست گاہ میں اس کی تین برس کی لڑکی کھلونوں سے کھیل رہی تھی...... اس نے وسیم کو دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور بڑے دل کش اور مودبانہ طریقے سے آداب کیا۔

وسیم نے صوفے پر بیٹھ کر اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔ پھر اس کے پھول سے رخسار پر بوسہ دے کر پوچھا۔

”ماشاء اللہ...... آپ بہت پیاری ہیں۔ گڑیا جیسی ہیں...... آپ کا نام کیا ہے؟“

”میرا نام شیریں ہے۔“ بچی نے جواب دیا۔ ”ممی اور ڈیڈی مجھے گڑیا کہہ کر بلاتے ہیں۔“

”واقعی آپ گڑیا جیسی ہیں اس لئے گڑیا کہتے ہیں...... میں بھی آپ کو گڑیا کہوں گا۔“ اس نے مسکرا کر اس کے ننھے اور خوب صورت ہاتھوں کو چوم لیا۔ اس کا رخسار تھپتھپایا۔

پھر اس نے بچی کو گود سے اتار دیا اور جیب سے ایک پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”ہم اپنی گڑیا کے لئے چاکلیٹ اور ٹافیاں لائے ہیں...... یہ باہر کی ہیں۔ آپ کو بہت پسند آئیں گی۔“

”تھینک یو انکل......!“

بچی نے اس کے ہاتھ سے پیکٹ لینے کے بعد اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اسے تپائی پر رکھ دیا۔ پھر انہیں کھول کر چاکلیٹ اور ٹافیاں نکال کر کھانے لگی۔ پھر وہ کھلونوں سے کھیلنے لگی۔

”آپ نے بڑی زحمت کی...... بہت بہت شکریہ۔“ فرخندہ نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کو پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ چٹا گانگ ہمارے گھر نہیں آئے...... آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟“

”میرا تعارف......؟“ وہ مسکرایا۔ ”میرا نام وسیم ہے...... عاصم میرے بہت ہی عزیز اور قریبی دوستوں میں سے ہے...... کیا آپ کے سرتاج نے میرا تذکرہ نہیں کیا......؟“

”جی نہیں......“ فرخندہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”اگر آپ ان کے قریبی دوستوں میں سے ہیں تو بڑے عرصے کے بعد ان سے ملنے آئے ہیں۔“

”دراصل میں ملک سے باہر تھا۔“ وہ بتانے لگا۔ ”کل میں آپ کے ہاں عاصم سے ملنے پہنچا تو ملازمہ نے بتایا کہ آپ لوگ پندرہ بیس دن کے لئے کاکس بازار گئے ہوئے ہیں۔ پھر اس نے بتایا کہ آپ لوگ کس نمبر کے ہٹ میں ٹھہریں گے۔“

”ایک منٹ......!“ اس نے اپنے پرس میں سے موبائل فون نکالا۔ ”میں عاصم سے رابطہ کرتی ہوں تاکہ وہ جلد پہنچ جائیں۔“

”آپ انہیں میرا نام نہیں بتائیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”تاکہ سرپرائز رہے۔ صرف اتنا کہیں کہ ایک پرانا دوست تلاش کرتا ہوا آ پہنچا ہے۔“

فرخندہ مسکرا دی۔ اس نے عاصم کے موبائل کا نمبر ملایا اور پھر کان سے لگالیا پھر چند لمحوں تک سنتی رہی پھر بولی۔

”معلوم نہیں...... انہوں نے اپنا موبائل فون بند کر رکھا ہے۔“

”آدھے گھنٹے کی تو بات ہے وہ آجائیں گے......“ اس نے کہا۔ ”بھابھی!...... آپ پریشان نہ ہوں۔ میں انتظار کرلوں گا۔“

”آپ کیا پینا پسند فرمائیں گے؟“ فرخندہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میرے خیال میں موسم کے لحاظ سے کافی زیادہ مناسب رہے گی۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو فرخندہ کافی بنانے چلی گئی...... فرخندہ کے کافی تیار کر کے لانے تک وہ اس بچی کے ساتھ کھیلتا اور باتیں کرتا رہا...... وہ بڑی پیاری بچی تھی...... بڑی تہذیب یافتہ اور اچھی عادت و اطوار کی تھی...... اس نے دل میں سوچا کہ ”یہ کیسا ظالم شخص ہے جو دولت اور ایک عورت کے حصول کے لئے اتنی پیاری بچی کو اس کی ماں سے محروم کرنے والا ہے...... ایسا تو شاید ہی کوئی شقی القلب کر سکے...... اسے کیا اس بات کا احساس ہے کہ ماں کی موت سے بچی پر کیا گزرے گی؟“

(جاری ہے)

اندیشناک

شرجیل تصور-لاہور

یکے بعد دیگرے کیمرے سے کئی تصویریں کھینچی گئیں، ہر تصویر میں لڑکی موجود تھی مگر یہ کیا جب تصویریں دھل کر آئیں تو کسی ایک تصویر میں بھی لڑکی کا وجود نہیں تھا جسے دیکھ کر تصویر بنانے والا حیران رہ گیا۔

نادیدہ قوتوں کی عجیب وغریب شرانگیزی جسے پڑھنے والے دنگ رہ جائیں گے

مجھے آج کچھ کام تھا جس کی وجہ سے شام کو ذرا جلدی لوٹنا پڑا، ہمارے گھر کا واٹر پمپ اچانک خراب ہوگیا تھا اور مجھے ہر حال میں اس کی مرمت کروانی تھی ورنہ اوپر والی ٹنکی میں موجود پانی کے استعمال کے بعد ہمیں پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا اور ساتھ ہی مجھے ابا کی جھڑکیاں بھی سننا پڑتیں۔

ہماری گلی بارہ گھروں پر مشتمل تھی اور یہ آگے سے جا کر بند ہوجاتی تھی اس لئے کوئی بھی غیر شخص اس میں داخل ہونے سے اجتناب کرتا تھا۔ ہمارے بالکل سامنے والا گھر تقریباً ایک سال سے ویران پڑا تھا۔ میں گھر آیا تو پتا چلا کہ اس میں کوئی کرایہ دار رہنے کے لئے آئے ہیں۔ سامنے والے گھر کی دیواریں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ ہمارے گھر کی چھت سے سامنے والے گھر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ میں اپنے گھر کی چھت پر

چڑھا اور سامنے والے گھر میں جھانکا کہ آیا دیکھوں تو نئے کرایہ دار کیسے لوگ ہیں......؟

دیکھنے میں وہ لوگ نارمل تھے بس رنگت کے ذرا پکے تھے۔ خاندان کے سربراہ کی عمر 55 کے قریب تھی۔ اس کی بیوی رنگت میں ذرا زیادہ ہی سانولی تھی جس کی ناک بہت تیکھی تھی۔ ان کے بڑے بچے جوانی کی عمروں کو پہنچ رہے تھے البتہ ان کی مسیں نہیں بھیگی تھیں۔ ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی جس نے لال رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ گھر کا سامان قرینے سے رکھنے میں مصروف تھی اس نے ایک بار میری طرف عام سی نظروں سے دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں لگ گئی۔ مجھے بھی اس لڑکی میں کوئی خاص کشش محسوس نہ ہوئی۔ میں نے نیچے آکر موٹر کھولی اور اسے مکینک سے ٹھیک کروانے کے لئے لے کر چلا۔

اگلے دن ایک بار پھر میری اس لڑکی پر نظر پڑی، وہ خاص حد تک گھر کا سامان سمیٹ چکی تھی مگر ابھی بھی خاصی حد تک سمیٹنا باقی تھا۔ پہلے دن کی طرح آج بھی اس کی مجھ پر نظر پڑی مگر ان نظروں میں بالکل غیر جانب داری تھی اور میرے لئے کسی بھی طرح کا کوئی پیغام نہیں تھا، میں نے بھی اسے محض سرسری نظروں سے دیکھا۔

میری عمر 19 کے اوائل میں تھی گویا میں 20 سالوں کا ہونے والا تھا۔ میں نے اباجی کے کہنے پر ویلڈنگ کا کام سیکھ لیا تھا۔ میں ایک فیکٹری میں الیکٹرک ویلڈنگ کا کام کرتا تھا۔ تنخواہ مناسب تھی سو کسی طرح کی پریشانی نہیں تھی، زندگی سہل انداز میں گزر رہی تھی۔

اگلے چند دنوں تک مزید کوئی بات نہ ہوئی۔

اتوار کے روز دوبارہ اس پر نظر پڑی۔ آج اس لڑکی کے کپڑے بدلے ہوئے تھے۔ قمیض پیلی اور لال رنگ کی لائنوں والی تھی جبکہ شلوار سفید رنگ کی تھی۔ آج اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے اپنا نیچے کا ہونٹ دانتوں سے کاٹ لیا۔ یہ ایسا sentiment تھا جو کوئی بھی لڑکی کسی اجنبی لڑکے کو دیکھ کر کر سکتی ہے۔ گویا آپ اسے ایک طرح سے لڑکی کو شرم یا لاج آنا بھی کہہ سکتے ہیں۔

اگلے دن اس کے دونوں بڑے بھائیوں سے میری علیک سلیک ہوئی۔ دوپہر میں، میں نے اسے صحن میں جھاڑو دیتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑے دھیمے دھیمے انداز میں جھاڑو دے رہی تھی۔ پہلی بار مجھے وہ لڑکی بہت پیاری لگی پتا نہیں کیوں، اس کی جب مجھ پر نظر پڑی تو میں نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اسے ایک اشارہ کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی ایک لہر سی لہرائی اس کے بعد فوراً اس نے نظر پھیر لی اور دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

اماں کی بھی ان لوگوں سے تھوڑی بہت علیک سلیک ہو گئی تھی۔ اماں نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ فیصل آباد کے علاقے سے آئے ہیں۔ خاتون کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آنے لگی تھیں اس کے بیٹوں سے بھی میری کافی دوستی ہو گئی تھی۔ بڑے لڑکے کا نام کرامت اور چھوٹے کا اکرام تھا، کرامت ضرورت سے کچھ زیادہ ہی باتونی تھا۔ وہ ہر وقت بد لتا رہتا تھا اور صرف اپنی سنانے والوں میں سے تھا اور کسی کی سننا اسے کسی بھی طور پر پسند نہیں تھا، ان کے والد کا نام جعفر اور ماں کا نام وزیرن تھا، اب مجھے لڑکی کے نام کا بھی پتا چل چکا تھا، اس کا صحیح نام تو نازیہ تھا مگر گھر والے پیار سے اسے نازو کہہ کر پکارتے تھے۔

اب میں نازو کو ضرورت سے زیادہ تنگ کرنے لگا تھا مجھے اس کے چہرے کی سنجیدگی بہت متاثر کرتی تھی۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ میں اس لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کر کے چھوڑوں گا مگر چار ماہ کے عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ لڑکی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کے گھر والوں نے قریب ہی کے ایک اسکول میں اسے نویں جماعت میں داخلہ دلا دیا تھا۔ وہ صبح جب اسکول جاتی تو میں بڑی پابندی سے اس ٹائم اٹھتا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ ایک بھرپور نظر دیکھنے پر بھی راضی نہ تھی حالانکہ وہ اتنی زیادہ خوبصورت بھی نہیں تھی پھر بھی نہ جانے کیا وجہ تھی...... ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آتا تھا کہ شاید اس لڑکی کا پہلے سے ہی کسی لڑکے

کے ساتھ آشنائی ہو اور وہ ابھی تک اس کے دل میں بسا ہو ایسی صورت میں لڑکی کو اپنے قابو میں لانا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔

میرے اور نازو کے بیچ ابھی تک جو کچھ بھی ہوا تھا میں اس کا حرف بہ حرف اپنے لنگوٹیا دوست اصغر کو بتاتا تھا۔ وہ ایک عرصہ سے میری خرافات برداشت کرتا آرہا تھا آخر وہ مجھ پر پھٹ پڑا پہلے تو اس نے مجھ پر ڈھیر سارا غصہ نکالا پھر مجھے آرام سے سمجھایا کہ "یہ لڑکی تیرے چکروں میں آنے والی نہیں ہے اس کا خیال دل سے نکال دے۔"

مجھے اصغر کی باتوں پر غصہ تو بہت آیا تھا مگر جب بعد میں، میں نے ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو مجھے اس کی باتیں صحیح محسوس ہوئیں۔ نازو واقعی میرے چکروں میں آنے والی نہیں تھی میں بلاوجہ اپنا وقت برباد کر رہا تھا۔ اوپر سے میری والدہ مجھے بہت زیادہ نوٹ کرنے لگی تھیں۔ میں نے سوچ لیا کہ اب میں نازو کو نہیں چھیڑوں گا مگر جب میں چھت پر گیا تو وہ سامنے والے کمرے سے نکل رہی تھی۔ جب اس کی مجھ پر نظر پڑی تو اچانک اس کی ہنسی چھوٹ گئی اور واپس اندر کمرے میں بھاگ گئی۔ میں اب چھت پر حیرت زدہ کھڑا تھا کہ اس کی ہنسی کیوں چھوٹی اور وہ اندر کیوں بھاگی حالانکہ آج میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا، شاید وہ ایک عرصہ سے اپنے اندر کا غبار سنبھالے ہوئے تھی۔ آخر اس غبار کو کبھی نہ کبھی تو باہر نکلنا تھا۔ اب مجھے پتا چلا میں جو اپنی بے سود کوشش کر رہا تھا وہ نازو جیسے بھاری پتھر کو نیچے ہی نیچے سے ذرا ذرا سرکا رہی تھی اور آخر آج وہ پتھر پوری طرح سے لڑھک گیا تھا۔

نازو کے صرف ہنس دینے سے میرا دل خوشی سے نہال ہو گیا تھا اب میں اسے زیادہ سے زیادہ وقت دینے لگا تھا۔ میں کام سے جتنی جلدی ہو سکتا چھٹی کرتا اور آکر فوراً چھت پر کھڑا ہو جاتا۔ نازو ابھی تک مجھ سے کترا رہی تھی مگر جب بھی اس سے نظریں چار ہوتیں تو اس کے گالوں پر شرم کی لالی دوڑ جاتی اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو جاتی۔ نازو کے گالوں کی شرم کی لالی اور آنکھوں کی چمک ہی میری کامیابی کا انداز تھی۔

نازو سے میری چاہت روز بہ روز بڑھتی ہی چلی جارہی تھی اور میں خود سے حیران ہو رہا تھا کہ ایک عام سی شکل و صورت والی لڑکی کے پیچھے میں کیوں پاگل ہو رہا ہوں۔

نازو اب مجھے براہ راست دیکھنے لگی تھی یعنی کھل کھلا کر مگر ابھی بھی وہ اپنا غصہ دکھانے سے باز نہیں آتی تھی مگر اس کی آنکھوں کی چمک اس کا سارا کام خراب کر دیتی تھیں، اتنا کچھ ہونے کے باوجود ابھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اس سے بات کر سکوں ایک روز اس نے خود ہی میری یہ مشکل بھی آسان کر دی۔

میں باہر گلی سے آتا ہوا اپنے گھر میں گھسنے لگا تھا کہ اس نے مجھے آواز دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ میں کھڑکی کے قریب چلا گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور مجھ پر برس پڑی۔ "اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ! آئندہ تم نے ہمارے گھر کچھ پھینکا تو یاد رکھنا میں اپنی امی کو بتا دوں گی۔" اس نے اتنا کہا اور غصے سے کھڑکی بند کر دی، میں ہکا بکا کھڑا یہ سوچتا رہ گیا کہ "میں نے ان کے گھر میں پھینکا کیا ہے؟"

اگلے چند دنوں میں، میں اسی بات کو جاننے کے چکر میں رہا کہ آیا نازو کی بات میں واقعی کوئی سچائی تھی اس کے گھر میں کچھ پھینکا گیا تھا یا محض اس نے اپنی بات بنائی تھی یا مجھ سے بات کرنے کے لئے......

چند دنوں کی معلومات کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ نازو کے بڑے بھائی کرامت کا، ساتھ والے گھر کی لڑکی رابعہ سے چکر تھا اور اس نے اس کے لئے پانچ پیر دربار کے میلے سے ایک فینسی انگوٹھی خریدی تھی جس کو اس نے کاغذ کے ایک چھوٹے سے گولے میں رکھ کر رابعہ کے گھر کی چھت پر پھینکی تھی۔ چونکہ انگوٹھی رات کے اندھیرے میں پھینکی گئی تھی اس سے پتا نہ چل سکا کہ وہ چھت پر گئی ہے یا نہیں...... انگوٹھی ان کے اپنے گھر میں

ہی گر گئی تھی جو صبح کو ان کی ماں نے جھاڑو دیتے ہوئے اٹھائی تھی۔ چونکہ انگوٹھی کاغذ کے گولے میں تھی اس لئے سبھی اس کی وجہ سے تشویش میں مبتلا تھے۔ نازو نے براہ راست مجھ پر شک کیا تھا۔ کہ یہ انگوٹھی میں نے اس کے لئے پھینکی ہے۔

کرامت مجھ سے کافی حد تک بے تکلف ہوگیا تھا اس کا مجھ سے باتوں کا موضوع زیادہ تر رابعہ ہی ہوتی تھی، رابعہ چونکہ میرے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی، اس لئے مجھ سے بے تکلف تھی۔ کرامت اس بے تکلفی کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ غالباً اس کا ارادہ رابعہ کے معاملے میں مجھے استعمال کرنے کا تھا اور میں بھی اسے خود یہ موقع فراہم کررہا تھا کیونکہ میں خود بھی اسے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

نازو مجھ سے ایک بار بات کرنے کے بعد اب مجھ سے خاص حد تک کھل گئی تھی۔ وہ بات بات پر ادائیں دکھانے لگی تھی ایک دو بار اس نے مجھ سے کہا بھی کہ میں کھڑکی میں آؤں وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ مگر جب میں کھڑکی میں گیا تو وہ نہیں آئی گویا یہ ایک طرح سے مجھ کو تنگ کرنے کا طریقہ تھا۔ آخر تنگ کرتے کرتے ایک روز وہ کھڑکی پر آہی گئی۔ ہمارے درمیان ڈھیر ساری باتیں ہوئیں۔ میں نے نازو سے اس بات کا اقرار کیا کہ میں اس سے پیار کرنے لگا ہوں ایسا ہی اعتراف اس نے بھی کیا لیکن ساتھ ہی وہ ایک بات کو بار بار دہراتی رہی کہ میں نے اسے توڑ کر رکھ دیا ہے اور یہ جو بھی ہوا ہے اچھا نہیں ہوا۔

نازو کے بقول بھلے ہی یہ اچھا نہ ہو مگر میرے تو خیال میں یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ نازو بھلے ہی زیادہ خوبصورت نہ سہی مگر میں حقیقت میں اس سے سچا پیار کرنے لگا تھا اور اسی بار بار کی تکرار کی وجہ سے اس کے اندر بھی جذبہ محبت جاگ اٹھا تھا۔

دوسری طرف کرامت کے بارے میں مجھے جو نظر آرہا تھا وہ یہ تھا کہ شاید وہ رابعہ کے معاملے میں سنجیدہ ہے مگر اس کی لاابالی طبیعت مجھے شک میں بھی مبتلا کردیتی تھی اور بعد میں میرا یہ شک صحیح ثابت ہوا تھا۔

نازو کے معاملے میں میری سنجیدگی ضرورت سے زیادہ ہی بڑھتی جارہی تھی کھڑکی میں کھڑے ہوکر روز یہی باتیں کرنا ہمارا معمول بن چکا تھا اس بات میں خطرہ بھی تھا کیونکہ میں کھڑکی سے باہر گلی میں کھڑا ہوتا تھا ایسی صورت میں آنے جانے والوں کی نظریں مجھ پر گڑ جاتی تھیں اور لوگ مجھ پر کھلم کھلا شک کرنے لگے تھے مگر کیونکہ انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اندر کون ہے لڑکا یا لڑکی...... اس لئے اس بات پر پوری طرح یقین نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہ بھی میرا معمول بن چکا تھا کہ میں روزانہ بلاغانہ صبح اٹھ کر چھت پر پہنچ جاتا اور صحن میں سوئی ہوئی نازو کو کنکر مار کر اٹھا دیتا اور ہماری محبت کا سلسلہ صبح ہی صبح شروع ہوجاتا، اکثر ایسا بھی ہوتا کہ میرا نشانہ خطا ہوجاتا اور کنکر اپنی اصل جگہ کے بجائے کہیں اور پہنچ جاتا ایسی صورت میں یہ میرے لئے رسک ہی ہوتا مگر میں نازو کی محبت میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ مجھے رسک بھی قبول تھا۔

بعد کے واقعات میں اسے اہمیت صرف چند باتوں کی ہی تھی ایک تو یہ کہ دو تین بار نازو کو پیسوں کی ضرورت پڑی جو اس نے جھجکتے ہوئے مجھ سے مانگ لئے۔ دوسری بات میں نے نازو کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ مجھ سے تنہائی میں ایک ملاقات کرے، بڑی مشکل سے بہر حال وہ مان گئی اور اس نے کہا وہ موقع دیکھ کر بتائے گی اور تیسری بات یہ کہ میں نے یہ ساری باتیں اصغر کو بتائیں اور اس سے کیمرے کی ڈیمانڈ کردی۔

اصغر ایک فوٹو شاپ میں بطور فوٹو گرافر کام کرتا تھا، اس کے علاوہ اس نے گھر میں اپنا ایک ذاتی ڈارک روم بھی بنا رکھا تھا، اس کے پاس جو اپنا ذاتی کیمرہ تھا وہ اب کھٹیچر حالت کا ہو چکا تھا جو ظاہر ہے میرے کام بھی مشکل ہی سے آسکتا تھا اس لئے اصغر کو میرے استعمال کے لئے اسٹوڈیو سے کوئی فاضل کیمرہ دو تین دن کے لئے پار کرنا پڑتا تھا۔ اس نے یہ ہامی بھری کے جب ضرورت ہو تو میں ایک آدھ دن پہلے اسے بتلادوں۔

مجھے جس موقع کا انتظار تھا وہ آنے ہی میں نہیں آرہا تھا میرا خیال ہے کہ نازو جان بوجھ کر مجھے ٹال رہی تھی شاید وہ میری قربت سے خائف تھی لڑکیاں اس معاملے میں بہت حساس ہوتی ہیں۔ میں اس دوران یہ بات نوٹ کرتا رہا کہ نازو کے گھر کے مالی حالات خراب سے خراب تر ہورہے ہیں۔ مالک مکان اکثر کرایہ لینے ان کے در پر ہوتا اور وہ بے چارے آنا کانی کرتے رہتے۔ مجھے اتنا دکھ ہوتا کہ میرا دل چاہتا کہ میں اپنی جیب سے کرایہ دے دوں مگر میں اس بات کو جانتا تھا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو بعد میں اس بات کو بہت غلط رنگ دیا جائے گا، گویا میں اس معاملے میں بااختیار ہوتے ہوئے بھی بے اختیار تھا۔ نازو نے مجھ سے جو دو تین بار اسکول کے فنڈ کے لئے پیسے لیے تھے، وہ بھی ان کی مالی حالت کی جکڑن کی وجہ سے ہوا تھا۔

نازو سے میری اکیلے میں ملاقات آگے ہی آگے بڑھتی رہی اور اس کے دوران رمضان المبارک کا نزول ہوگیا جس سے معمولات زندگی ہی تبدیل ہوکر رہ گئی۔ پہلے جو تھوڑا بہت موقع ہوتا تھا اس کا ملنا بھی محال ہوگیا۔ رمضان المبارک میں ویسے بھی لوگ زیادہ تر عبادتوں کے چکر میں رہتے ہیں اور فحش قسم کا خیال ذہن میں لاتے ہوئے سو بار سوچتا ہے۔ میں بے شک نازو کے ساتھ دست درازی وغیرہ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اسے اپنے گلے سے لگا کر اپنے من کی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔ یہ بے شک اتنا بڑا گناہ نہ سہی مگر پھر بھی یہ سب آتا تو گناہوں ہی کے زمرے میں تھا گناہ بڑا ہو یا چھوٹا ہوتا تو گناہ ہی ہے نا! اور اگر قہر خداوندی پکڑنے پر آئے تو چھوٹے سے گناہ ہی کو پکڑ لے۔ اس لئے انسان باقی کے گیارہ مہینے تو نہ سہی مگر اس ایک مہینے میں بڑے تو بڑے چھوٹے گناہوں سے بھی بچنے کی کوشش کرتا ہے میں بھی یہ کوشش کررہا تھا۔ نظروں میں حیا بھر کے اور زبان پر قفل دھر کے، سر پر نمازی ٹوپی رکھے میرا بیشتر وقت مسجد کی راستہ ناپتے گزرتا تھا۔

رمضان المبارک کا تیسرا عشرہ شروع ہونے کو تھا کہ رات کو نازو سے میری کھڑکی پر بات ہوئی اس نے دو چار باتیں کرنے اور حال احوال پوچھنے کے بعد مجھے بتایا کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ کچھ دنوں کے لئے اپنی نانی سے ملنے جبہ پنڈ (گاؤں) جارہی ہے۔ مجھ سے اس کی ایک پل کی بھی جدائی قابل برداشت نہیں تھی، اس کی اس بات سے مجھے شاک سا لگا تھا، میں نے اسے جانے سے منع کردیا۔

اس نے کہا، ”اچھا اگر امی نے ضد نہ کی تو میں نہیں جاؤں گی مگر بات پکی نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا نانی سے ملنا نہایت ضروری ہے؟“

”ہاں بہت ضروری ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آج کل تو نانی اور ماموں جبہ گاؤں میں رہ رہے ہیں پھر پتا نہیں وہ کس طرف کوچ......“ اس نے اتنا کہا اور یک دم خاموش ہوگئی۔ جیسے کوئی ناگفتہ بات نادانستہ اس کے منہ سے پھسل گئی اور فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہو۔

”تم نے بات کیوں ادھوری چھوڑ دی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”نہیں...... وہ...... کچھ نہیں......“ اس نے ہچکچاتے اور ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں ضد پر اڑ گیا۔ ”نہیں تم مجھے بتاؤ اصل بات کیا ہے؟“ وہ اصل بات بتانے پر نہیں آرہی تھی مگر میری بہت زیادہ ضد دیکھ کر تھوڑا بہت بتانے پر راضی ہوگئی۔

اس نے کہا۔ ”جو بات میں تمہیں بتارہی ہوں ہم نے اپنی باتیں کبھی کسی اجنبی کو نہیں بتائیں۔ مگر تم چونکہ بہت زیادہ ضد کررہے ہو اس لئے بس اتنا جان لو کہ ہماری دشمنی چل رہی ہے۔ یہ دشمنی ہمارے اپنے ہی لوگوں سے ہے اس لئے ہمیں خود کو ان سے چھپا کر رکھنا پڑتا ہے اب میں زیادہ گہری باتیں تمہیں بتا نہیں سکتی، تم ضد کروگے بھی تو نہیں بتاؤں گی بہتر ہے کہ تم مزید ضد نہ ہی کرو تو......“

ابھی اس نے اتنی ہی بات کی تھی کہ پیچھے سے اس کے باپ کی کرخت آواز ابھری۔ ”تم یہاں کیا کررہی ہو؟“

”ابو وہ سامنے والوں کی باجی......“ نازو کے منہ سے لرزیدہ آواز نکلی۔

میں نے باپ بیٹی کی آوازوں کو بس اتنا یہ سنا تھا کہ فوراً اپنے گھر میں گھس گیا۔ میں بے حد ڈرا ہوا تھا اور شاید کسی ہنگامے کا بھی منتظر تھا مگر کچھ نہ ہوا۔

اگلے دن نازو مجھے اپنے گھر میں نظر نہ آئی۔ جہاں جہاں وہ پھرتی تھی اب اس کی جگہ ویرانی پھر رہی تھی وہ اور اس کے بھائی گھر میں نہیں تھے البتہ اس کے ماں باپ گھر ہی میں تھے۔ میرا دل اندر سے سخت اداس ہوا، میں نازو کا دیدار کرنا چاہتا تھا مگر نازو میرے سامنے نہیں تھی۔

اس دن کے بعد ٹھیک دس دن بعد واپس لوٹی اس دوران میرا جو حال رہا وہ میں ہی جانتا ہوں مگر شاید اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس بات سے بھی ہوا کہ جب اس سے میری نظر ملی تو اس نے نظر پھیر لی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ اس دن کے بعد اس نے مجھ سے اپنا رویہ یکسر ہی بدل لیا۔

میں ہر روز یہ کوشش کرتا کہ میری اس سے بات ہو مگر بات تو دور کی بات وہ مجھے دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتی تھی، اس نے مجھے ایسے نظر انداز کردیا تھا جیسے سرے سے ہی وہ مجھے جانتی نہیں۔ اب میں اکیلا چھت پر کھڑا ہوتا۔ اکیلا اور ساتھ ہی پریشان حال بھی......

بعد ازاں نازو کے گھر کے حالات بگڑتے چلے گئے، مجھے ہر وقت ان کے گھر میں بے سکونی سی نظر آتی جیسے ہر کوئی اپنے طور پر پریشان ہو۔ ایک دو بار میں نے کرامت سے اس معاملے کی بابت پوچھنا بھی چاہا مگر وہ دامن بچا گیا۔ دوسری صورت میں یوں سمجھ لیں کہ وہ بھی مجھ سے ذہنی طور پر دور ہوگیا تھا اور مجھ سے کوئی بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا اس لئے میں نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

پتا نہیں ایک دن کیا ہوا کہ نازو نے مجھے کھڑکی پر آنے کو کہا۔ میں خوشی سے نہال ہوگیا۔ میرا یہی خیال تھا کہ اس نے دوستی کے تجدید تعلق کے لئے مجھے کھڑکی پر بلایا ہے میں فوراً نیچے باہر گلی میں پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے پہلے کھڑکی کی دوسری طرف موجود تھی، میرے وہاں پہنچتے ہی اس نے کچھ کاغذات کھڑکی کے سوراخ سے باہر نکال دیئے اور ترخ سے بولی۔ ”یہ لو اپنے خط! اور آئندہ مجھے کبھی بلانے کی کوشش نہ کرنا۔“ اس نے اتنا کہا اور ایک زوردار جھٹکے سے کھڑکی کا پٹ بند کردیا۔

میں نے جو دو چار خط نازو کو لکھے تھے وہ اس نے سنبھال کر رکھے تھے۔ اس وقت وہ خط واپس میرے ہاتھ میں تھے۔ میں وہاں ہکا بکا کھڑا رہ گیا جیسے کسی نے گھڑوں پانی میرے اوپر گرادیا ہو۔ میں سر جھکائے پژمردہ قدموں سے واپس گھر آگیا، اس وقت میری جو حالت تھی وہ میں ہی جانتا تھا۔ میں نازو سے بے پناہ پیار کرتا تھا مگر وہ مجھے خود سے دور ہی دور کرتی چلی جارہی تھی۔

بعد میں ان کے حالات نے مجھے واضح طور پر بتا دیا کہ اب یہ لوگ یہاں نہیں رہیں گے اور عنقریب اس گھر کو چھوڑ کر واپس فیصل آباد یا پھر کسی اور شہر میں چلے جائیں گے۔ میرے اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت ملتی تھی کہ مالک مکان جسے سب لوگ شاہ کہتے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے روز کرایے کا مطالبہ کرنے ان کے گھر پر پہنچ جاتا مگر ان کے پاس کرایہ ہوتا تو وہ دیتے، بارہا میرا دل چاہتا کہ میں کرایہ اپنی جیب سے دے دوں مگر پھر سوچتا کہ میں اس بات کا کیا جواب پیش کروں گا......

میں نے یہ ساری باتیں اصغر کے گوش گزار بھی کردیں اور احتیاطاً میں نے اس سے اس کا اسٹل کیمرہ مانگ لیا، مقصد یہ تھا کہ مجھے واضح طور پر نظر آرہا تھا کہ اب نازو کسی بھی طور پر میرے ساتھ دوستی روا رکھنے کی روادار نہیں اور یہ بھی کہ وہ کچھ ہی عرصے میں یہ گھر چھوڑ کر جانے والے تھے، میں چاہتا تھا کہ اس کی دو چار تصویریں اتار لوں تاکہ میرے پاس اس کی یاد رہ سکے۔

عموماً زیادہ تر اسٹوڈیوز میں جو کیمرے استعمال کیے جاتے ہیں وہ ڈبل نہیں رفلیکس کیمرے ہوتے ہیں۔ ان کیمروں میں فوکسنگ لینس۔ فلم ایکسپوزر لینس۔ اپرچر، اسپیڈ اور ڈیٹنس سب کچھ ہوتا ہے ان کی مشہور اقسام پیشکا، مامیا، رول فلیکس، رولی کورڈ وغیرہ ہیں۔ ظاہر ہے اصغر کے پاس ایسا کیمرہ نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنا ذاتی کیمرہ جو دیا وہ 35۔ ایم ایم فیچر کیمرہ تھا۔ اصغر مجھے اس کے استعمال کا طریقہ کار سمجھانے لگا۔ میں نے بڑی مشکل اور مہارت سے فلم لوڈ کی اور پوری دنیا میں SLR کے نام سے مشہور کیمرے کو گھر لے آیا۔

میں نے ذرا بھی تجاہل سے کام نہ لیا اور اگلے ہی دن میں نے اپنا کام شروع کردیا۔ میں نے اس بات کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا کہ نازو کو اس بات کا پتہ نہ چل پائے کہ میں اس کی تصویریں اتار رہا ہوں۔ میں نے اس کی تقریباً دس تصویریں اتاریں، میں نے جتنی بھی تصویریں اتاریں تھیں وہ سبھی اس کے آنے جانے کی تھیں البتہ اس کی تصویر بالکل سامنے سے اتارنے میں بھی کامیاب رہا تھا گو کہ اصغر کا کیمرہ پھٹیچر حالت کا تھا بہرکیف میں اس سے جس حد تک بھی ہوسکتا کام لے رہا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ میں جو تصویریں بنا رہا ہوں وہ بن پائیں گی بھی یا محض سیاہ ہوکر سامنے آجائیں گی (کیونکہ کیمرے کی حالت ایسی ہی تھی)

اگلے دن بھی میں نے یہی طریقہ اپنایا اور ساری کی ساری ریل ختم کردی۔

رات کو میں نے کیمرہ اصغر کے حوالے کردیا۔ اگلے چند دن بہت تیزی سے گزر گئے۔ پھر وہ لمحہ آگیا جس کا ذہنی طور پر مجھے بہت پہلے سے انتظار تھا۔ میں لب بام سے ان کے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا اچانک نازو کا چھوٹا بھائی چھت پر چڑھا، وہ سیدھا ٹی وی کے اینٹینا کی طرف بڑھا تھا۔ اس نے اس کی تار کھولی اور اینٹینا کو بھی اتار لیا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے اور میرے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں جان چکا تھا کہ یہ لوگ اپنا گھر چھوڑ کر جارہے ہیں۔

میرا پیار، میری محبت، میری نازو مجھے چھوڑ کر جارہی تھی۔ میرا پورا وجود لرزنے لگا، میں چھت پر ہی اکڑوں بیٹھ گیا ورنہ شاید میں سر چکرانے سے نیچے گر پڑتا۔ گو کہ ذہنی طور پر میں اس چیز کے لئے بہت پہلے سے تیار ہوا تھا، مگر جب عملی طور پر یہ وقت آیا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

اکرام اینٹینا اتار کر نیچے اتر گیا۔ پھر میں نے دیکھا دیگر گھر والے بھی سامان کو سمیٹنے لگے تھے۔ ان ہی میں نازو بھی شامل تھی، وہ کپڑوں کی گٹھڑیاں بنانے میں محو تھیں۔ وہ کمروں سے اندر آ جارہی تھی ایسے ہی ایک لمحے میں اس کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ میں نے اسے رک جانے کا اشارہ کیا۔

پہلے تو اس نے پلو بچا کر نکلنا چاہا مگر پھر پتا نہیں اس کے دل میں کیا بات آئی کہ وہ رک گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ وہ یہ تھا کہ ”کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتی؟“

پہلے تو اس نے نفی میں گردن ہلائی پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے ایک بار پھر اشاروں سے کام لیا اور اس سے کہا کہ وہ کھڑکی میں آئے۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی کہ وہ نہیں آسکتی، پھر اس نے اشارے سے بتایا کہ کل ہم لوگ یہاں سے جارہے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر اسے کھڑکی پر آنے کا اصرار کیا۔

اس نے کہا۔ ”میں نہیں مل سکتی ابھی گھر والے ہیں۔“ پھر اس نے اشارے سے سمجھایا کہ میں رات کو بارہ یا ایک بجے اسے مل سکتا ہوں۔

مجھے اس کی اس بات سے بے حد خوشی ہوئی پر ساتھ یہ اس بات کا بے انتہا افسوس بھی تھا کہ وہ لوگ یہاں سے جارہے تھے۔

وہ ایک بار پھر سے کام پر لگ گئی۔ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ اسے بھی جی بھر کر دیکھ لوں مگر مجھے ایک ضروری کام کرنا تھا اس لئے میں رکا نہیں فوراً چھت سے نیچے اتر گیا۔

میں سیدھا اصغر کے پاس اس کی فوٹو شاپ پر پہنچ گیا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس سے ڈبل لینس رفلیکس کے مامیا کیمرے کی فرمائش کردی۔

سٹ پٹا گیا۔ ”اتنی جلدی......“ اس کے منہ سے محض اتنا ہی نکل سکا۔

میں نے کہا۔ ”جیسے بھی ہو...... تمہیں یہ کام ابھی کرنا ہے۔ میں کیمرہ کل تمہیں واپس کردوں گا۔“ میرے لہجے میں ڈھٹائی تھی۔

اسے مجبوراً میری بات ماننا پڑی، اتفاق سے اس وقت دوکان پر کوئی نہیں تھا سوائے ایک چھوٹے لڑکے کے اصغر نے اسے کسی کام سے باہر بھیجا اور کیمرے میں فلم ڈال کر اسے میرے حوالے کردیا۔ میں اسے لے کر گھر آ گیا اور احتیاط سے اسے سنبھال کر رکھ دیا۔ اب مجھے اس سمے کا انتظار تھا جب نازو مجھے گرین سگنل دے۔

میں رات 12 بجے تک بظاہر گھر والوں کو دکھانے کے لئے بستر پر لیٹا تو رہا مگر نیند میری آنکھوں میں نام کو نہیں تھی، گھڑی نے جیسے ہی رات 12 بجے کا گھنٹہ بجایا، میں احتیاط سے اپنے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں لب بام پر پہنچ گیا مگر میرا دل اندر سے ہزار گنا تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اگر گھر والے اس سمے مجھے لب بام پر کھڑا دیکھ لیتے تو میں انہیں اپنی یہاں موجودگی کا کوئی جواز پیش نہیں کرسکتا تھا۔ اب مجھے نازو کا انتظار تھا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ سامنے کا دروازہ کھلا اور نازو باہر آ گئی۔ اس نے صحن میں کھڑے ہوکر مجھے اپنے گھر میں آنے کا اشارہ دیا۔ وہ بیٹھک میں نہیں گئی تھی۔ غالباً بیٹھک میں کوئی سو رہا تھا شاید اس کا کوئی بھائی وغیرہ......

میں لب بام سے اتر کر نیچے بیرونی دروازے تک گیا اور احتیاط سے اسے کھول کر باہر گلی میں پہنچ گیا، اب میرے سامنے نازو کے گھر کی دس فٹ اونچی دیوار تھی جس پر میں جیسے تیسے چڑھا اور دوسری طرف پہنچ گیا۔

نازو نے مجھے دیوار سے نیچے اترنے میں مدد دی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کو کہا۔

نازو کے گھر کے سامنے کی طرف دو کمرے تھے۔ ان کے بائیں طرف تو کچن تھا جبکہ دائیں طرف کچا کوٹھا تھا۔ جو ڈھارے نما تھا، اس پر سال خوردہ چوبی دروازہ لگا تھا اور اندر 100 پاور کا بلب روشن تھا جو شاید گھر والوں نے اس لئے جلتا چھوڑ دیا تھا کہ کل انہیں یہاں سے چلے جانا تھا اس لئے بجلی کے زیاں کی انہیں کوئی پرواہ نہیں تھی۔

نازو مجھے ساتھ لیتی ہوئی سیدھی اس کمرے میں گھس گئی اور دروازے کو اندر سے بند کردیا۔

نازو کی اوڑھنی ذرا سرکی ہوئی تھی اور اس کے سینے کا زیرو بم دیکھا رہی تھی، مجھے اس کی آنکھوں میں مستی، شوخی اور وصل کا کرب اور نہ جانے کیا کیا کچھ نظر آ رہا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں......

مجھے جیسے خود پر کوئی اختیار نہ رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔ میری اس حرکت پر وہ ذرا سا جز بز تو ہوئی۔ مگر شاید وہ اس پر معترض نہ تھی، تھوڑی دیر کی حجت کے بعد اس نے خود کو مکمل طور پر میرے حوالے کردیا اور میں جی بھر کر اسے پیار کرتا رہا۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم حجاب کی سبھی فصیلوں کو پھلانگ جاتے، میں نے خود کو سنبھال لیا اور نازو نے بھی مجھے خود سے الگ کردیا۔ ہم دونوں الگ ہوکر یکساں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے جا رہے تھے۔ پھر پتا نہیں کب ہماری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نازو بے اختیار ہوکر ایک بار پھر میرے گلے سے لگ گئی۔ وہ تھوڑی دیر چمٹی رہی پھر میں نے اسے الگ کردیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ جیسے نازو میں بدن کی حدت عام لڑکیوں سے بہت زیادہ ہے۔

میرے ہونٹوں پر بے شمار شکوے اور شکایتیں تھیں، میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے مجھ پر اتنا ظلم کیوں کیا...... مجھے اتنا کیوں تڑپایا...... اور اس طرح

اب اچانک مجھے چھوڑ کر کیوں جا رہی ہو......؟ مگر میں نے کوئی بات نہ کی۔ وہ خود ہی نہایت آہستہ آواز میں مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ شاید میری توجہ اس کی باتوں کی طرف ہرگز نہیں تھی میں تو بس اس کے چہرے کی طرف دیکھتا جا رہا تھا شاید میں اس کے چہرے کو ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھوں میں بھر لینا چاہتا تھا کہ میں پھر کبھی اس چہرے کو دیکھ پاؤں یا نہیں......

نازو جب اپنی باتیں ختم کرچکی تو میں نے کہا۔ ”تم مجھے اپنا فیصل آباد کا ایڈریس دے دو، میں تمہیں ملنے آؤں گا۔“ میں نے اتنا کہا اور پھر سے اس کے بدن کی حدت پر غور کرنے لگا۔

نازو میری بات سے سٹپٹا گئی۔

”ایڈریس......“

وہ اپنے ہاتھ ملنے لگی۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ ہماری کوئی دشمنی وغیرہ چل رہی ہے۔ ہمارے وہ دشمن ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک بھی آ پہنچے ہیں، اب میں تمہیں اپنا پتا کیا دوں؟“

”جو بھی ہے بہرحال تم مجھے اپنا پتا تو دو۔“ میں نے لجاجت سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں اپنا اور اپنی نانی کے گھر کا پتا دے دیتی ہوں۔“ یہ دونوں پتے الگ الگ تھے۔ بہرحال اس نے دے دیے۔ میں نے انہیں احتیاط سے پاکٹ میں سنبھال لیا۔ میں نے اپنا کیمرہ سنبھال کر سیدھا کرلیا۔

نازو نے حجت کی۔ ”یہ مناسب نہیں۔“

مگر میں کہاں ماننے والا تھا اس کی argument کو!

تھوڑی تکرار کے بعد وہ مان گئی۔ میں نے ہر زاویے سے اس کی تصویریں، دو تین اتاریں میں نے کیمرے کو آٹو پر سیٹ کر کے خود بھی اس کے ساتھ اتاریں، میں نے کیمرے کی ساری فلم ہی اس پر ختم کردی۔

اس کے بعد ایک بار پھر میں اسے دیر تک پیار کرتا رہا۔ جب وقت فراق آیا تو وہ رونے لگی۔ اس کے چہرے پر ایسی ویرانی تھی جیسے روئے بہار سے پہلے خزاں کے عالم میں گلستانوں میں نظر آتی ہے۔ وہ مجھ سے چمٹی تو جیسے جدا ہونا ہی بھول گئی۔ اسے تو جیسے گوند لگ گئی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے خود سے الگ کیا۔ اس کی آنکھوں کے چشمے بڑی روانی سے پانی اگل رہے تھے۔ وہ بولی تو اس کے حلق میں گولا سا اٹک گیا۔ ”یہ ہماری آخری ملاقات...... ہے جانو! یہ ہماری آخری......“ وہ پھر تسلسل سے رونے لگی۔

”تم پریشان نہ ہو۔“ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ ”میں تم سے ملنے آؤں گا۔“

اس کی آنکھوں میں پتا نہیں کیا تھا بس وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی۔ اور میں وہاں سے نکل آیا۔

یہ نازو سے میری پہلی اور آخری بھرپور ملاقات تھی۔ اگلے دن انہوں نے گاڑی پر اپنے گھر کا سامان لادا اور یہاں سے چلے گئے۔

نازو کے جانے سے جیسے میری دنیا اندھیر ہوگئی۔ میں ویرانوں میں بھٹکنے لگا، میرے دل کو ایک پل کو بھی قرار نہ آیا تھا اسی اثناء میں 15 دن گزر گئے، مجھے ان دونوں فلموں کی یاد آئی جن میں نازو کی تصویریں تھیں۔ میں نے وہ دونوں فلمیں اصغر کے حوالے کردیں اور اسے دن کو ڈیولپ کرنے کو کہا۔

اس نے کہا۔ ”ان فلموں کو ذاتی ڈارک روم میں ڈیولپ کرنا پڑے گا۔“ یہ ذاتی ڈارک روم ظاہر ہے اس کے گھر میں تھا، وہ مجھ سے فلمیں لے گیا اور کہہ گیا کہ ایک دو دن تک مجھے تصویریں مل جائیں گی۔

زندگی کی گاڑی ایک بار پھر سے معمولات پر چل رہی تھی مگر میرے اندر جیسے کوئی خلاء سا تھا، یہ خلاء ظاہر ہے نازو تھی! جسے میں بھول نہیں پایا تھا، مجھے نہ جانے کیا ہوا، نازو کی یادوں نے بہت زیادہ شدت پکڑی اور میں خود سے بے خود ہوگیا، میں نے کام سے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر چھٹی کی اور سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ جہاں سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر سیدھا فیصل آباد پہنچ گیا۔

فیصل آباد میرے لئے اجنبی شہر تھا۔ بہر حال میں لوگوں سے پوچھتا پوچھتا اس مقام تک پہنچ گیا جہاں نازو کے بقول ان کا گھر تھا۔

وہاں پہنچ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہاں انسانی آبادی تو کیا دور دور تک کوئی بھی ذی روح نظر نہ آرہا تھا۔ اس جگہ کی ایک خاص نشانی وہاں پر موجود قبرستان تھا جس کے نام کے سہارے میں یہاں تک پہنچا تھا۔

میں سخت دل برداشتہ ہو کر وہاں سے الٹے قدموں لوٹ پڑا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ کہ یہ کیا ماجرا ہے......؟ بہر حال ابھی میرے پاس ایک اور جگہ تھی جانے کے لئے۔ وہ جگہ ”جبہ گاؤں“ جہاں نازو کی نانی رہتی تھی۔

ایک بار پھر پوچھنے کا سلسلہ شروع ہوا اور میں ایک طویل سفر کے بعد جبہ گاؤں بھی۔ پہنچ گیا۔ جبہ گاؤں کیا تھا محض ایک چھوٹا سا دیہات تھا جس کی آبادی سینکڑوں نفوس پر رہی ہوگی نازو نے مجھے اس کے بارے میں سمجھایا تھا کہ گاؤں کے مرکزی حصے میں پہنچنے کے بعد مشرقی جانب گاؤں سے باہر نکل کر ذرا آگے میری نانی اور دیگر خاندان والوں کے گھر ہیں۔

نازو نے مجھے اپنے ماموں کے نام کالے خان، اور یوسف خان بتائے تھے۔ خان کا لفظ ان کے ناموں کے ساتھ عرفیت کے طور پر لگے تھے۔ مجھے اس چیز کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ میں کس سے ان کے بارے میں باز پرس کروں۔ میں گاؤں کے مرکزی حصے سے ہوتا ہوا سیدھا مشرقی سمت گاؤں سے باہر نکل گیا۔ تھوڑا ہی آگے جا کر مجھے رک جانا پڑا۔ نہ صرف میں حیرت کی انتہاؤں میں ڈوب گیا تھا بلکہ اب کی بار جس بری طرح لرز بھی گیا تھا۔ میرے سامنے ایک بار پھر قبرستان تھا۔ میں اتنا زیادہ خوفزدہ ہوا کہ ایک قدم بھی نہ آگے بڑھ سکا اور واپس ہو گیا۔ میں نے اس چیز کی بھی ضرورت محسوس کی کہ گاؤں والوں سے ہی کالے خان اور یوسف خان کی بابت معلوم کروں۔

ایک بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہی تھی کہ نازو نے عین جاتے سے اتنے سنجیدہ حالات میں اور زار زار روتے ہوئے میرے ساتھ ایسا مذاق کیوں کیا......؟

ایک سوال بار بار میرے ذہن میں یہ بھی آرہا تھا کہ نازو نے واقعی میرے ساتھ مذاق کیا تھا یا کہ پھر یہ حقیقت تھی......؟

میرے دل میں ایک انجان سا خوف بیٹھ گیا تھا۔ میں واپسی راستے بھر اس بارے میں سوچتا رہا۔ پریشانی نے مجھے بری طرح جکڑ لیا۔ گھر پہنچتے پہنچتے میں پوری طرح بخار میں تپ رہا تھا۔ حال یہ رہا کہ گھر والوں کو محلے ڈاکٹر کو گھر بلانا پڑا جس نے مجھے دو انجکشن لگائے اور میڈیسن وغیرہ دے کر چلے گیا۔

اگلے دن میری حالت قدرے سنبھل گئی مگر میں اس پوزیشن میں نہ تھا کہ کام پر جا سکوں سو دوسرے دن بھی میری تعطیل رہی۔ میں سارا دن نازو کے بارے میں سوچتا رہا۔ حالات جو بتا رہے تھے میرا ذہن انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں ہو پا رہا تھا۔ شام تک میری حالت مزید سنبھل گئی اور میں قدرے منطقی انداز میں سوچنے لگا۔

سات بجے کے قریب باہر دروازے پر دستک ہوئی اماں نے جا کر دیکھا اور آ کر مجھے بتایا کہ اصغر آیا ہے میں دروازے تک گیا۔ دیکھا تو اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا اور وہ بری طرح پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے نہ تو میرا حال احوال پوچھا اور نہ ہی اپنا بتایا۔ بس اتنا کہا کہ میرے ساتھ چلو تم سے ضروری کام ہے۔“

میں نے اندر جا کر چپل پہنی اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ میں ابھی بخار کی نقاہت میں تھا، میرا بولنے کو بالکل بھی دل نہ چاہ رہا تھا اس لئے میں نے پوچھا تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ وہ سیدھا مجھے اپنے گھر لے گیا جو قریب ہی تھا، اس نے اندر جا کر پردہ کروایا اور مجھے اندر بلا لیا۔ وہ مجھے اپنے سونے کمرے میں لے گیا۔ یہاں ایک کونے میں اس نے چپ بورڈ کی مدد سے پارٹیشن بنا کر ایک چھوٹا سا ڈارک روم بنا رکھا تھا، وہ مجھے اس طرف لے جانے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی انہونی بات ہے

جو وہ مجھے یہاں تک لایا ہے۔

ڈارک روم کے دروازے پر پہنچ کر اس نے کہا۔ ”مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ مجھ سے پروسسنگ میں کوئی غلطی ہوئی ہے یا پھر یہ حقیقت ہے......؟“

مختصر سے ڈارک روم میں ہلکی لائٹ کی ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ ایک طرف ڈیولپر، بلیچ فکسر، اسٹیبلائزر جیسے کیمیکلز بوتلوں میں پڑے تھے، ساتھ ہی پیپر کٹر اور پیپر ڈشز وغیرہ رکھیں تھیں۔ سامنے کے رخ پر ایک چھوٹا سا کاؤنٹر نما میز پڑا تھا اس کی داہنی طرف ڈوری نما چھوٹی سے الگنی ڈارک روم کی دیواروں سے ادھر سے ادھر بندھی ہوئی تھی۔ اس پر کلپ کی مدد سے دھلی ہوئی تصویروں کو سوکھنے کے لئے لٹکایا گیا تھا۔ (اگر گلیزنگ فیشن نہ ہو تو تصویروں کو ایسی صورت میں سوکھایا جاتا ہے)

اصغر نے ایک تصویر اتاری جو کافی حد تک سوکھ چکی تھے۔ اس نے تصویر کو میز پر رکھا اور ٹارچ سے اس پر روشنی ڈالی۔

”یہ دیکھو......!“

میں نے سر جھکا کر تصویر کو غور سے دیکھا، تصویر میں نازو کے گھر کے صحن کا منظر تھا۔ یہ تصویر میں نے اہم نیچر کیمرے سے اپنے گھر کی چھت سے اتاری تھی۔ اس تصویر میں نازو کے گھر کے صحن کا صاف منظر تھا۔ مگر نازو اس میں کہیں بھی موجود نہیں تھی، ابھی میں صورت حال کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پایا تھا کہ اصغر نے ایک اور تصویر اتار کر میرے سامنے رکھی، اس میں بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ اصغر نے ایک اور تصویر رکھی...... پھر ایک اور...... اس نے پے در پے کئی تصویریں میرے سامنے رکھ دیں۔ نازو کسی میں بھی موجود نہیں تھی۔ نہ تو 35اہم نیچر کیمرے سے اتری ہوئی تصویروں میں اور نہ ہی یاشلکس کے ماما میں......

تین تصویریں میں نے کیمرے کو آٹو سیٹ کر کے نازو کے ساتھ بنائی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان تینوں تصویروں میں، میں تو موجود تھا مگر نازو نہیں تھی۔ ایک تصویر میں، میں نے اوپر سے ہاتھ گھما کر نازو کے شانے پر رکھا تھا۔ ایک تصویر میں، میں نے نازو کے گلے میں بانہیں ڈالی تھیں اور آخری تصویر میں، میں نے نازو کو گلے سے لگا رکھا تھا۔ ان تینوں تصویروں میں میرے تو پوز ویسے کے ویسے تھے مگر نازو موجود نہیں تھی۔

مجھے لگا کہ میں چکرا کر گر جاؤں گا اس لئے میں جلدی سے میز پر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر میں نے اصغر سے پوچھا......

”یہ کیا ماجرا ہے......؟“

وہ بولا۔ ”یہی تو میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں......؟“

مجھے وہ لمحات یاد آرہے تھے جب میں نازو کو گلے سے لگا رہا تھا اور اس سے بوس و کنار کر رہا تھا مجھے تب نازو کے وجود میں غیر معمولی طور پر حدت محسوس ہو رہی تھی۔ اب یہ بات مجھ پر پوری طرح آشکار ہو چکی تھی کہ میرا جس لڑکی سے بوس و کنار ہوا تھا وہ کوئی غیر انسانی مخلوق تھی جنہیں اپنی دشمن داری کی وجہ سے انسانی روپ میں چھپنا پڑ رہا تھا۔

اصغر نے ایک بار پھر مجھ سے پوچھا۔

”یہ کیا ہے......؟“

”مجھے نہیں پتا......؟“ میں نے جلے کٹے انداز میں کہا اور وہاں سے واپسی گھر لوٹ آیا۔ گھر پہنچتے ہی ایک بار پھر بخار نے مجھ پر غلبہ پا لیا اور تقریباً پورا ایک ہفتہ نیم غنودگی میں رہا۔

حالت سنبھلنے کے بعد میں نے ایک بار پھر فیصل آباد جبہ گاؤں گیا اور وہاں سے کالے خان اور یوسف خان کے بارے میں معلوم کیا پتا چلا کہ یہاں کوئی سرے سے رہتا ہی نہیں۔ دل چاہا کہ قبرستان چلا جاؤں اور ان کو چیخ چیخ کر آوازیں دوں مگر ہمت نہ ہوئی۔

میں اب بھی نازو سے پیار کرتا ہوں اور کبھی کبھی فیصل آباد کے دور، ان قبرستانوں میں چلا جاتا ہوں کہ شاید وہ مجھے مل جائے۔
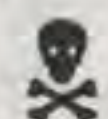
خون کا اثر

اقصیٰ رباب۔ فیصل آباد

اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں کیا یہ حقیقت ہے کہانی پڑھ کر دیکھئے

جان پیٹر اپنی لیبارٹری میں موجود نظروں کے سامنے پڑے زہر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی آدھی عمر مختلف زہروں پر ریسرچ کرتے گزار دی تھی۔ دنیا میں شاید ہی کوئی اور انسان ہو جو اس سے بڑھ کر زہروں اور ان کے اثرات کا علم رکھتا ہو۔ cyanide کیسے خون کے سرخ ذرات کو آکسیجن جذب کرنے سے روکتی ہے۔

stychnine کیسے سینٹرل نروس سسٹم پر اٹیک کر کے 10 سے 20 منٹ کے اندر موت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ arsenic کیسے خون کی الٹیاں لانے کا باعث بنتی ہے۔ snake venom کیسے اکٹر کرتی ہے، آنکھوں اور ناک سے کیسے خون جاری ہو جاتا ہے۔ ان سب کے بارے میں جان کی معلومات حتمی تھیں۔ اب وہ اس زہر کا تریاق ڈھونڈنے کی تگ و دو میں تھا۔

اس وقت بظاہر وہ cyanide پر نظریں جمائے بیٹھا تھا مگر اس کا ذہن اپنی بیٹی کی صبح بات میں الجھا ہوا تھا۔ آج اس کی بیٹی کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔

آج صبح ناشتے کی میز پر بھی وہ لیٹ آئی تھی۔ اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہی اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ عنقریب پال سے شادی کرنے والی ہے۔ پال ایک پیشہ ور قاتل تھا۔ جو اپنی منہ مانگی رقم کے عوض کسی کو بھی قتل کر سکتا تھا۔ اور قتل کے نئے نئے طریقے بھی ڈھونڈ نکالتا۔ جان نے جب یہی بات اپنی بیٹی انجلینا سے کہی تو اس نے بڑے پرسکون انداز میں کہا۔

"ڈیڈ! وہ ذہین ہے۔ قتل کسی احمق انسان کا تو کام نہیں ہے۔ مجھے اس کی ذہانت نے قائل کیا ہے۔"

جان نے اسے گھور کر دیکھا۔ "میری زندگی میں تو ایسا ممکن نہیں۔"

انجلینا کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے کہہ رہی ہو اب ایسا ہے تو چلیں ایسا بھی منظور ہے۔

رات کے وقت جان اپنی ڈائری لکھ رہے تھے انجلینا کے کمرے میں چائے کے دو کپ لے کر داخل ہوئی۔ اور چہکتی آواز میں بولی۔ "ڈیڈ آج میرا بہت دل چاہ رہا ہے کہ آپ کے ساتھ چائے پیوں۔"

جان نے کھوجتی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر انجلینا کے چہرے پر صبح والی بات کا شائبہ تک نہ تھا۔ جان مطمئن ہو گئے اور چائے پینے کے ساتھ دونوں نئی اور ادویات کے بارے میں ڈسکس کرتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد انجلینا اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی مگر آج اس کی چال میں عجب سرشاری تھی۔ قدم

جیسے زمین کی بجائے ہوا پر تھے۔ سب کچھ پا لینے کا احساس اس کی آنکھوں میں روشنی بن کر پھوٹ رہا تھا۔ آج ساری کائنات اسے اپنے قدموں کے نیچے لگ رہی تھی۔

صبح حسب معمول بیدار ہوئی۔ وقت مقررہ پر ناشتے کی میز پر پہنچی۔ مگر اس کا باپ ابھی میز پر موجود نہیں تھے۔ اس نے ملازم سے پوچھا۔ ملازم تو خود حیران تھا کہ آج پہلی بار جان ناشتے پر لیٹ ہوا۔

جب جا کر دیکھا تو جان مردہ حالت میں اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس کی چیخ سن کر انجلینا بھی کمرے میں پہنچ گئی۔ جان کو مردہ حالت میں دیکھ کر وہ بھی اپنا ضبط کھو بیٹھی سب جان کی اچانک موت کا سبب ہارٹ اٹیک سمجھ رہے تھے۔

جان کی موت کو پندرہ دن گزر چکے تھے۔ انجلینا اپنے باپ کے لئے اداس تھی۔ وہ اپنے باپ سے متعلق اپنی یادیں ڈائری میں دیکھ رہی تھی کہ اچانک اسے وہ ڈائری یاد آ گئی جو جان تب لکھ رہے تھے جب وہ چائے لے کر کمرے میں گئی تھی۔ جان کے کمرے میں آ کر اس نے وہ ڈائری تلاش کرنی شروع کر دی۔

دو گھنٹے کی کوشش کے بعد اسے وہ ڈائری کپڑوں کی الماری سے ملی۔ انجلینا اسے اپنے کمرے میں لے آئی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ پڑھتی جا رہی تھی اور اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔

وہ ایک قاتل کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ اسے ایک فلاحی ادارے کے دروازے پر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت جان نے دیکھ لیا۔ وہ بچی کو اس دروازے سے اٹھا کر اپنے گھر لے آئے۔ جان کی ساری ڈائری انجلینا سے بھری پڑی تھی، اب اس نے پہلا قدم اٹھایا؟ کب پہلا لفظ بولا؟ کب پہلے دن اسکول گئی؟ اسے کیا پسند ہے اور کیا نہیں۔ جان کی پوری ڈائری پر انجلینا کی زیست بکھری پڑی تھی جیسے جان کی اپنی زندگی صرف انجلینا کی خوشی تھی۔

انجلینا کو احساس بھی نہ ہوا کہ کب آنسو اس کی آنکھوں سے جاری ہو گئے۔ ندامت کے۔ ملال کے..... اسے حد سے زیادہ شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ دل جیسے پھٹنے کو تیار تھا۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک زرد ہو گیا تھا۔ اب اس صفحے پر پہنچ چکی تھی جو جان نے سب سے آخر میں لکھا تھا۔

وہ آخری تحریر تھی۔ "انجلینا پال سے شادی کرنے کے لئے مجھے مارنے پر بھی تیار ہے۔ مگر میں خود اپنی بیٹی کے راستے سے ہٹ رہا ہوں۔ میں نے ایک نئی زہر ایجاد کر لی ہے جسے دنیا کی کوئی پوسٹ مارٹم رپورٹ ثابت نہیں کر سکتی۔ اور اس کا تجربہ خود پر آزما رہا ہوں آج۔ میں نے اپنی تربیت میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔

مگر آج تربیت ہار گئی اور خون کا اثر جیت گیا۔

مگر میں اپنی بیٹی کو تباہی کے راستے پر جاتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے اس کا ہنستا چہرہ اپنی آنکھوں میں لئے جا رہا ہوں۔"

یہ تحریر پڑھتے انجلینا سسکیوں سے رو رہی تھی۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے ایک عظیم باپ کو کھو دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی پال کا فون آ گیا۔ وہ آج بڑے موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔ انجلینا سے بڑے خوبصورت الفاظ استعمال کر رہا تھا مگر آج یہ سارے الفاظ انجلینا پر بے اثر ہو چکے تھے۔

جب پال خاموش ہوا تو انجلینا نے سرد الفاظ سے اسے آئندہ کال نہ کرنے کو کہا۔

پال کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ جو اس کے لئے مری جا رہی تھی آج اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ذہن نے ایک دم الارم بجایا کہ کہیں اسے میری باقی گرل فرینڈز کا تو پتا نہیں چلا؟ پھر لڑکھڑاتی آواز میں انجلینا سے کال نہ کرنے کی وجہ پوچھی۔

انجلینا نے مدھم آواز سے کہا۔ "میں تربیت پر خون کو جیتنے نہیں دوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پال حیران ہو کر فون کو دیکھنے لگا۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ آتی بھی کیسے۔

قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

کوئی نئی چوٹ پھر سے کھاؤ اداس لوگو
کہا تھا کس نے کہ مسکراؤ اداس لوگو
گزر رہی ہیں گلی سے پھر ماتمی ہوائیں
کواڑ کھولو دیئے بجھاؤ اداس لوگو
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

یہ دوریاں یہ بے بسی، بے تابیاں کب ختم ہوں
یہ زندگی، یہ بے بسی، بے چینیاں کب ختم ہوں
یہاں ہر قدم پر اک جال ہے نئی نفرتوں کا ملال ہے
یہ محبتیں کہاں کھوگئیں، یہ پریشانیاں کب ختم ہوں
(عثمان غنی......پشاور)

کسی کی آنکھوں میں خواب سجا کے ہم
پیار کی تعبیر ڈھونڈتے رہے ہیں ہم
جو کھوگیا تھا تیز ہواؤں میں تو پھر
رہ رہ کے اسے تلاش کرتے رہے ہیں ہم
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

کوئی صدمہ ضروری تو نہیں
یونہی رونے کو بھی جی چاہتا ہے
مرادوں سے جنہیں پایا ہو ان سے
جدا ہونے کو بھی جی چاہتا ہے
(اذان عزیز......ٹنڈو آدم)

اس نے پوچھا درد ہے کتنا
میں نے کہا سات سمندر جتنا
اس نے کہا کھایا فریب کتنا
میں نے کہا دنیا کے لوگوں جتنا
(شگفتہ جبین......اوکاڑہ)

خدا کرے تیری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
دیار وقت سے تو شاداں گزرتا رہے
میں مانگتی ہوں تری زندگی قیامت تک
ہوا کی طرح سے تو جاوداں گزرتا رہے
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈو الہ یار)

حیران ہوں سارے شہر کا کردار دیکھ کر
سب جھک گئے ہیں شاہ کا دربار دیکھ کر
رنگ اڑ گیا ہے رات کے چہرے کا کیوں عدم
سہما ہوا ہوں صبح کے آثار دیکھ کر
(عابد علی......لاہور)

تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلہ لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
(انتخاب: راجہ باسط مظہر......گاؤں حامد جھنگی)

قائم رہا ہمیشہ میرا ذوق بندگی
میں تجھ کو توڑ کر بھی تجھے پوجتا رہا
(عابدہ انجم......حیدر آباد)

اب ذوق بندگی کو سجدوں میں کیا ملے گا
پتھر کی مورتوں کے بت خانے رہ گئے
(فائزہ......کراچی)

کسی کا کیا جو قدموں میں جبین بندگی رکھ دی
ہماری چیز تھی ہم نے جہاں چاہی وہاں رکھ دی
جو دل مانگا تو وہ بولے کہ ٹھہرو یاد کرنے دو
ذرا سی چیز تھی ہم نے خدا جانے کہاں رکھ دی
(ثانیہ......کراچی)

منزلیں ان کا مقدر کہ طلب ہو جن کو
بے طلب لوگ تو منزل سے گزر جاتے ہیں
جن کی آنکھوں میں ہوں آنسو انہیں زندہ سمجھو
پانی مرتا ہے تو دریا بھی اتر جاتے ہیں
(رضیہ عارف......کراچی)

میرے گھر کے لیل و نہار پر جو گزر گئی سو گزر گئی
ابھی چھوڑیئے! دل زار پر جو گزر گئی سو گزر گئی
میرے اشک نہ تو شمار کر کبھی تارے بھی کوئی گن سکا
تیرے شہر میں میرے پیار پر جو گزر گئی سو گزر گئی
(انیلہ غزل......حافظ آباد)

دور آنکھوں سے مری جس نے اجالے رکھے
خواب آنکھوں نے کبھی اس کے سنبھالے رکھے
ساتھ خوشیوں نے شب و روز نبھایا اس کا
ہم نے یہ سوچ کے دکھ درد سنبھالے رکھے
میری آنکھوں کو بھی کردے گا وہ روشن دن
جس نے آکاش کے دامن میں ستارے رکھے
رات ساون کی طرح ٹوٹ کے برسی آنکھیں
رات بھر ہم نے خطوط اس کے نکالے رکھے
دل کے زخموں کو کسی طور بھی بھرنے نہ دیا
ہم نے محفوظ محبت کے حوالے رکھے
(حکیم خان حکیم......کامل پور موسیٰ اٹک)

عشق میں قائم کردی مثال میں نے
وفا کے رشتے کو کردیا لازوال میں نے
دل توڑنا پرانی رسم ہے زمانے کی
اس رواج کو کردیا خواب و خیال میں نے
رات بھر وہ تھا میری بانہوں میں جکڑا
بچھادیا اس پر مدہوشی کا جال میں نے
تیری جدائی میں ہمیں غموں کے سوا کچھ نہ ملا
اب لوٹ کر آؤ کردیا ہے دیوانوں سا حال میں نے
تیرے پیار میں لٹ گیا بدنصیب واجد
تیرے انتظار میں کردیا ایک پل کو سال میں نے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

رسوائیوں کے ڈر سے چھوڑدیا جلنا ہم نے
اپنے ہونٹوں پہ اب کوئی بھی شکایت نہیں
کس کو سناؤں جاکے میں داستان غم
بے درد زمانے میں اب کوئی چاہت نہیں
دکھ اٹھائے تھے کہ روشنی ہوگی ہر طرف
اپنی زندگی میں سکھ کی کوئی رات نہیں
چاہا تھا کہ تجھ سے پھر ملاقات ہوجائے
اپنی قسمت میں پھر سے کوئی بھی راحت نہیں
تجھے چاہا تھا زندگی میں جو کبھی ہم نے
تیری باتوں میں آج کوئی بھی صداقت نہیں
مل کے بچھڑ گئے جو زندگی کے موڑ پر جاوید
ان کی ہم پہ پھر کوئی بھی نظر عنایت نہیں
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

تیرے حرف لب کا طلسم تھا میری آب تاب میں رہ گیا
وہ کسی گلاب کا جسم تھا جو میری کتاب میں رہ گیا
میری بات بات میں روشنی، میرے حرف حرف میں دلکشی
تو میرے شریک وصال جان، میری ہر کتاب میں رہ گیا
کوئی پھول بن کر بکھر گیا، کوئی بات بن کر بکھر گئی
نہ سوال کوئی لبوں پہ ہے نہ گلا جواب میں رہ گیا
تجھے کیا بتائیں کہ ہوا، وہ سرور رقص وفا گیا
نہ گناہ میں رہی بات وہ، نہ مزا ثواب میں رہ گیا
(انوری رمضان......پنڈ دادنخان)

تقدیر میں لکھا تھا بچھڑنا پل بھر کے لئے
اشک ریز تو ہم بھی تھے دو پل کے لئے
اسے تو جانا تھا وہ تو چلے گئے
پھر آیا نہ کبھی لوٹ کر پل بھر کے لئے
امید، آرزو، خواہش ہے اسے پانے کی
کاش! جھوٹ ہی کہہ دیتا اپنا پل بھر کے لئے
میرا عزیز تھا دل جو اسے منسوب کیا
ہم ارباب وفا نبھالیتے دو پل کے لئے
ہم تو طلب گار ہیں اس محبت کے لئے
ذرا ساتھ تو دے جا پل بھر کے لئے
جو مستقیم تھے صدیوں تیری چاہتوں کے صنم
ساقی دو گھونٹ ہی پلا جا پل بھر کے لئے
(مستقیم احمد......کوٹ رادھا کشن)

آنسو بہانا یاد میں عادت سی بن گئی ہے
تجھے خواب میں بلانا عادت سی بن گئی ہے
یادیں ستا رہی ہیں ہر لمحہ میرے ساجن
تیرے غم میں کھوئے رہنا عادت سی بن گئی ہے
پوری ہوئی نہ خواہش تنہا ہی رہ گئے ہیں
دل کو جلاتے رہنا عادت سی بن گئی ہے

دریا کے ساتھ رہ کر پیاسے رہے ہمیشہ
آنکھوں سے غم بہانا عادت سی بن گئی ہے
لوگوں کو اپنے دل کے کیا زخم میں دکھاؤں
غیروں میں مسکرانا عادت سی بن گئی ہے
دنیا کی ساری خوشیاں تیرا نصیب ساجن
اب غم سے ہی نبھانا عادت سی بن گئی ہے
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

کیا ہے مدینے کے پر کیف نظاروں کو
جنت بھی ترستی ہے طیبہ کے بہاروں کو
ماہتاب کو بھی چیرا، سورج کو بھی الٹایا
میرا بھی سلام ان کی انگلی کے اشاروں کو
چہرے کی یہ تابانی عالم یہ پسینے کا
پھولوں کو مہک بخشی روشن کیا غاروں کو
سرکار کی یہ نسبت کافی ہے مجھے ہر دم
کیا کیجئے اب لے کے دنیا کے سہاروں کو
(سنبل ماہین طٰہٰ......سرگودھا)

وقت رخصت تیرا مجھ سے لپٹ جانا
پھر اچانک وہ ارادہ سا بدل جانا
وہ میرا پوچھنا کس طرح گزرے دن
روتے روتے اچانک تیرا سنبھل جانا
وہ میرا پھر سے ملنے کی تمنا کرنا
تیرا کہنا کہ تم مجھ کو بھول جانا
کیسے پھولوں میں گزرے ہوئے پل
وہ لڑنا جھگڑنا اور وہ تیرا منانا
کیسے کہہ دوں یہ محبت نہیں کچھ اور ہے
تیرا چھپ چھپ کے دیکھنا اور نظریں چرانا
میں نہ کہتا تھا کہ محبت دکھ دے گی نوری
تیرا کہنا کہ محبت ہی تو ہے جان جاناں
(غلام نبی نوری......کھڈیاں خاص)

زمین کی پیاس جو دیکھی مچل گیا پانی
فلک کی آنکھ سے چھم چھم برس پڑا پانی
ہمارے ضبط کا بند ٹوٹنے کی دیر تھی
بہا کے لے گیا سب کچھ رکا ہوا پانی
جو کل تھا ریت کے چادر میں منہ چھپائے ہوئے
وہ بہہ رہا ہے کناروں کو روندتا پانی
یہ برف پوش چٹانوں سے کہہ رہی تھی کرن
پگھل ہی جائے گا برسوں کا یہ جما پانی
ہماری بستی میں آیا تھا بن بلائے ہوئے
ہمارے جھونپڑے لے کر چلا گیا پانی
ہماری دید کو شاید کہ تم بھی نہ آسکو
ہمارے شہر کی گلیوں میں ہے کھڑا پانی
کوئی تو سانحہ گزرا ہے اس پر بھی ارشد
کہ پل دو پل میں ایسے بکھر گیا پانی
(انتخاب: کائنات بلوچ......کراچی)

زر کی ناموس کی رسموں سے بغاوت کرکے
کچھ نہیں پائے گا وہ مجھ سے محبت کرکے
بین کرتی ہوئی آنکھیں یہ پریشان زلفیں
اور کیا چاہتے ہو اس سے محبت کرکے
پھول تو پھول ہیں زخموں کے بھی نخرے ہیں یہاں
ہم نے دیکھا ہے بہت ان کی عبادت کرکے
جو کسی کے جبر پہ ہونٹوں کو سیا کرتے ہیں
ظلم کرتے ہیں وہ ظالم کی حمایت کرکے
دل کے صحراؤں کی ویرانیاں جاتی ہی نہیں
تیری یادوں نے بھی دیکھا ہے یہاں ہجرت کرکے
وہ میرے ہجر کو بھی کھیل سمجھتا ہے وہی
لوٹ جائے گا کسی روز شرارت کرکے
(انتخاب: راجہ باسط مظہر......گاؤں حامد جھنگی)

سنگ شبنم کے رونے کی عادت نہ رہی
ہمیں اس دنیا سے کوئی لگاوٹ نہ رہی
آندھیوں نے کرنوں سے الجھنا ہی تھا
سورج کو بادلوں سے کوئی شکایت نہ رہی
لبوں پر تو آجاتی ہے مسکان کبھی کبھی
پر چہرے پر وہ پہلی سی سجاوٹ نہ رہی
جب جان لیا کہ کانچ کے بنے ہوئے ہیں ہم
تو پتھروں پر سر جھکانے میں ندامت نہ رہی
فی الحال تو اس جان سے کوئی الفت نہ رہی
(افشاں رمضان......سرگودھا)

آج ہلکی ہلکی بارش ہے
آج سرد ہوا کا رقص بھی ہے
آج پھول بھی نکھرے نکھرے ہیں
آج ان میں تیرا عکس بھی ہے
آج بادل کالے گہرے ہیں
آج چاند پہ لاکھوں پہرے ہیں
کچھ ٹکڑے تیری یادوں کے
بڑی دیر سے دل میں ٹھہرے ہیں
آج ذہن پہ تم ہی چھائے ہو
آج یاد بہت تم آئے ہو
(قاسم رضا......چنیوٹ)

یہ پیار نہیں آساں صدیوں کی مسافت ہے
جگر کی طرح ہے یہ شیشے سی نزاکت ہے
یہ ہجر کی فصلیں ہیں جو کٹتی ہیں صدیوں میں
یہ پیار نہیں ہے کھیل محبت کی شرارت ہے
اس اپنی اٹھالو تم اپنے ہی کندھوں پر
یہ ہی دستور زمانہ ہے بس یہی شرافت ہے
احساس کی کھیتی میں پل مشکل سے ملتا ہے
صدیوں کی یہ محنت ہے عمروں کی ریاضت ہے
ر منزل یہ محبت کی تکتی ہے بڑی مشکل ہے
سوں کا یہ رستہ ہے صدیوں کی مسافت ہے
(منیر احمد ساغر......میاں چنوں)

ں اختلاف موقف پر حیرتیں کیسی
اپنی آنکھ، ہم اپنی نظر سے دیکھتے ہیں
ساب وصل چھٹا، ہجر کا شمار کیا
بار طوق وفا، راہ میں اتار گیا
تاب ختم ہوئی اور مجھ کو لکھنا ہے
ا نکالو تو، بچے ہیں حاشیے کتنے
گیا تو تیرے ساتھ گئی، لذت زیست
اس کی رسم میں، تا عمر نبھاؤں کیسے
(انتخاب: محمد آصف شہزاد الہ آبادی......ٹھینگ موڑ قصور)

ر کو بھی چاہئے ایک پیارا سا گھر
ں میں ہو تو سدا میرا ہم سفر
خوشیاں ہمیں ملیں اس گھر میں بے شمار
چاندنی راتوں میں پیار کا اک اثر
تم سے مل کے لگا، مل گیا اک جہاں
تم نے بھی مانگا تھا مجھ سے پیارا گھر
آرہا ہوں تیرے پاس، اب میں اپنے گھر
ہے جہاں پر تو میری کب ہو منتظر
جب میں آؤں، تو میری تم اتارو نظر
میں تیرا ہوا ہوں، تیرے پیار کے لئے در بدر
مجھ کو بھی چاہئے، ایک پیارا سا گھر
جس میں ہو، تو سدا میرا ہم سفر
(عثمان غنی......پشاور)

جانے کیسی عجیب لڑکی تھی کل سرراہ جو ملی تھی مجھے
مجھ سے پوچھا میں کیسی لگتی ہوں میں نے جب اس کو غور سے دیکھا
بولی ایسا گماں ہوتا ہے جیسے آج اتفاق سے مجھ کو
آپ نے پہلی بار دیکھا ہے
آپ اپنے دھیان سے نکلیں یعنی جھوٹے گیان سے نکلیں
آپ جس طرح مجھ کو چھپ چھپ کر دیکھا کرتے ہیں ہر گھڑی ہر پل
اس سے میں اچھی طرح واقف ہوں
پھر مرا ہاتھ ہاتھ میں لے کر ایک جھٹکے سے مجھ کو کھینچ لیا
اور بولی ذرا خیال کریں یہ سڑک ہے گلی نہیں اپنی
میں اگر یوں نہ کھینچ لیتی تو کار کی زد میں آگئے ہوتے
ہست سے آپ ایک لمحے میں حرف معدوم ہوگئے ہوتے
میں یہاں بین کر رہی ہوتی آپ مرحوم ہوگئے ہوتے
میں نے اس سے کہا میں شاعر ہوں کھوئے رہنے کی میری عادت ہے
بولی اچھا تو آپ شاعر ہیں ہو نہ زحمت تو اتنا فرمائیں
میری آنکھوں پر میری پلکوں پر میرے ہونٹوں پر میرے عارض پر
میرے اس سرو قد سراپا پر میرے اس مرمریں سے پیکر پر
میری زلفوں کی ان گھٹاؤں پر میری ان جاں گسل اداؤں پر
دل نوازی پہ خوش کلامی پر جان لیوا سبک خرامی پر
حسن اور عاشقی کی سنگت پر میری سرخ و سفید رنگت پر
ہے کوئی بات جو کبھی تم نے ہے کوئی شعر جو لکھا تم نے
پھر مرا ہاتھ چھوڑ کر بولی
میری ان لاجواب باتوں پر آپ اس طرح سے نہ گھبرائیں
شعر ہر اک کے بس کی بات نہیں اچھے بچوں کی طرح گھر جائیں
(انتخاب: سونیا......کراچی)

دل میں تیری حسرت ہے
پیار کی کتنی شدت ہے
دکھ کیوں نہ ہو ان آنکھوں کو
اوجھل منزل الفت ہے
پھیکے پھیکے لفظ کسی کے
بکھری بکھری چاہت ہے
دیکھ تمہارے شہر میں اب تک
رسوا میری محبت ہے
تنہائی کے لمحے ساتھی
میری غموں سے سنگت ہے
پوچھنے والا کوئی نہیں ہے
کتنی اس کی ضرورت ہے
میں ہوں دکھی وہ خوش ہے گھر میں
رانا میری یہ قسمت ہے
(قدیر رانا...... راولپنڈی)

ہم کو انجام کی خبر تھی مگر
دوستی ان سے ہوگئی پھر بھی
چار سو آندھیوں نے گھیرا ہے
کیسی بستی ہے؟ سوگئی پھر بھی
سب محبت کا درس دیتے رہے
دشمنی بیج بوگئی پھر بھی
پھول ہنستے رہے مگر شب کو
آنکھ شبنم بھگو گئی پھر بھی
ہم سفر تو نے ساتھ کتنا دیا!
شام رستے میں ہوگئی پھر بھی
اب بھی ملتے ہیں دوست ہنس ہنس کر
ہر خوشی غم میں کھوگئی پھر بھی
اس کی چاہت تھی پھول سی امتیاز
دل میں کانٹے سوگئی پھر بھی
(ایس امتیاز احمد...... کراچی)

جیون بہت بڑا ہے سائیں
کچا اک گھڑا ہے سائیں
چھوٹی سی بس ایک تسلی
دکھ تو بہت بڑا ہے سائیں
دو دو آنے کا خواب بکا ہے
سکھ کا قحط پڑا ہے سائیں
رات کا سایہ کنڈلی مارے
سر پہ آن کھڑا ہے سائیں
اک چھوٹی سی بات پہ انسان
رب کے ساتھ لڑا ہے سائیں
جیون بہت بڑا ہے سائیں
کچا ایک گھڑا ہے سائیں
(عاصمہ رمضان...... پنڈدادنخان)

لاشوں کا یہ ڈھیر لگا کے
خوش ہوتے ہو خون بہا کے
اونچے محلوں میں رہتے ہیں
ظلم کے پہاڑ اٹھا کے
امن کے ٹھیکیدار بنے ہیں
دولت یہ ناجائز کما کے
انسانوں کے یہ سوداگر
چلتے ہیں بندوق اٹھا کے
حقدار کو حق ملے گا کب؟
بیٹھے ہیں سب آس لگائے
پاک وطن کا پرچم اونچا کرو واجد
سارے مل کر اپنی جانیں گنوا کر لوگو
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی...... کراچی)

زندگی کب سمجھائے گی تو اپنا آپ
کیا دے گی وہ خوشیاں ہمیں
کہ جو ہمارے حصے کی ہیں
جنہیں ہم نے بھی پانا ہے
آخر کب
ہم راکھ ہوئے جاتے ہیں
ہم سے امید وفا نہ رکھنا پھر
دیکھ ہمیں رسوا نہ کر
دیکھ ہمیں تنہا نہ کر
ہمیں جینے دے
دیکھ ہمیں رسوا نہ کر
ہم بہت رونا چاہتے ہیں
کوئی کاندھا دے
کوئی غم خوار دے
یا......
پھر کوئی اچھی سی سزا ہی دے
آخر کچھ تو ہو پاس
مرہم نہ سہی زخم ہی سہی
زخم لے کر بھی لوگ جیتے ہیں
سانسیں چھین جاتی ہیں
لوگ پھر بھی جیتے ہیں
کب بخشے گی تو اپنا آپ ہمیں
کب لینے دے گی وہ سانس
جو صرف ہماری ہو...... صرف ہماری
(نامعلوم......)

کوئی امید بر نظر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن تو معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
پہلے آتی تھی حال دل پر ہنسی
اب تو کسی بات پر بھی نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کرنی نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ خبر ہماری نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی فاریہ
موت آتی ہے پر نہیں آتی
(فاریہ تبسم...... ٹھینگ موڑ قصور)

کہنا تھا نہ کہ یوں
سوتے ہوئے مت چھوڑ
کر جانا
مجھے بے شک جگا دینا
بتا دینا تمہیں راستہ
بدلنا ہے میری حد سے
نکلنا ہے تمہیں کس
بات کا ڈر ہے

کہ میں جانے نہیں دیتا
کہیں یہ قید کر دیتا
ارے پاگل!
محبت کی طبیعت میں
زبردستی نہیں ہوتی
جسے رستے بدلنے ہوں
اسے رستے بدلنے سے
جسے حد سے نکلنا ہو
اسے حد سے نکلنے سے
نہ روک پایا ہے نہ
کوئی روک پائے گا
مگر اک بات کہتا ہوں
تمہیں کھونے سے ڈرتا ہوں
میں اب سونے سے ڈرتا ہوں
(اذان عزیز...... ٹنڈو آدم)

کیا کہوں یہ کیسا احساس ہے
دور ہو کر بھی وہ پاس ہے
خوشی کی خدارا نہ بات کرنا
غم ہی مجھے تو اب راس ہے
تم سے آگے سوچ نہ جائے گی
تو میرا یقیں، تو ہی قیاس ہے
دل کے اندر اتر جاتا ہے
وہ ظالم تو قیافہ شناس ہے
(اقصیٰ رباب...... فیصل آباد)

ہوا تو کچھ بھی نہیں بس
تھوڑے سے مان ٹوٹے ہیں
تھوڑے سے خواب بکھرے ہیں
تھوڑے سے لوگ بچھڑے ہیں
تھوڑی سی نیندیں اڑگئی ہیں
تھوڑی سی خوشیاں چھن گئی ہیں
تھوڑا سا چین گنوایا ہے
ہوا تو کچھ بھی نہیں بس!
آنکھوں کو برسنا سکھایا ہے
محبتوں کا صلہ پایا ہے
ہوا تو کچھ بھی نہیں بس!
کسی اپنے نے رلایا ہے
ہوا تو کچھ بھی نہیں بس
اپنا آپ گنوایا ہے
(سنبل ماہین طٰہٰ...... سرگودھا)

یہ ہماری ادھوری کہانی
ہم تم سے تھے بچھڑے کیسے
ملنے کی آس میں ہم
دشمنوں کی نظر لگ گئی
یا خوشیاں ہمیں راس نہ آئیں
یہ ہماری ادھوری کہانی
آج تک ہم ترسے ہیں
دل کی مرضی میں کھوئے ہیں
غرق سوچوں میں ہے ایسے
تم ہمارے قریب ہو کر جیسے
یہ ہماری ادھوری کہانی
غم کی شامیں تو اب منتظر ہے
خواہشیں اب ہماری نہیں ہے
تم نہیں ہو، تو پھر بھی نہیں ہے
اور تم ہو تو سب کچھ بھی ہے
یہ ہماری ادھوری کہانی
(عثمان غنی...... پشاور)

ہر رات
صرف
ایک پل کو
اتنا سوچ لینا
تمہیں کوئی یاد کرتا ہے
تمہارا نام لیتا ہے
ستاروں کے
سو جانے تک
ایک پل کو
صرف
ایک پل کو
(نگہت اکرم...... لاہور)

اک کہانی تیرے نام کی جس میں
تیری محبتیں بھی ہوگئیں
تیری چاہتیں بھی ہوگئیں
تیری کوششیں بھی ہوگئیں!
اک کہانی تیرے نام کی جس میں
تیری عادتیں بھی ہوگئیں
تیری عبارتیں بھی ہوگئیں
تیری خواہشیں بھی ہوگئیں
تیری راحتیں بھی ہوگئیں
اک کہانی تیرے نام کی جس میں
تیری قربتیں بھی ہوگئیں
تیری نفرتیں بھی ہوگئیں
تیری آہٹیں بھی ہوگئیں
تیری آمدیں بھی ہوگئیں
اک کہانی تیرے نام کی جس میں
تیری رنجشیں بھی ہوگئیں
تیری لغزشیں بھی ہوگئیں
تیری رفعتیں بھی ہوگئیں
تیری شہرتیں بھی ہوگئیں!
میں لکھوں گی اک کہانی تیرے نام کی
(مس فوزیہ کنول...... منڈی ککن پور)

رم جھم برستا ہے پانی
رم جھم حال کے آمنے سامنے
میں بھی تو رہتا ہوں
یہیں کہیں آمنے سامنے
کوئی جب مل جاتا ہے مجھے
ہموا کہیں آمنے سامنے
دل چاہتا ہے لگالوں گلے اسے
مگر لوگ ہوتے ہیں آمنے سامنے
مچلتا ہے دل میں خیال اکثر
مل جائے کہیں وہ آمنے سامنے
دلوں میں کتنی دوری ہوگئی ہے
گزر جاتے ہیں لوگ آمنے سامنے
(سلیم بیگ ہمدانی...... کراچی)

☆☆

درندگی

شہزادہ چاندزیب عباسی-کراچی

ایک ایک پل وقت سسک سسک کر آگے بڑھ رہا تھا، تمام لوگوں کو خوف نے اپنے شکنجے میں جکڑلیا تھا، لوگوں کی آنکھیں کھلی تھیں مگر ان میں دیکھنے کی طاقت مفقود تھی کہ ایک گونجدار آواز گونجی......

جسم وجاں کوتھرا دینے والی...... ظلم وبربریت سے پرایک منفرداور خوف ناک کہانی

ھال نما کمرے میں وہ خوفزدہ کھڑی تھی اور دیواروں سے لگ کرنصف درجن افراد ہاتھوں میں رائفلیں لئے کھڑے تھے۔اس خوبصورت لڑکی کے دونوں بازواوپر کو اٹھے ہوئے دو تنومند افراد کی گرفت میں تھے۔لڑکی کے سامنے قیمتی تھری پیس سوٹ میں ملبوس ورزشی جسم کا مالک چنگیز کھڑا تھا۔وہ فطرت کے لحاظ سے تاریخ میں مشہور خون کی ہولی کھیلنے والا چنگیز خان سے بڑھ کر تھا۔بے پناہ دولت اور اثر ورسوخ کا مالک چنگیز خوبصورت عورتوں کا بیوپاری ہونے کے علاوہ کرائے کا قاتل بھی تھا۔اس نے درجنوں کرائے کے قاتل پال رکھے تھے۔اس کے گاہکوں میں جاگیردار، اداروں کے کرپٹ اعلیٰ افسران اور بعض زیادہ اثر ورسوخ والے بھی شامل تھے۔اس کے ہاں عیاشی کی فیس ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں میں تھی، عام افراد کا اس عمارت میں آنا دور کی بات عمارت کے قریب سے گزرنا بھی ناممکن تھا۔اس کے تعلقات اور اثر ورسوخ کا یہ عالم تھا کہ امرا اور اثر ورسوخ کے حامل افراد گھروں میں ہونے والی اہم تقریب کا وہ مہمان بھی ہوتا تھا۔اس کے پاس سب کچھ تھا مگر ایک چیز کی کمی تھی۔جس کی خبر سوائے اس کے اور اس کے ذاتی معالج پرتاب کے علاوہ اور کسی کو نہ تھی۔

چنگیز نامکمل تھا۔وہ دیکھنے میں لحیم شحیم تھا۔مگر ازدواجی معاملات میں فطری خواہشات سے محروم تھا۔دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے مگر بعض معاملات میں انسان قدرت کے سامنے مجبور ہوجاتا ہے۔اس نے اپنے علاج پر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں خرچ کئے۔مگر بڑے بڑے ڈاکٹر اور حکیم بھی کچھ نہ کرسکے آخر تھک ہار کر اس نے ایک ہندو جادوگر پرتاب سے رابطہ کیا۔پرتاب نے اس کا حل یہ بتایا کہ ہر ماہ چاند کی پہلی تاریخ کو وہ معصوم بچوں کے خون سے نہائے، جوں ہی وہ سو بچوں کے خون سے نہالے گا تو وہ ٹھیک ہوجائے گا۔

اس وقت ہال کے عین وسط میں چولہے پر تیل کی ایک بڑی کڑاہی دھری تھی جس میں تیل کھول رہا تھا۔چولہے میں انگارے دہک رہے تھے۔

ہال کی دیوار کے ساتھ بارہ خوبصورت لڑکیاں خوفزدہ کھڑی تھیں۔

چنگیز کی گونجیلی آواز ہال میں گونجی۔"یہاں سے فرار کی آج تک کسی نے ہمت نہیں کی مگر اس لڑکی نے آج یہ رسم توڑ ڈالی ہے۔شازیہ نے نا صرف فرار ہونے کی کوشش کی بلکہ تھوڑی سی کامیاب بھی رہی۔یہ پہلی راہداری کے گارڈ کی نااہلی سے فرار ہوکر دوسری راہداری میں جا پہنچی۔جہاں کے گارڈ نے اسے پکڑلیا۔اس نااہل گارڈ کو

لاؤ تاکہ سب کے سامنے اس کی نااہلی کی سزا اسے دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔"

دو گارڈ ایک ادھیڑ عمر شخص کو گھسیٹتے ہوئے ہال میں لائے۔ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط رسی سے بندھے تھے۔

"باس مجھے معاف کردو، آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔" وہ خوفزدہ لہجے میں چلا چلا کر معافی مانگنے لگا۔

"ہماری کتاب میں معافی نام کا کوئی لفظ نہیں اس نااہل کو تیل کی کڑاہی میں ڈال دو۔" چنگیز سفاک لہجے میں بولا۔

گارڈز اسے گھسیٹتے ہوئے تیل کی کڑاہی تک جا پہنچے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ایسی مضبوطی سے بندھے تھے کہ وہ معمولی حرکت کرنے سے بھی قاصر تھا۔ دونوں گارڈز نے اسے اٹھایا اور بلند کرکے کڑاہی میں ڈال کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔ تیل کی بڑی کڑاہی میں جیسے ہی گارڈ گراتو گرم تیل کی بلند چرچراہٹ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گارڈ آخری بار کربناک انداز میں چلایا۔ انسانی گوشت کے جلنے کی بو پورے ہال میں پھیل گئی، ہال میں کہرام سا مچ گیا۔ سب لڑکیاں خوفناک منظر دیکھتے ہی ڈر و خوف سے چیخنے لگیں۔

"خاموش ہوجاؤ! ورنہ سب کو اس کڑاہی میں ڈلوادوں گا۔" چنگیز کی آواز میں درندگی تھی۔ شازیہ اب تمہاری باری ہے مگر تمہاری موت اس سے بھی زیادہ بھیانک ہوگی وہ سانپ کی سی پھنکار میں شازیہ سے مخاطب ہوا۔ انسانی کتوں کو بلاؤ۔" چنگیز نے حکم دیا۔

اس کے ساتھ ہی ہال کے دروازے سے چار دیوہیکل افراد اندر داخل ہوئے ان کے جسم پر صرف انڈر ویئر موجود تھے۔ چہرہ سمیت ان کا پورا جسم کالا سیاہ تھا۔ شکل وصورت سے وہ افریقی لگ رہے تھے۔

"سنو! اسے اس طرح ادھیڑ کر کھاؤ جیسے شکاری کتے ہرن کو کھاتے ہیں۔" چنگیز کا حکم سنتے ہی وہ چاروں شازیہ کی طرف بڑھنے لگے۔ شازیہ چیختی چلاتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی۔ مگر انسان نما درندوں نے اسے پکڑلیا۔ اس ہال میں درندگی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے لڑکی کے جسم کو کتوں کی طرح ادھیڑ کر رکھ دیا۔

شازیہ اذیت سے چیخ رہی تھی۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ جسم کے ہر حصے سے گوشت نوچا جارہا تھا۔

شازیہ کی چیخیں اذیت ناک تھیں۔ تماشہ دیکھنے والی لڑکیوں کی اکثریت یہ درندگی دیکھتے ہی بے ہوش ہوچکی تھیں۔ وہ چاروں افریقی آدم خور تھے۔ چنگیز اپنے دشمنوں کو ان کے آگے ڈال کر وہ منظر دیکھ کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ چند لمحوں بعد شازیہ کی خونچکاں لاش ادھڑی ہوئی فرش پر پڑی تھی اور افریقی بدستور اس کا گوشت کھانے میں مصروف تھے۔

☆......☆......☆

وہ چاروں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے بے فکری سے قہقہہ لگا رہے تھے۔ وقاص عرف وکی، خالد، شہریار اور سجاد، ان چاروں کا تعلق امیر گھرانوں سے تھا۔ وکی کا باپ چوہدری امجد سیاستدان تھا جبکہ خالد کا باپ دلاور اپنے علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او تھا۔ دلاور ایک راشی پولیس افسر تھا۔ شہریار اور سجاد کے باپ اسمگلر ہونے کے ساتھ ساتھ گارمنٹس فیکٹریوں اور کاروں کے شوروم کے مالک تھے۔ غلط ذرائع کی دولت کی فراوانی کی وجہ سے چاروں دوست غلط راستوں پر چل پڑے تھے۔

"یار بہت دن سے کوئی شکار نہیں کھیلا۔" وکی بولا۔

"چنگیز کے ٹھکانے پر ہر ہفتہ تو عیاشی تو کرآتا ہے۔" خالد ہنسا۔

"یار خوفزدہ ہرنیوں کا شکار کرنے کا الگ ہی مزہ ہے۔" وکی نے کہا۔

"یار پچھلی بار کی شازیہ بھی بہت خوبصورت تھی۔ جسے ہم نے گولڈن ٹاؤن کے علاقے سے اٹھایا تھا۔ وہ روئی چیخی چلائی بڑے واسطے دیئے مگر تم نے اسے نہیں چھوڑا اور آخر میں چنگیز کے حوالے کردیا۔" سجاد ہنستے ہوئے بولا۔

"چلو آج پھر شکار کے لئے چلتے ہیں۔" وکی ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ چاروں ریسٹورنٹ سے باہر نکلے، باہر وکی کی بلیک ہنڈا اکارڈ کھڑی تھی۔ وہ چاروں اس میں بیٹھ گئے۔

"یار اس بار بھی کوئی زبردست چیز اٹھانی ہے۔" سجاد نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

وہ سڑکوں پر گھومتے رہے۔ مگر ان کو کوئی قابل ذکر لڑکی نہ نظر آئی۔ سجاد نے گاڑی ایک پسماندہ علاقے کی طرف جانے والی سڑک پر موڑدی۔ "یہ کہاں جارہے ہو؟" وکی بیزاری سے بولا۔

"یار! مڈل کلاس لڑکیاں ایک تو خوبصورت بہت ہوتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ رودھو کر چپ ہوجاتی ہیں۔" سجاد قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

اس وقت ان کی گاڑی ایک سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ "ارے وہ دیکھو سامنے بائیک پر۔" خالد چلایا۔

بائیک پر ایک 17-18 سالہ خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ بائیک ایک اسمارٹ سا لڑکا چلا رہا تھا۔ "لڑکی بائیک والے کی کون ہوگی۔" خالد بڑبڑایا۔

"ان کو کور کرو، یہ وقت فضول باتوں کا نہیں سڑک بھی اس وقت سنسان ہے۔" وکی بولا۔ اور سجاد نے گاڑی کی رفتار تیز کرکے اچانک بائیک کے آگے روک دی۔ نوجوان نے اچانک سامنے رکنے والی ہنڈا اکارڈ کو دیکھ کر بائیک روک دی۔

وہ چاروں ریوالور ہاتھوں میں لے کر اترے اور اس لڑکے اور لڑکی کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ "کیا تکلیف ہے؟" ان کے ہاتھوں میں ریوالور ہونے کے باوجود لڑکا بے خوفی سے بولا۔

"ہماری تکلیف تم نہیں دور کرسکتے بیٹا!" یہ کہتے ہوئے وکی نے اپنے ریوالور کا دستہ زور سے نوجوان کے سر پر مارا تو نوجوان لہرا کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ لڑکی نے بھائی کو گرتا دیکھ کر چیخنا شروع کردیا۔

خالد آگے بڑھا اور اس لڑکی کو دبوچ کر کلوروفارم میں بھیگا رومال اس کے منہ پر رکھ دیا۔ لڑکی بے ہوش ہوکر اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ "جلدی کرو، ہری اپ، یہ نہ ہو کہ کوئی آجائے۔" خالد نے کہا۔ انہوں نے لڑکی کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا اور گاڑی میں سوار ہوگئے۔ ان کی گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ان کی گاڑی ایک پوش علاقے میں داخل ہوگئی۔

سجاد نے گاڑی ایک خوبصورت بنگلے کے گیٹ پر روکی اور ہارن بجایا۔ چوکیدار نے ذیلی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔ سجاد کے والد کا یہ بنگلہ اکثر خالی رہتا تھا۔ یہاں صرف ایک چوکیدار ہوتا تھا۔ "خان تم باہر ہی رہنا اور خیال کرنا، اندر کوئی نہ آئے۔ سجاد نے چوکیدار کو ہدایت کی اور گاڑی سے لڑکی کو نکال کر کندھے پر لاد کر چاروں چلتے ہوئے ایک کشادہ بیڈروم میں جا پہنچے۔

سجاد نے لڑکی کو بیڈ پر پھینکا اور کمرے میں لگی الماری سے شراب کی بوتل نکالی۔ خالد گلاس اور برف فریج سے نکال لایا۔ وہ چاروں صوفے پر بیٹھ کر شراب پینے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں ان کا نشہ گہرا ہونے لگا۔ اس وقت تک وہ اچھے خاصے نشے میں آچکے تھے۔ لڑکی کو ہوش میں آ دیکھ کر وہ لڑکی کی طرف لپکے۔ "پلیز! مجھے جانے دو، تمہیں اللہ کا واسطہ۔" لڑکی گڑگڑائی مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ انہوں نے لڑکی کو دبوچ لیا اور ان کا شیطانی کھیل اس وقت تک جاری رہا جب تک لڑکی بے ہوش نہ ہوگئی۔

اس کے بعد انہوں نے لڑکی کو دوبارہ گاڑی میں ڈالا۔ اب گاڑی کا رخ چنگیز کے ٹھکانے کی طرف تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ چنگیز کی قلعہ نما عمارت کے باہر موجود تھے۔

"چنگیز کو اطلاع کرو کہ چوہدری امجد کا بیٹا وکی آیا ہے اور اس کے لئے تحفہ لایا ہے۔" وکی نے گیٹ پر موجود لمبے قد والے گارڈ سے کہا۔ گارڈ نے انٹرکام پر رابطہ کیا اور انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔

سجاد نے گاڑی عمارت کے اندر لے جا کر پورچ میں کھڑی گاڑیوں کے پاس روکی۔ یہاں بھی دو افراد جدید طرز کی رائفلیں لئے کھڑے تھے۔ سجاد نے وکی کے اشارے پر لڑکی کو کندھے پر ڈالا، اب وہ تینوں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ وہ ایک خوبصورت کوریڈور سے گزرتے شیشے کے ایک خوبصورت دروازے کے سامنے ایک گھنی داڑھی والا ایک گارڈ کلاشنکوف لئے کھڑا تھا۔

"چنگیز کے لئے تحفہ لائے ہیں آئی ایم وکی سن

آف چوہدری امجد۔" وکی کے وضاحت سے تعارف کروانے پر گارڈ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے دروازے کو اندر سے مقفل کر دیا تھا۔ اس کی واپسی دو منٹ بعد ہوئی۔ "اندر آجائیں۔" اس نے راستہ دیا۔ یہ بھی ایک راہداری تھی۔ قالین بچھا ہوا تھا۔ چند قدم آگے ایک درمیانے قد کا آدمی ہاتھ میں رائفل اٹھائے کھڑا تھا۔ اس نے چاروں کی باری باری تلاشی لی اور ان کے ریوالور اور موبائل فون نکال کر اپنے پاس رکھ لئے۔ "یہ آپ لوگوں کو واپسی پر ملیں گے۔" وہ بولا۔

وہ چاروں آگے بڑھے۔ "یہاں تو بہت سخت چیکنگ ہوتی ہے۔" خالد بولا۔

"یہاں آنے والا شخص چاہے کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو اسی قسم کی چیکنگ سے گزرتا ہے۔ یہاں عورتوں کے کاروبار کے علاوہ ٹارگٹ کلر بھی دستیاب ہیں اپنے کسی بھی دشمن کو مروانا ہو بھاری رقم دے کر بے فکر ہو جاؤ۔ چنگیز تمہارے دشمن کو تڑپا تڑپا کر مار دے گا۔" وکی نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ ایک ہال نما کمرے میں جا پہنچے۔ وکی کے دستک دینے پر دروازہ ایک خوبصورت لڑکی نے کھولا۔ "اندر آیئے۔" وہ اندر داخل ہو گئے۔ لڑکی کے اشارے پر سجاد نے بے ہوش لڑکی کو کمرے میں موجود بیڈ پر لٹا دیا۔

"چنگیز کہاں ہے؟" وکی نے پوچھا۔

"آج چاند کی پہلی تاریخ ہے، باس غسل کر رہے ہیں۔" لڑکی بولی تو وکی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ "کیوں چاند کی پہلی سے پہلے وہ غسل نہیں کرتے کیا؟" وکی نے پوچھا۔

"وہ آجائیں تو خود ہی پوچھ لینا۔" لڑکی نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

"ہال نما کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں چنگیز انڈرویئر پہنے کھڑا تھا۔ چھت کے کڑے سے ایک چھ سالہ بچہ الٹا لٹک رہا تھا۔ جس کی گردن سے بہنے والا خون نیچے کھڑے چنگیز کے سر پر گر رہا تھا۔ خون اس کے سر سے ہوتا ہوا اس کے جسم پر بہہ رہا تھا۔ چنگیز کا جسم بچے کے خون سے بھیگتا جا رہا تھا۔ ایک طرف پرتاب آلتی پالتی مارے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پرتاب اٹھا۔

"اب تم تین گھنٹہ تک اسی حالت میں رہو گے اس کے بعد نہا کر کپڑے پہن سکتے ہو۔" پرتاب بولا۔ اور چنگیز اسی طرح خون میں بھیگا ہوا ہال نما کمرے میں جا پہنچا۔

وہ چاروں چنگیز کو اس حالت میں دیکھ کر خوفزدہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"یہ...... کک...... کیا...... ہے...... چنگیز۔" وکی نے خوف سے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"میں چاند کی ہر پہلی تاریخ کو انسانی خون سے نہاتا ہوں۔" وہ سفاکی سے بولا۔

"ہمارا تحفہ بیڈ پر پڑا ہے، انعام میں ایک ہفتہ ہمارا یہاں داخلہ فری...... ہونا...... چاہئے۔" وکی ہکلاتے ہوئے بولا۔

"تم جانتے ہو یہاں داخلے کی فیس لاکھوں میں ہے۔ تم لوگوں کے لئے یہاں ایک دن داخلہ فری ہے۔" چنگیز نے کہا۔

اس کے بعد وہ چاروں اجازت لے کر تیزی سے کمرے سے باہر یوں بھاگے جیسے موت کو دیکھ لیا ہو کیونکہ چنگیز کا حلیہ اس وقت تھا بھی اتنا ڈراؤنا۔

ان چاروں کے جاتے ہی چنگیز نے لڑکی کے منہ پر تھپڑ مارنے شروع کر دیئے۔ پانچویں تھپڑ پر لڑکی ہوش میں آگئی۔ چنگیز کو دیکھتے ہی خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں، جسم پر صرف انڈرویئر اور جگہ جگہ انسانی خون موجود تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جم رہا تھا۔ خون کی بو سے لڑکی کا جی متلانے لگا۔

"تت...... تم کون ہو اور میں کہاں ہوں؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ لڑکی اب اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ چکی تھی۔

"خاموش بیٹھی رہو۔ یہاں سوال کرنے کا حق صرف مجھے ہے۔" "رضوانہ میرا ہنٹر لاؤ!" چنگیز نے کمرے میں موجود دوسری لڑکی سے کہا۔ رضوانہ نے کمرے میں موجود الماری سے ہنٹر نکال کر چنگیز کے حوالے کر دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے لڑکی؟" چنگیز نے پوچھا۔

"رابعہ!" لڑکی کے نام بتاتے ہی اس نے رابعہ پر ہنٹر برسانا شروع کر دیا۔ کمرہ رابعہ کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ چنگیز اسے اس وقت تک ہنٹر سے مارتا رہا جب تک وہ بے ہوش نہ ہو گئی۔

"رضوانہ اسے اپنے کمرے میں گارڈ کی مدد سے لے جاؤ اور مرہم پٹی کرو اور یہاں کے طور طریقے اسے سکھاؤ۔" چنگیز نے حکم دیا اور صوفے پر بیٹھ کر ریموٹ سے TV آن کیا اور چینل بدلنے لگا۔

☆......☆......☆

عمران کو ہوش آیا تو خود کو اسپتال کے ایک بیڈ پر پایا۔ اس کے ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ بیڈ کے قریب ہی لکڑی کے بنچ پر اس کے والد رحیم اور والدہ ذکیہ بیگم اور کزن سمیرا موجود تھیں۔ سمیرا اس کی منگیتر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی محبت بھی تھی۔ "کیا ہوا تھا بیٹا! تم سڑک پر بے ہوش پڑے تھے۔ سڑک سے گزرنے والا کوئی اللہ کا نیک بندہ تمہیں اسپتال لے آیا، یہاں ڈاکٹر نے تمہارے موبائل فون سے گھر کا نمبر دیکھ کر ہمیں اطلاع دی۔ اور رابعہ کہاں ہے؟ تم رابعہ کو کالج سے لانے گھر سے گئے تھے۔" رحیم صاحب نے پوچھا۔

"عمران آہستگی سے اٹھا اور تمام واقعہ سنا ڈالا۔ رابعہ کے اغوا کی خبر سنتے ہی ذکیہ بیگم دل پر ہاتھ رکھ کر نیچے گر پڑیں۔

ذکیہ بیگم کو اٹھا کر بیڈ پر لٹایا گیا۔ ذکیہ بیگم ساکت پڑی تھیں۔ ان کی بے نور آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں کہ زندگی سے ان کا ناطہ ٹوٹ چکا ہے۔

سمیرا کی چیخ و پکار پر ڈاکٹر دوڑتا ہوا اندر آیا اور ذکیہ بیگم کا معائنہ کرنے کے بعد سوری کہہ کر بیڈ پر موجود سفید چادر انہیں اوڑھا دی، عمران اور سمیرا پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

عمر رسیدہ رحیم صاحب ابھی بیٹی کے اغوا کی خبر سن کر سنبھلے بھی نہ تھے کہ انہیں بیوی کی جدائی کا صدمہ بھی سہنا پڑ گیا۔ ذکیہ بیگم کی لاش ایمبولینس کے ذریعے ان کے گھر بھجوا دی گئی۔

تدفین سے فارغ ہو کر رحیم صاحب اور عمران پولیس اسٹیشن گئے، وہ ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایس ایچ او دلاور فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھا اس نے انہیں اپنے سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ فون پر مصروف ہو گیا۔ "کہا ناں آج ضرور آؤں گا، جانم تم فکر مت کرو، تمہارا گفٹ بھی لیتا آؤں گا۔" اس نے کہا اور پھر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ اس کی گفتگو تقریباً پندرہ منٹ جاری رہی۔ اللہ اللہ کر کے اس نے ریسیور رکھا اور ان کی طرف متوجہ ہوا۔ "جی فرمایئے۔"

"سر! آج دوپہر 2 بجے کے قریب، میں اپنی بہن رابعہ کو کالج سے گھر موٹر سائیکل پر لا رہا تھا کہ ایک بلیک ہنڈا اکارڈ نے ہمارا راستہ روکا، اس سے چار لڑکے اترے انہوں نے ہاتھوں میں ریوالور اٹھا رکھے تھے۔ ایک نے ریوالور کا دستہ میرے سر پر مار کر مجھے بے ہوش کر دیا اور رابعہ کو اغوا کر کے لے گئے۔" عمران نے تفصیل سے واقعہ بیان کیا۔

اغوا دن کو ہوا اور رپورٹ لکھوانے تم رات گیارہ بجے آرہے ہو۔" دلاور نے طنز کیا۔

"سر! یہ خبر سنتے ہی میری والدہ کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ تدفین سے فارغ ہوتے ہی ہم یہاں آئے ہیں۔" عمران نے کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ سب ناٹک ہو، تمہاری بہن نے اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ مل کر ڈرامہ کھیلا ہو۔" دلاور مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ کیا بکواس کر رہے ہیں۔" عمران اچھل کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آرام سے بیٹھو یہ پولیس اسٹیشن ہے۔ تمہارے باپ کا ڈرائنگ روم نہیں۔" دلاور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہنڈا اکارڈ کا نمبر بتاؤ اور ملزموں کے حلیے بھی بتاؤ؟"

عمران نے گاڑی کا نمبر اور ان لڑکوں کے حلیے بتائے ہی تھے کہ دلاور جیسے اچھل پڑا۔ "دیکھو جوان! تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، تم نے نمبر نوٹ کرنے میں کوئی غلطی کی ہے یہ ہمارے سیاستدان چوہدری امجد کی گاڑی کا نمبر ہے۔" دلاور بولا۔

"مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی، لگتا ہے چوہدری امجد کا نام سامنے آتے ہی آپ کی سٹی گم ہوگئی ہے۔ اپنے ماتھے سے پسینہ بھی صاف کرلیں جو میرے شک کو یقین میں بدل رہا ہے۔" عمران نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بکواس بند کرو اور دفع ہوجاؤ، ورنہ تمہیں اٹھا کر بند کردوں گا۔" دلاور کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ گاڑی کا نمبر اور ملزمان کے حلیہ سنتے ہی اسے علم ہوگیا تھا کہ اس واردات میں اس کا بیٹا وکی اور اس کے دوست شامل تھے۔

"چلو بیٹا! یہاں سے، اللہ ان سے پوچھے گا۔" رحیم صاحب، عمران کا بازو پکڑ کر ایس ایچ او دلاور کے کمرے سے نکل گئے۔ عمران نے والد کو گھر پہنچایا۔ قریبی ہوٹل سے رحیم صاحب کے لئے کھانا لے گیا اور زبردستی انہیں کھلایا۔ وہ رات دیر تک جاگ کر روتا رہا۔

صبح اٹھ کر ناشتہ کئے بغیر نکلا اور بائیک پر ادھر ادھر بے مقصد پھرتا رہا۔ شام چار بجے کے قریب وہ ایک مصروف سڑک پر بائیک دوڑا رہا تھا کہ ٹریفک سگنل کی بتی سرخ ہونے پر بائیک سڑک پر روکی۔

اچانک اس کی نظر ایک بی ایم ڈبلیو پر پڑی۔ عمران چونک پڑا۔ پچھلی سیٹ پر رابعہ ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ خوفزدہ بیٹھی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی ڈرائیور موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کی طرف بڑھتا، سگنل کی بتی گرین ہوگئی تو گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ عمران نے اپنی موٹر سائیکل اس گاڑی کے پیچھے لگادی۔ وہ گاڑی ایک صنعتکار کی تھی جو رابعہ کو چنگیز کے ٹھکانے سے اپنے بنگلے پر لے گیا تھا۔ چند گھنٹے رکھنے کے بعد وہ اسے واپس چنگیز کے ٹھکانے پر چھوڑنے جارہا تھا۔ صنعتکار سلیم کو چنگیز نے سختی سے تاکید کی تھی کہ رابعہ نئی لڑکی ہے اس کا خیال رکھے۔

بی ایم ڈبلیو ایک بڑی سی عمارت کے آگے جاکر رکی۔ عمران کے وہاں پہنچتے پہنچتے گاڑی عمارت کے اندر داخل ہوچکی تھی اور عمارت کا آہنی گیٹ بند ہوچکا تھا۔ عمران موٹر سائیکل سے اترا۔ "گیٹ کھولو اندر گاڑی میں وہ میری بہن کو لے گیا ہے۔" عمران نے گیٹ پر موجود رائفل بردار گارڈ سے کہا۔ اسی دوران عمارت کے گرد ٹہلنے والے 2 دیگر گارڈ بھی ان کے قریب آگئے۔ "یہاں نہ جانے کتنوں کی بہنیں قید ہیں۔ تم اپنی بہن کو رو رہے ہو۔ اسے بھول جاؤ، اب اس کی لاش کا باہر آنا بھی مشکل ہے۔" گارڈ ہنستے ہوئے بولا۔

عمران بپھرا ہوا گیٹ کی طرف لپکا اس نے گیٹ پر لاتیں گھونسے مارنے شروع کردیئے۔ ایک گارڈ نے رائفل کا دستہ عمران کی کمر پر رسید کردیا اس دوران دوسرے گارڈ بھی اس پر حملہ آور ہوگئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نیچے بے ہوش پڑا تھا۔ ایک گارڈ نے فون پر چنگیز سے رابطہ کیا۔ "باس ایک نوجوان جو اپنے آپ کو رابعہ کا بھائی بتارہا تھا۔ وہ سلیم قریشی صاحب کی گاڑی کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ ہماری مار کے نتیجے سے وہ بے ہوش ہوچکا ہے۔ آپ کا حکم ہو تو اسے اوپر پہنچادوں۔"

چنگیز اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ اس کے سامنے سلیم قریشی بیٹھا تھا۔ "میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا ہوشیار رہنا اس کمینی کا بھائی تمہارا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آن پہنچا ہے۔ اگر وہ پولیس کے کسی ایماندار افسر کے پاس جا پہنچا تو گڑبڑ ہوجائے گی۔ اس کا کچھ بندوبست کرنا پڑے گا اور تمہیں لاپرواہی کی سزا بھی دینی پڑے گی۔" یہ کہتے ہی چنگیز نے اپنے ہولسٹر سے قیمتی پستول نکالا اور سلیم قریشی کے دل کے مقام پر فائر کردیا۔ وہ بنا آواز نکالے گرا اور ساکت ہوگیا۔

"رضوانہ رابعہ کو یہاں لے آؤ۔" اس نے دروازے کے قریب کھڑی رضوانہ کو پکارا، چند لمحوں بعد رضوانہ رابعہ کو لے آئی قالین پر پڑی سلیم قریشی کی لاش دیکھ کر رابعہ خوف سے کانپنے لگی۔ اب کے چنگیز نے اپنے پستول کا رخ رابعہ کی طرف کردیا۔ "زندگی میں پہلی بار کسی کو آسان موت دے رہا ہوں۔ اسے میرا احسان سمجھنا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے فائر کیا تو گولی رابعہ کی پیشانی میں لگی۔ وہ چیخ مار کر قالین پر گر پڑی۔ چنگیز نے باہر موجود گارڈ کو اندر بلایا۔ "یہ دونوں لاشیں BMW میں ڈال دو اور اسی پستول سے سلیم قریشی کے ڈرائیور کو بھی قتل کرکے اس

پستول سے انگلیوں کے نشانات صاف کردینا اور بے ہوش نوجوان کو ان لاشوں کے ساتھ BMW میں ڈال کر یہاں سے دور چھوڑ آؤ۔" اس نے گارڈ کو ہدایت کی اور موبائل فون پر ایس ایچ او دلاور کا نمبر ملایا۔

"دلاور یہاں سے کچھ فاصلے پر سلیم قریشی کی BMW میں سلیم قریشی ان کا ڈرائیور اور رابعہ کی لاشیں پڑی ہیں انہیں ایک نوجوان عمران نے قتل کیا ہے۔ قاتل اور آلہ کار گاڑی میں پڑے ہیں جلدی آکر گرفتار کرلو۔"

"یس سر۔" دوسری طرف سے دلاور بولا اور چنگیز نے فون آف کردیا۔

☆......☆......☆

عمران نے ہوش میں آنے پر خود کو تھانے کے لاک اپ میں پایا۔ لاک اپ میں اس کے علاوہ ایک دبلا پتلا 30 سالہ نوجوان کامران بھی موجود تھا جو کہ چوری کے الزام میں بند تھا۔ "مجھے باہر نکالو۔ یہاں کیوں بند کیا ہوا ہے؟" اس نے لاک اپ کا سلاخوں والا دروازہ جھنجھوڑنا شروع کردیا۔ اس کے چیخنے چلانے پر تھوڑی دیر بعد ہل چل مچی۔ دو گرانڈیل سپاہیوں نے اسے لاک اپ سے نکالا اور گھسیٹتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے اس کمرے میں فرش میں ایک کرسی گڑی تھی اور چھت سے ایک کنڈا لٹک رہا تھا جس سے لوہے کی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ اس کمرے میں ایس ایچ او دلاور اور ایک سپاہی پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے عمران کے چیخنے چلانے کی پرواہ کئے بغیر اسے چھت سے الٹا لٹکادیا۔ دلاور موٹے ڈنڈے سے عمران کو پیٹ رہا تھا۔ "بول رابعہ اور سلیم قریشی اور ان کے ڈرائیور کا خون تو نے کیا ہے۔" دلاور نے اسے مارتے ہوئے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ چلایا۔

"اپنا جرم مان لے، پستول پر تیری انگلیوں کے نشانات ہیں، اپنا جرم مان لے ورنہ مار مار کر یہیں دفن کردوں گا۔" دلاور اور سپاہی اسے بڑی درندگی سے پیٹ رہے تھے۔

عمران کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ عمران کا ریمانڈ لیا جاتا رہا اور ٹارچر کیا جاتا رہا مگر اس نے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ بالآخر اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھجوادیا گیا۔ سینٹرل جیل کی جس بیرک میں اسے بھیجا گیا اس میں سب ہی تقریباً خطرناک قیدی تھے۔ ان قیدیوں میں سب سے خطرناک ساڑھے 6 فٹ کا بادشاہ تھا جو دوسرے قیدیوں پر حکم چلاتا تھا۔

اس ماحول میں عمران کو نیند کہاں آتی۔ لہٰذا وہ جاگ رہا تھا۔ ایک کونے میں آرام دہ بستر پر بادشاہ سکون سے سو رہا تھا۔ اچانک عمران چونک پڑا، ایک درمیانے قد کا صحت مند قیدی سیدھے ہاتھ میں چھری تھامے دبے قدموں آہستگی سے بادشاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عمران آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ قیدی نے بادشاہ کے قریب پہنچ کر چھری والا ہاتھ بلند کیا۔ اسی لمحے عمران نے پیچھے آکر اس کا چھری والا ہاتھ پکڑلیا۔ وہ عمران کی طرف گھوما۔ عمران نے اپنے سر کی ٹکر اس کی ناک پر ماری۔ قیدی کے منہ سے چیخ نکلی اور ناک سے خون بہنے لگا۔ اس دھینگا مشتی اور شور شرابے سے دوسرے قیدی اور بادشاہ سب جاگ گئے۔

بادشاہ تیر کی طرح ان کی طرف لپکا چاقو اب تک قیدی کے ہاتھ میں تھا جسے عمران چھیننے کی کوشش کررہا تھا۔ قیدی نے عمران کے سینے پر لات رسید کی۔ عمران پشت کے بل گرا۔ اسی لمحے قیدی نے بادشاہ پر حملہ کردیا۔ جاگتے بادشاہ پر وار کرنا ناممکن تھا۔ وہ جرائم کی دنیا کا صرف نام ہی کا نہیں کام کا بھی بادشاہ تھا۔ اس نے قیدی کا چاقو والا ہاتھ کلائی سے پکڑ کر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا، کڑاک کی آواز کے ساتھ قیدی کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ قیدی گر کر تڑپنے لگا۔

عمران جو کہ اٹھ چکا تھا۔ بادشاہ کے قریب آیا۔ "یہ چھری سے آپ کے سونے کے دوران وار کررہا تھا۔"

"جوان زندگی میں پہلی بار کسی نے بادشاہ پر احسان کیا ہے۔ آجاؤ میرے ساتھ۔" وہ عمران کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بستر پر لے گیا۔ "تیرا نام کیا ہے اور کس جرم میں یہاں آیا

ہے۔" بادشاہ نے پوچھا۔ اور پھر عمران نے تفصیل سے اپنے اوپر بیتے تمام مظالم سے آگاہ کیا۔

"عمران تم خطرناک لوگوں میں پھنس چکے ہو۔ ایس ایچ او دلاور چوہدری امجد کا پکا چمچہ اور دوست ہے، اس کا بیٹا خالد چوہدری امجد کے بیٹے وکی کا دوست ہے۔ ان کے دیگر دوست سجاد اور شہریار ہیں، تمہاری بہن کے اغوا میں یہ چاروں شامل ہوں گے، جس عمارت میں تم نے اپنی بہن کو سلیم قریشی کے ساتھ جاتے دیکھا۔ وہ چنگیز کا ٹھکانہ ہے۔ چنگیز عورتوں کا بیوپاری اور کرائے کا قاتل ہے۔ اس نے غنڈوں کی فوج پال رکھی ہے۔ اس کی عمارت قلعہ ہے جہاں اس کی مرضی کے بغیر جانا ناممکن ہے۔" بادشاہ نے کہا۔

عمران بادشاہ کی آنکھوں کا تارا بن چکا تھا، اب کسی قیدی کی ہمت نہ تھی کہ عمران کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتا۔ جیلر تک بادشاہ سے ڈرتے تھے۔

اسی طرح چھ ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ عمران پیشی پر کورٹ جاتا رہا۔ جیل میں ایک بار رحیم صاحب اور سمیرا اس سے ملنے آئے۔ عمران کے والد کافی کمزور ہو چکے تھے۔ عمران نے انہیں اور سمیرا کو دوبارہ جیل آنے سے منع کر دیا تھا۔

بادشاہ نے عمران کو لڑائی بھڑائی، خنجر بازی، جیب تراشی غرض کہ جرم کے ہر طریقے سے آگاہ کیا۔ "عمران اس بار پیشی میں، میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ میری بھی پیشی ہے۔ میرے ساتھی کورٹ سے نکلتے ہی حملہ کر دیں گے اور ہم فرار ہو جائیں گے۔" بادشاہ نے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

پیشی کے دن عمران اور بادشاہ کورٹ میں پیشی کے بعد دیگر قیدیوں کے ہمراہ جب کورٹ کے احاطے میں جیل وین میں سوار ہونے کے لئے لائے گئے ایک دم ہی وہاں نصف درجن افراد نے فائرنگ شروع کر دی اچانک ہونے والی فائرنگ سے انکو کورٹ لانے والے سپاہی زخمی ہو کر گر پڑے۔ بادشاہ عمران کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھڑی پجارو کی طرف لپکا ان دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی موجود تھی۔

ان کے سوار ہوتے ہی پجارو بندوق سے نکلی گولی کی طرح وہاں سے نکلی۔ پولیس موبائل نے ان کا تعاقب بھی کیا۔ مگر وہ انہیں ڈاج دینے میں کامیاب رہے اب وہ بادشاہ کے ڈیرے پر موجود تھے۔

بادشاہ نے عمران کو ہر قسم کا اسلحہ چلانے کا طریقہ بتایا۔ نشانے بازی کی مشقیں کرواتا رہا۔ چند ماہ میں ہی عمران، بادشاہ کے رنگ میں رنگ چکا تھا۔

☆......☆......☆

ظلم، دہشت اور بربریت کی علامت درندہ چنگیز ہال کمرے کے عین وسط میں کھڑا تھا۔ آج چاند کی پہلی تاریخ تھی۔ وہ ایک معصوم بچے کے خون سے غسل کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ اسے رضوانہ کا پیغام ملا۔ "باس ریشماں نے ارشد صاحب کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتی ہے مر جائے گی پر گناہ نہیں کرے گی۔" رضوانہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"ریشماں سمیت سب لڑکیوں کو یہاں بلاؤ۔" چنگیز کے حکم پر پندرہ کے قریب لڑکیاں ہال میں جمع ہو گئیں۔ "ریشماں یہ میں کیا سن رہا ہوں میری حکم عدولی کا انجام جانتی ہو۔" بچے کے خون میں بھیگا چنگیز اس وقت خوفناک عفریب معلوم ہو رہا تھا۔

"میں برائی میں شریک ہونے سے مر جانا بہتر سمجھتی ہوں۔" ریشماں بہادری سے بولی۔

اسی لمحے چنگیز کے حکم پر آدم خور افریقی آ گئے انہوں نے اندر آتے ہی وحشت اور بربریت کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا کمرہ ریشماں کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔

بہت سی لڑکیاں وہ منظر دیکھتے ہی خوف و دہشت سے بے ہوش ہو چکی تھیں۔ وہ چاروں درندے بڑی بے دردی سے ریشماں کو ادھیڑ رہے تھے اور چنگیز دلچسپی سے وہ منظر دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

حیدر زمان کے بنگلے کے باہر گارڈ کرسی پر آنکھیں موند کر بیٹھا تھا۔ رات کے دو بجے کا وقت تھا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اچانک گارڈ کو عجیب سا احساس

ہوا اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے تین نقاب پوش کھڑے تھے۔ ایک کی رائفل اس کے سر سے لگی تھی۔ "ہلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہارے سر میں روشن دان کھول دوں گا، اندر کون کون ہے؟" رائفل بردار نے پوچھا۔

"اندر حیدر صاحب ان کی بیوی، بیٹی روبی اور بیٹا شہریار ہیں۔" گارڈ خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "گیٹ کھولو۔" رائفل بردار نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

گارڈ نے کانپتے ہاتھوں سے گیٹ کھولا۔ رائفل بردار نے رائفل کا دستہ گارڈ کے سر پر رسید کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ وہ آہستگی سے اندر داخل ہوئے گیٹ کے اندر موجود چھوٹے سے کمرے کے باہر کرسی پر ایک صحت مند چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے کندھے سے رائفل اتارنا چاہی۔ "خبردار اپنے ہاتھ رائفل سے پیچھے رکھو۔" ایک نقاب پوش اپنی رائفل کا رخ اس کی طرف کر کے بولا۔ "اس کمرے کے مکین کون کون سے کمرے میں ہیں؟" اس نے اپنی رائفل کی نالی اس کی گردن پر رکھی اور دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"پہلے کمرے میں حیدر صاحب اور ان کی بیگم، دوسرے کمرے میں چھوٹی بی بی روبی اور تیسرے کمرے میں شہریار صاحب، چوکیدار نے کہا۔

"چلو شہریار کے کمرے کی طرف۔" ایک نقاب پوش رائفل کی نال اس کی پشت سے لگا کر بولا۔

چوکیدار خوفزدہ سا کوریڈور میں چلنے لگا وہ انہیں لئے ہوئے شہریار کے کمرے تک جا پہنچا۔ "دروازے پر دستک دے کر اسے جگاؤ، کہو کہ اس کے باپ کو دل کا دورہ پڑا ہے۔" چوکیدار نے کانپتے ہاتھوں سے شہریار کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک پر شہریار کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ "کون ہے کیا تکلیف ہے؟"

"صاحب بڑے صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔"

چوکیدار کی آواز سنتے ہی شہریار نے دروازہ کھول دیا۔

جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھلا رائفل بردار نے رائفل کا دستہ چوکیدار کے سر پر رسید کر دیا۔ وہ کراہتا ہوا نیچے گر گیا۔ وہ تینوں اسلحہ تانے شہریار کو دھکیلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ شہریار گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ "کون ہو تم لوگ؟ شہریار نے پوچھا۔

"ہم باپ ہیں تمہارے۔" ایک نقاب پوش اس کے سینے پر رائفل کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"باہر چلو اور اپنے گھر والوں کو جگاؤ، چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو جان سے جاؤ گے۔" ایک نقاب پوش بولا۔

ان تینوں نقاب پوشوں نے جدید طرز کی آٹومیٹک رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ کسی بھی قسم کی چالاکی شہریار کو موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ شہریار نے ان کے کہنے پر صرف اور صرف عمل کیا۔

حیدر صاحب ان کی بیگم اور شہریار تھوڑی دیر بعد ایک کشادہ ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بندھے پڑے تھے۔ "دیکھو تمہیں جتنی دولت چاہئے لے جاؤ۔" حیدر صاحب خوفزدہ لہجے میں بولے۔ "چپ رہ بڈھے مال کی بات بعد میں کریں گے، آج تم لوگوں کا یوم حساب ہے۔" ایک نقاب پوش چہرے سے نقاب اتارتے ہوئے بولا۔

"خوف سے شہریار کا رنگ فق ہو گیا۔" مجھے پہچانا! میں رابعہ کا بھائی عمران، جس کی عزت تم چاروں نے لوٹ کر خونی درندے چنگیز کے حوالے کر دیا تھا۔ جہاں اس درندے نے اسے مار ڈالا، تمہارے جرم ناقابل معافی ہیں اور حیدر تم بھی بیٹے کے جرائم میں برابر کے شریک ہو، تم جانتے تھے کہ تمہارا بیٹا غریبوں کی عزت سے کھیلتا ہے، اس کے باوجود بھی تم اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، تمہاری یہ بیٹی روبی اس کے درجنوں بوائے فرینڈز ہیں، یہ پاک وصاف تو نہیں لیکن جو کچھ بھی کرتی رہی تمہاری لاعلمی میں، آج اس کے ساتھ میں جو کچھ کروں گا تمہارے سامنے تاکہ تمہیں احساس ہو کہ دوسروں کی بہن بیٹیوں پر جب ظلم ہوتا ہے تو ان پر کیا گزرتی ہے۔" عمران بولا اور روبی کی طرف بڑھا۔

"دیکھو ہمیں معاف کردو جتنی دولت چاہئے لے لو۔" حیدر صاحب گڑ گڑائے۔

"معافی کا وقت گزر چکا ہے۔ حیدر، اب میں بھی درندہ بن چکا ہوں، یہاں موت کا کھیل شروع ہوگا۔" عمران نے جھپٹا مار کر روبی کو پکڑ لیا۔

"اسے چھوڑ دے کمینے!" شہریار چلایا۔

"تکلیف ہوئی ناں، ایسی ہی تکلیف مجھے بھی ہوئی تھی، ان کو بھی ہوئی ہوگی جن کی بہن بیٹیوں کی تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے عزت لوٹی ہے۔ ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دو تا کہ یہ چیخ چلا نہ سکیں۔" عمران نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

ان تینوں کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے گئے۔ اب وہ بولنے اور چیخنے چلانے سے قاصر تھے۔ شہریار اپنی پشت پر بندھے ہاتھوں کو کھولنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ ناممکن تھا، اس کے ہاتھ مضبوطی سے بندھے تھے۔ عمران نے روبی کا وہی حشر کیا جو شہریار نے رابعہ کا کیا تھا۔ روبی پھٹے کپڑوں میں ایک طرف پڑی سسک رہی تھی۔

عمران نے اپنے پستول کا رخ شہریار کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا، کئی گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ شہریار کو مارنے کے بعد وہ لوگ بنگلے سے باہر نکل گئے۔

☆......☆......☆

رحیم صاحب ان دنوں اپنے بھائی عبدالکریم کے ساتھ رہ رہے تھے۔ سمیرا ان کا بہت خیال رکھتی تھی۔ دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز سن کر عبدالکریم دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھلتے ہی ایس ایچ او دلاور چار سپاہیوں اور ایک سب انسپکٹر کے ہمراہ انہیں دھکیلتا ہوا اندر گھس گیا۔

"کہاں چھپا رکھا ہے تم نے عمران کو؟" دلاور چیخا۔

"عمران کو تو عرصہ ہوا ہم نے دیکھا ہی نہیں۔" رحیم صاحب افسردہ لہجے میں بولے۔

"مکان کی تلاشی لو۔" دلاور کے حکم پر سب انسپکٹر سپاہیوں کے ہمراہ مکان کی تلاشی میں مصروف ہوگیا۔ پندرہ منٹ بعد سب انسپکٹر بولا۔ "سر یہاں پر عمران کہیں بھی نہیں، ہم نے پورے مکان کی تلاشی لے لی ہے۔"

"عمران نے جیل سے فرار ہونے کے بعد شہریار کو قتل کردیا ہے، روبی بی بی کی بے عزتی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر حیدر صاحب نے خودکشی کرلی ہے۔ اسے پناہ دینے کی کوشش مت کرنا اگر یہاں آئے تو پولیس کو اطلاع کرنا، ورنہ تم لوگوں کو شریک جرم سمجھ کر گرفتار کرلیا جائے گا۔" دلاور انہیں دھمکی دے کر اپنے سپاہیوں کے ہمراہ ان کے گھر سے نکل گیا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد دھپ کی آواز سنائی دے۔ صحن میں کھڑی سمیرا نے دیکھا، عمران دیوار سے کود کر گھر میں داخل ہوا تھا۔ "عمران تم۔"

وہ عمران کی طرف لپکی۔ "یہ تم کس راہ پر چل پڑے ہو۔ میرا کیا ہوگا، میں تمہارے بنا زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"سمیرا مجھے بھول جاؤ، میری راہیں بدل چکی ہیں، میں موت کا کھیل کھیل رہا ہوں جس کا انجام نہ جانے کیا ہو۔" عمران بولا اور رحیم صاحب کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

عمران کو کمرے میں آتا دیکھ کر رحیم صاحب نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ وہ رو رہے تھے۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو بیٹا، اپنے آپ کو قانون کے حوالے کردو، ہم قانون کے ذریعے رابعہ کے قاتلوں کو گرفتار کرالیں گے۔" رحیم بولے۔

"کون سا قانون! یہاں کا قانون آنکھوں سے اندھا اور کانوں سے بہرا ہے، میں انصاف خود کروں گا۔" عمران کے لہجے میں سختی تھی۔

"بیٹا تم نے جو اس لڑکی روبی کے ساتھ کیا، وہ غلط ہے، اگر تم بھی یہی کرو گے تو تم میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا۔"

"سوری بابا! آج کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔" عمران نے وعدہ کیا۔

"آئندہ احتیاط رکھنا اور یہاں مت آنا۔ ایس ایچ او دلاور تمہیں پاگل کتوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہے۔ کچھ دیر پہلے یہاں تلاشی لے کر گیا ہے۔" رحیم صاحب نے کہا۔

"سمیرا ابو کا خیال رکھنا۔"

"تم فکر مت کرو یہ میرے بھی باپ ہیں۔" سمیرا دکھی لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ عمران اس کی طرف سے نظریں چراتا ہوا دیوار پھلانگ کر گھر سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

سجاد اس وقت بڑے جہازی سائز کے نرم و گداز بیڈ پر لیٹا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی گرل فرینڈ زرینہ موجود تھی۔ سجاد نے شیشے کی میز پر سے شراب کی بوتل اٹھائی اور گلاس میں شراب انڈیلنے لگا۔ ابھی اس نے گلاس منہ سے لگایا ہی تھا کہ اس کا موبائل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر کسی پی سی او کا نمبر تھا۔ "ہیلو! سجاد بول رہا ہوں۔"

"بہت بول چکا، اب تیری بولتی بند ہونے کا وقت آ گیا ہے۔" دوسری طرف سے اجنبی آواز سنائی دی۔

"کون ہو تم اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔" سجاد نے پوچھا۔

"میں رابعہ کا بھائی عمران ہوں، وہ رابعہ جسے تم لوگوں نے اغوا کر کے خونی درندہ کے حوالے کردیا تھا۔"

"مسٹر یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا، میں سجاد ہوں، تم اپنی جان کی خیر مناؤ۔" کہہ کر سجاد نے موبائل آف کردیا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ زرینہ کے فلیٹ سے باہر نکلا اور اپنی کار کی طرف بڑھا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ بعد وہ اپنے گھر کے سامنے موجود تھا۔ ہارن بجانے پر بنگلے کا گیٹ کھلا۔ کار اندر کھڑی کر کے وہ جیسے ہی نیچے اترا۔ ایک ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے آ لگی۔ "سجاد مزاحمت کا خیال دل سے نکال دے، اندر ڈرائنگ روم میں تیری ماں اور بہن کو میرے آدمیوں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔" سختی سے عمران نے کہا۔

"اب اپنے فون سے دلاور کو کال کر کے کہہ کہ اگر وہ تجھے بچا سکتا ہے تو بچا لے، ہاں اس سے یہ بھی کہنا کہ اگلا شکار اس کا بیٹا خالد ہے۔"

خوف سے سجاد کی حالت ابتر ہوگئی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے جیب سے موبائل نکالا اور دلاور کا نمبر ملانے لگا۔ اس کی ٹانگیں خوف سے لڑکھڑا رہی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی وہ گر جائے گا۔ دوسری طرف سے کال اٹینڈ ہوتے ہی وہ بولا۔ "انکل سجاد بول رہا ہوں، مم مجھے اور میرے گھر والوں کو عمران نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ مم...... مجھے بچا...... لیں...... عمران کا کہنا ہے کہ میرے بعد آپ کے بیٹے کا نمبر ہے۔"

"گھبراؤ مت! میں آ رہا ہوں۔" دوسری طرف سے دلاور بولا۔ اسی لمحے عمران کے ریوالور سے گولی نکلی اور سجاد کی کنپٹی میں سوراخ ہوگیا۔ سجاد کے مرتے ہی عمران اور اس کے ساتھی فرار ہوگئے۔ سجاد کی ماں اور بہن ان کے جانے کے بعد روتے ہوئے آئیں اور سجاد کی لاش کے پاس بیٹھ کر رونے لگیں۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد پولیس موبائل سائرن بجاتی ہوئی ان کے گھر آ پہنچی۔ دلاور بھاگتا ہوا سپاہیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ سجاد کی لاش دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اب اسے اپنی اور اپنے بیٹے کی سلامتی مشکوک لگ رہی تھی۔

اسی لمحے اس کا فون بجا۔ "ہیلو! دلاور اسپیکنگ" وہ کال ریسیو کر کے بولا۔

"ڈی ایس پی وقار احمد بول رہا ہوں، دلاور یہ کیا ہو رہا ہے، پہلے شہریار کا قتل اور ہر ماہ معصوم بچے کو ذبح کر کے کوئی سڑکوں پر ڈال دیتا ہے، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ خونی درندے کون ہیں؟ جلد انہیں گرفتار کرو، ورنہ میں کیس تمہارے ہاتھ سے لے لوں گا۔" دوسری طرف کی بات سنتے ہی اسے پسینہ آ گیا۔

کیس ڈی ایس پی وقار احمد کے ہاتھ میں جانے کا مطلب، اس کا پول کھلنا تھا، ڈی ایس پی ایماندار پولیس افسر تھا، دلاور نے سجاد کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی۔

ڈی ایس پی وقار احمد اسمارٹ اور طویل قد و قامت کا تھا۔ قتل کی پے در پے وارداتیں اس کے لئے چیلنج بن چکی تھیں۔ پہلے رابعہ اور سلیم قریشی کا قتل پھر دلاور نے عمران کو

ان کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ عمران جیل سے بھاگ نکلا۔ اس کے بعد شہریار اور سجاد کا خون کرڈالا۔ ڈی ایس پی کو حیرت اس بات پر تھی کہ عمران نے شہریار اور سجاد کو قتل کیوں کیا۔ ادھر چاند کی ہر پہلی تاریخ کو کسی نہ کسی معصوم بچے کی گلا کٹی لاش مل رہی تھی۔

ڈی ایس پی نے اب کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس نے عمران کے والد سے بھی ملاقات کی۔ مگر انہوں نے بھی وقار احمد کو کوئی بات بتانے سے انکار کردیا۔

ملاقات کے دوران DSP نے ایک جگہ جدید مائیکروچپ چھپادی تھی۔ اب رحیم صاحب کے گھر کے اس کمرے میں ہونے والی گفتگو وہ دو کلومیٹر کے دائرے میں کہیں بھی سن سکتا تھا۔

اس کی یہ کوشش کچھ دن تو کامیاب رہی پھر ایک دن اسے کامیابی ملی۔ اسے فون کی گھنٹی سنائی دی۔ ”ہیلو! عمران بول رہا ہوں ابو کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ابو تو ٹھیک ٹھاک ہیں مگر تم کہاں ہو، کتنے دنوں سے تمہیں دیکھا نہیں پلیز! ایک بار مل لو۔“ لڑکی کی دلکش آواز سنائی دی۔

”میرا وہاں آنا مشکل ہے سمیرا وہاں خطرہ ہے۔“ عمران نے کہا۔

”پلیز! صرف ایک بار مل لو، پھر ضد نہیں کروں گی۔“ سمیرا نامی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ”اچھا ایسا کرو، فلاں جگہ مسٹر برگر ریسٹورنٹ میں آجاؤ میں کونے والی میز پر بیٹھا ملوں گا۔“

”ٹھیک دو گھنٹہ بعد۔“

”OK“ عمران بولا۔

”عمران تم یہ موت کا کھیل بند کیوں نہیں کردیتے۔“ سمیرا کی آواز سنائی دی۔

”نہیں جب تک میں رابعہ کے قاتلوں سے بدلہ نہ لے لوں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ وقار احمد نے ہیڈفون کانوں سے اتار کر میز پر رکھا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ اب ان کی کار کا رخ سمیرا کے گھر کی طرف تھا۔ انہوں نے گاڑی سمیرا کے گھر سے کچھ دور سڑک پر روکی تقریباً آدھے گھنٹے بعد سمیرا برقع اوڑھے گھر سے نکلی وہ چلتی ہوئی سڑک تک آئی اور سڑک کے کنارے کھڑی ہوگئی۔ ایک چھوٹا پرس اس کے شانے سے جھول رہا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک رکشہ آتا دکھائی دیا سمیرا نے ہاتھ کے اشارے سے رکشہ روکا اور اس میں بیٹھ گئی۔ اب وقار احمد خاصے فاصلے سے رکشہ کا تعاقب کررہے تھے۔ وہ آگے پیچھے چلتے مسٹر برگر تک جا پہنچے۔ سمیرا ریسٹورنٹ میں داخل ہوگئی۔ وقار احمد باہر ہی رک گئے۔ انہوں نے جیب سے موبائل فون نکالا اور تھانے سے نفری منگوانے لگے۔

سمیرا اور عمران کی گفتگو سے وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ رابعہ کے قتل کے الزام میں عمران کو بے گناہ پھنسایا گیا ہے۔ مگر عمران کا اختیار کردہ راستہ بھی ان کی نظر میں درست نہ تھا۔ قانون اپنے ہاتھوں میں لے کر عمران نے اپنے لئے مشکلات کھڑی کردی تھیں۔

سمیرا کونے والی ٹیبل پر پہنچی۔ عمران وہاں اداس بیٹھا تھا۔ ”کیسے ہو عمران؟“

”زندہ ہوں، ان خونی درندوں کے خاتمے تک مجھے کچھ نہیں ہوسکتا۔“ اسی دوران ویٹر کو قریب آتا دیکھ کر عمران نے کولڈ ڈرنک منگوالی۔ عمران سے بات کرتے کرتے سمیرا کی آواز رندھ گئی۔

عمران کی نظر شیشے کے دروازے پر پڑی جہاں سے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ پولیس کی وردی میں چند پولیس والے دروازے کی طرف آرہے تھے۔ عمران نے اپنے ہولسٹر سے پستول نکال لی اور پھرتی سے کرسی سے اتر کر اپنی پچھلی میز کی طرف بڑھا اس نے دائیں کرسی پر بیٹھی ایک لڑکی کی کنپٹی سے پستول لگادی۔ اٹھو جلدی وہ غرایا اسی لمحے پولیس ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی۔ عمران نے لڑکی کے گلے میں بازو ڈال کر اسے اپنے آگے کرلیا۔ ”خبردار کوئی آگے بڑھا تو میں اس لڑکی کو گولی ماردوں گا۔“

ریسٹورنٹ میں موجود بہت سے افراد میزوں کے نیچے دبک گئے۔

”عمران تم اپنے لئے مشکلات میں اضافہ کررہے ہو خود کو قانون کے حوالے کردو، ہم تم سے انصاف کریں گے۔“ وقار احمد بولے۔

”ڈی ایس پی یہ گولی کسی اور کو دینا اپنے پولیس والوں کو لے کر یہاں سے دور چلے جاؤ۔ اگر میرا پیچھا کرنے کی کوشش کی تو اس لڑکی کو گولی ماردوں گا۔“

”گو ہری اپ!“ پولیس وقار احمد کے اشارے پر ریسٹورنٹ سے باہر چلی گئی۔

عمران لڑکی کو گن پوائنٹ پر لئے ہوئے باہر نکلا۔ ”ڈی ایس پی اس لڑکی کی زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے میری طرف کوئی گولی آئی یا کسی نے میرا پیچھا کیا تو میں اسے گولی ماردوں گا۔ یہاں سے کچھ دور جا کر میں اس لڑکی کو آزاد کردوں گا۔“ لڑکی کو لئے ہوئے وہ ایک مہران کار کی طرف لپکا۔ لڑکی کو کار میں دھکیل کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھتا رہا۔ مگر کوئی بھی اس کے تعاقب میں نہ تھا۔ عمران نے ایک چوراہے پر لڑکی کو اتارا اور گاڑی چلادی۔ اگلی چورنگی پر اس نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کی اور قریب کھڑی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

بلیک ہنڈا اکارڈ سڑک پر دوڑتی جارہی تھی۔ فٹ پاتھ پر چلتی لڑکی کے قریب گاڑی رکی ان دونوں نے فٹ پاتھ پر چلتی لڑکی کو گاڑی میں گھسیٹ لیا اس سے پہلے کہ لڑکی شور مچاتی۔ وکی لڑکی کے منہ پر کلوروفارم سے بھیگا رومال رکھ چکا تھا۔ وہ لڑکی کو لے کر اپنے مخصوص ٹھکانے پر پہنچے۔ ہارن بجانے پر گیٹ کھلا۔ گاڑی کے اندر جاتے ہی گیٹ بند ہوگیا۔ وہ لڑکی کو لے کر گاڑی سے اترے اور چونک پڑے۔ چوکیدار کی جگہ کوئی دوسرا نوجوان کھڑا تھا۔

”کون ہو تم؟“ وکی نے پوچھا۔

”سر ہم غلام رسول کا بھائی ہے، اس کا بی بیمار تھا، وہ ام کو بٹھا کر گھر گیا ہے۔“ وہ نوجوان پشتو لب و لہجے میں بولا۔

”او کے! تم یہیں رہو اور خیال رکھنا اندر کوئی نہ آنے پائے۔“ وکی بولا۔ اور امجد کے ہمراہ لڑکی کو اٹھا کر بیڈروم میں چلا گیا۔ لڑکی کو بیڈ پر لٹا کر دونوں صوفوں پر بیٹھ کر شراب پینے لگے۔ ”یار! عمران نے ہمارے دو ساتھی مار ڈالے ہیں، کہیں اب ہمارے پیچھے نہ پڑ جائے۔“ وکی بولا۔

”عمران میرے پاپا کو نہیں جانتا، وہ اسے کتے کی موت ماردیں گے۔“ امجد نے کہا۔

اسی لمحے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی، وہ چونک کر مڑے تو دروازے میں ایک تنومند شخص کھڑا تھا۔ جس کی رائفل کا رخ ان کی طرف تھا۔

امجد نے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ ٹھک کی آواز ابھری اور اس کے ہاتھوں سے ریوالور نکل گیا۔

بیڈ کے نیچے سے عمران نکلا، اس کے پستول کی نال سے دھواں نکل رہا تھا۔ امجد نے اپنا زخمی ہاتھ تھام رکھا تھا۔

”دونوں سر سے ہاتھ بلند کرلو، میرا پستول بے آواز ہے۔“ ان دونوں نے اپنے ہاتھ اٹھالئے۔ عمران نے امجد کا نیچے گرا ریوالور اٹھالیا۔ تلاشی لے کر وکی کے ہولسٹر سے بھی ریوالور نکال لیا۔ ”تم حیران ہوگے کہ میں یہاں کیسے؟ تمہاری اس کوٹھی کا پتہ چلتے ہی کہ تم یہاں شیطانی کھیل کھیلتے ہو، میں یہاں بیڈ کے نیچے آ کر چھپ گیا جب تم لڑکی کو اغوا کررہے تھے تب بھی میرے آدمی تمہارا تعاقب کررہے تھے۔ ادھر ہم نے تمہارے چوکیدار کو قابو کرکے ایک کمرے میں باندھ دیا اور گیٹ پر اپنا آدمی کھڑا کردیا۔“ عمران نے وضاحت کی اور امجد کے گھٹنے پر گولی چلادی، وہ چیختا ہوا لڑکھڑا کر گرا۔

”مجھے معاف کردو۔ عمران“ وہ رینگتا ہوا عمران کے پاؤں کے پاس پہنچ گیا۔

وکی ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا۔ اب کے عمران نے دوسری گولی اس کے دوسری ٹانگ میں ماری۔ وہ چیختا چلاتا رہا اور عمران گولیاں برساتا رہا۔ بالآخر آخری گولی اس کی پیشانی میں لگی۔ ”ہاں بھئی وکی تمہاری زندگی ایک صورت میں بچ سکتی ہے۔“ عمران بولا۔

”وہ کیسے؟“ وکی نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

عمران نے اپنی جیب سے شراب کی چھوٹی بوتل نکالی اور وکی کی طرف بڑھادی۔ ”جلدی سے یہ شراب پی جا میرا وعدہ ہے کہ تمہیں نہیں روکوں گا۔“ عمران بولا۔

”وکی نے جلدی سے عمران کے ہاتھ سے بوتل لی

اور منہ سے لگا کر ایک ہی گھونٹ میں جلدی جلدی شراب پی لی۔ "اب وعدے کے مطابق مجھے چھوڑ دو۔" وکی گڑگڑایا۔

"چلو جاؤ! بھاگو جلدی۔" عمران نے کہا اور وکی سر پر پاؤں رکھ کر دوڑا۔ باہر کھڑی کار میں بیٹھا اور جلدی سے اسٹارٹ کر کے سڑک پر آ گیا۔ وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اچانک اسے دم گھٹتا محسوس ہوا اس نے اسٹیئرنگ چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لئے اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا، سانسوں کی ڈور ٹوٹنے لگی اس وقت کار بے قابو ہو کر سامنے سے آنے والے ڈمپر سے ٹکرا گئی۔

☆......☆......☆

دلاور کی راتوں کی نیند اڑ چکی تھی۔ "چنگیز مجھے بچالو، میں نے ہر موڑ پر تمہارا ساتھ دیا ہے۔ تمہارے لئے ہر غیر قانونی کام کیا ہے، اب مجھے عمران سے بچالو۔" وہ چنگیز کے آگے گڑگڑا رہا تھا۔

"تم فکر مت کرو! آج ہم عمران کا خاتمہ کردیں گے۔" چنگیز نے اسے تسلی دی۔

اسی لمحہ اس کا موبائل بجا۔ "ہاں بولو! باس ہم نے عمران کا پتہ چلالیا ہے، وہ بادشاہ کے ٹھکانے پر ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"او کے تم لوگ تیاری کرلو، ہم آج رات ہی بادشاہ کے ٹھکانے پر حملہ کریں گے۔" چنگیز نے اسے حکم دیا اور موبائل آف کردیا۔

"دلاور اب تم سکون سے جاکر سوجاؤ، آج کی رات عمران کی زندگی کی آخری رات ہے، ہم آج رات اپنی پوری طاقت کے ساتھ بادشاہ کے ٹھکانے پر حملہ کردیں گے۔" چنگیز سفاکانہ لہجے میں بولا۔

چنگیز جب اپنے آدمیوں کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہوا تو اس کے آگے پیچھے آٹھ گاڑیاں تھیں، وہ بادشاہ کے ٹھکانے پر دائیں بائیں پہنچ کر محاصرہ کرنے لگے۔

چنگیز بلند آواز سے چلایا۔ "بادشاہ تم چاروں طرف سے میرے گھیرے میں ہو۔ عمران کو لے کر عمارت سے باہر آجاؤ، ورنہ ہم پوری عمارت کو دستی بموں سے اڑا دیں گے۔"

اسی لمحے دو منزلہ عمارت کی ایک کھڑکی سے برسٹ مارا گیا۔ تو پھر چنگیز کے حکم پر فائر کھول دیا گیا۔ ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے چنگیز کے آدمی عمارت پر دستی بم بھی برساتے رہے تھے۔

عمارت دھماکوں سے لرز اٹھی۔ عمارت سے نکلنے والا ہر شخص ان کی گولیوں کے نشانے پر تھا۔ بادشاہ لاعلمی میں چنگیز کے گھیرے میں آچکا تھا۔ "اب بھی وقت ہے بادشاہ۔ ہتھیار ڈال کر باہر آجاؤ، تم چاروں طرف سے ہمارے گھیرے میں ہو۔"

"ہم ہتھیار پھینکنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ عمران اس وقت یہاں نہیں ہے۔" بادشاہ کی آواز سنائی دی۔

"بادشاہ میرے آدمیوں نے چاروں طرف مورچے بنا رکھے ہیں، تمہارے بہت سے آدمی مارے جاچکے ہیں، تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کردو۔" چنگیز بولا۔ اندر بھگدڑ مچ چکی تھی۔ بادشاہ کے بچ جانے والے ساتھی دستی بموں سے خوفزدہ ہو کر عمارت سے نکل کر احاطے میں چھپ رہے تھے اور مورچے بنا رہے تھے۔

چنگیز اپنے ایک درجن افراد کے ہمراہ دیوار پھلانگ کر عمارت کے احاطے میں داخل ہوگیا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھی سے قد آور بادشاہ نکل رہا تھا۔ اس نے صرف جینز پہن رکھی تھی۔ اوپری جسم ننگا تھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ بادشاہ نے دونوں ہاتھوں میں رائفل تھام رکھی تھی۔ جس کا رخ ان کی طرف تھا۔

"بادشاہ رائفل پھینک دو، تم ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتے۔" چنگیز دھاڑا۔

اسی لمحے بادشاہ نے لگاتار چار فائر کئے۔ گولی کھا کر چنگیز کے چار ساتھی چیختے ہوئے گرے۔ چنگیز اور اس کے بچ جانے والے ساتھیوں نے بادشاہ پر فائر کھول دیا۔ بادشاہ کا جسم گولیوں سے چھلنی ہوگیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔ انہوں نے پوری عمارت کی تلاشی لی۔ چاروں طرف لاشیں بکھری پڑی

تھیں۔ عمران کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

عمران یہاں حملے سے پیشتر چنگیز کے خاتمہ کے لئے روانہ ہوچکا تھا۔ چنگیز کی عمارت تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی بس چند ایک کھڑکیوں میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ عمارت کے گیٹ پر مسلح گارڈ کھڑا تھا۔ اپنی جگہ دبکے ہوئے عمران کرالنگ کرتا ہوا آگے بڑھا، اپنے سائلنسر لگے پستول سے گارڈ کا نشانہ لیا اور فائر کردیا۔ گولی گارڈ کی پیشانی میں لگی، وہ بنا آواز نکالے دھب کی آواز کے ساتھ نیچے گر پڑا۔ عمارت کے اطراف چکر لگانے والے دوسرے گارڈ گرنے والے گارڈ کی طرف لپکے۔ جیسے ہی وہ لاش کے قریب پہنچے دو اور فائر ہوئے، وہ دونوں بھی سر میں گولی کھا کر جہنم واصل ہوگئے۔ یہ عمران کی بے مثال نشانے بازی تھی۔ عمران گیٹ کے قریب پہنچا۔ دھکیل کر گیٹ کھولا اور دبے قدموں عمارت میں گھس گیا۔

اچانک ایک طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ دو بھاری بھرکم کتے اس کی طرف لپک رہے تھے۔ اس نے پے در پے فائر کر کے اس پر جست لگانے سے پہلے ہی کتوں کے جسم گولیوں سے چھلنی ہوگئے۔ کتوں کے پیچھے چند افراد بھی اس کی طرف لپک رہے تھے۔ اس نے پستول سیدھا کر کے فائر کرنا چاہا۔ مگر پستول میں گولیاں ختم ہوچکی تھیں۔

دشمن سر پر تھا پستول لوڈ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے پستول ہولسٹر میں رکھ کر پنڈلی سے بندھا خنجر نکال لیا۔ تین تنومند افراد اس پر جھپٹے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ سر پر کفن باندھ کر آیا ہے اس نے آگے بڑھ کر ایک شخص کے رائفل کے دستے سے بچنے کے لئے جھکائی دی اور اپنا خنجر دستے تک اس کی گردن میں اتار دیا۔ اس کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخ بہت ہی بھیانک تھی۔ اس کا خنجر دوسرے شخص کے سینے میں جا گھسا۔ وہ بھی چیختا ہوا وہیں ڈھیر ہوگیا۔ ان کے پیچھے مزید دو افراد کو بھی عمران نے خنجر رسید کردیئے، پھر خنجر دوبارہ پنڈلی سے باندھ کر ایک گارڈ کی رائفل اٹھالی۔ سامنے سے رائفلیں اٹھائے دو افراد مزید آرہے تھے۔ جو عمران کی رائفل سے نکلنے والی گولیوں

کا شکار ہوگئے۔ قریب ہی ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی اتفا[ق سے] اس میں چابی موجود تھی۔ اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور طوفانی رفتار سے راہداری میں موجود دروازے کی طرف لپکا موٹر سائیکل دروازے سے ٹکرائی اور شیشے کے دروازے کے پرخچے اڑ گئے۔

عمران کے بدن پر خراشیں آچکی تھیں رائفل نیچے گر چکی تھی وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ پھر وہ لڑکھڑا کر گر پڑا اور ہوش سے بیگانہ ہوگیا وہ زخموں سے چور تھا۔

لینڈ کروزر سے چنگیز اپنے ساتھیوں کے ساتھ اترا، اس کے پیچھے آنے والی اس کے ساتھیوں کی گاڑیاں بھی رک گئیں۔ چنگیز نیچے گرے عمران کی طرف بڑھا۔ عمران بے حس و حرکت پڑا تھا۔

ایس ایچ او دلاور بھی اس وقت چنگیز کے ساتھ تھا۔ دلاور، عمران کی کلائی تھام کر اس کی نبض سے انداز[ہ] لگانے لگا۔ پھر وہ خوشی سے اچھلنے لگا۔ "ہمارا دشمن مار[ا] گیا۔ اس کی لاش کہیں کچرے میں ڈال دو۔" اس کے بعد دلاور اپنے گھر آ گیا۔

رات اپنے نصف میں داخل ہوچکی تھی۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ دلاور اپنے بیڈ روم کی کرسی پر مضطرب بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے لباس میں ریوالور چھپا رکھا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو بھی دوسرے کمرے میں سونے کو کہا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے اس کا یہی معمول تھا۔ عمران کو سڑک پر لاوارث حالت میں بے جان پڑے دیکھنے کے باوجود بھی اس کے دل و دماغ پر عمران کا خوف چھا چکا تھا۔ ہر ظالم اندر سے بزدل ہوتا ہے۔ موت کے خوف سے اس کی آنکھوں کی نیند اڑ چکی تھی۔ وہ کوئی 25 ویں مرتبہ اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کے پاس آیا اور ذرا پردہ سرکا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا یہاں سے بیرونی گیٹ اور باہر کا حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار اور پولیس کے دو سپاہی چوکس کھڑے تھے۔ وہ مطمئن ہو کر دوبارہ کرسی کی طرف آ گیا۔ کرسی پر بیٹھ کر میز پر سے شراب کی بوتل اٹھائی اور گلاس میں انڈیل کر پینے لگا۔ اچانک اسے یوں لگا کہ اس کے بالکل قریب کوئی ہے دلاور کو اپنے رگ و پے میں سرد لہر دوڑتی محسوس

ہوئی اس نے مڑنا چاہا مگر اس کا موقع اسے نہ ملا۔ ایک نقاب پوش نے تیز دھار خنجر اس کے دل میں اتار دیا، ساتھ ہی اس کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ بھی رکھ لیا، دلاور کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

☆......☆......☆

وہ دونوں ایک مشہور ٹی وی چینل سے وابستہ تھے۔ فہیم کا تعلق امیر گھرانے سے تھا وہ اپنے شوق کی خاطر اور پوشیدہ چہروں سے پردہ اتارنے کے لئے اس فیلڈ میں آیا تھا۔ وہ ہفتہ وار کرائم پروگرام کا میزبان بھی تھا۔ زوبی اس کی معاون تھی۔ زوبی کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ دونوں آپس میں پیار بھی کرتے تھے اس وقت وہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے کہ فہیم کے موبائل کے فون کی گھنٹی بجی۔ "مسٹر فہیم میں جرائم کے بہت بڑے اڈے کی نشاندہی ثبوت کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں معصوم بچوں کو ذبح کر کے ان کے خون سے خونی درندے نہاتے ہیں۔ لڑکیوں کو آدم خوروں کے آگے ڈالا جاتا ہے ان سے عصمت فروشی کروائی جاتی ہے ساتھ ہی ٹارگٹ کلر بھی وہاں دستیاب ہیں۔" دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی کہا گیا۔

"مگر آپ کون ہیں؟ اور میرا نمبر آپ کو کیسے ملا۔"

"میرے نام کو چھوڑو رہی نمبر کی بات تو ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے میں جانتا ہوں کہ تم اپنے پیشے سے مخلص ہو۔ اس کے باوجود تاکید کرتا ہوں کہ اس کال کے بارے میں کسی سے ذکر مت کرنا۔ کل ایک صوبائی وزیر کی بیٹی کی سالگرہ کی تقریب ہے تم کسی طرح وہاں داخلے کی اجازت لے لو اور وہاں لائیو پروگرام کی ٹیلی کاسٹنگ کا انتظام بھی رکھنا۔ تمہیں وہاں ہونے والے جرائم کی فلم بنانا ہوگی۔" دوسری طرف سے اجنبی نے کہا۔ "مگر میں تمہیں پہچانوں گا کیسے اور اس تقریب کا اڈے سے کیا تعلق ہے؟" فہیم نے پوچھا۔ "میں خود تم تک پہنچ جاؤں گا فکر مت کرو۔" دوسری طرف سے موبائل آف کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

رنگ، خوشبو، روشنی سے محفل جگمگا رہی تھی۔ یہ ایک وزیر کی بیٹی کی سالگرہ کی تقریب تھی اس محفل میں ہر قابل ذکر شخصیت مدعو تھی۔ سیکورٹی کا انتظام بھی عمدہ تھا۔ مشہور و معروف گلوکار و اداکار غرض کہ ہر شعبے سے متعلق شخصیت مدعو تھی۔ چنگیز اس محفل کا خاص مہمان تھا۔ اس محفل کے حاضرین کی اکثریت اس کی اصلیت سے آگاہ نہ تھی۔

ڈی ایس پی وقار احمد بھی سیکورٹی انتظامات کی چیکنگ کر رہے تھے۔

فہیم اور زوبی تقریب کی عکس بندی کر رہے تھے کئی ویٹر ٹرالی لئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

ٹرالیوں پر قسم قسم کے مشروبوں کی بڑی مقدار تھی۔ چنگیز وزیر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ تقریب لائیو ٹیلی کاسٹ ہو رہی تھی۔ ایک گہری سانولی رنگت اور گھنی داڑھی مونچھوں والا ویٹر ٹرالی چلاتا ہوا وزیر اور چنگیز کے قریب پہنچا۔ اس نے سوفٹ کولڈ ڈرنک کے گلاس وزیر اور چنگیز کے آگے رکھے ان دونوں نے گلاسوں کی طرف ہاتھ بڑھائے اسی لمحے ویٹر کے ہاتھ میں نہ جانے کہاں سے پستول آ گیا جسے اس نے چنگیز کی کنپٹی سے لگا دیا۔

محفل میں موجود گارڈ اور پولیس اہلکاروں نے اپنے ہتھیار نکال کر ویٹر کی طرف تان لئے۔

اپنا پستول پھینک دو ورنہ اپنی جان سے جاؤ گے تم ہمارے نشانے پر ہو۔" ڈی ایس پی وقار احمد بولے۔

"ڈی ایس پی اگر میری طرف کوئی گولی آئی یا کسی نے کسی قسم کی حرکت کی تو میرے ساتھ ساتھ اس محفل میں موجود ہر شخص اپنی جان سے جائے گا، میرے سینے پر خودکش جیکٹ موجود ہے۔" ویٹر گونجیلی آواز میں بولا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنی شرٹ کے سامنے کے بٹن کھول ڈالے، اس کا پستول اب تک چنگیز کی کنپٹی سے لگا تھا۔ اس کی شرٹ کے بٹن کھلتے ہی سب کی آنکھیں حیرت و خوف سے پھٹنے لگیں۔ اس کے سینے پر خودکش جیکٹ بندھی تھی۔

"میں پھر کہتا ہوں کوئی گولی نہ چلائے اور نہ کسی قسم کی غلط حرکت کرے۔" ویٹر نے لپکتے ہوئے اپنی نقلی داڑھی مونچھیں اتاریں ساتھ ہی اس نے اپنے چہرے سے جعلی نما ماسک اتار دیا۔

ڈی ایس پی وقار احمد حیرت سے اچھل پڑے۔ وہ عمران تھا۔ "تم زندہ ہو!" چنگیز بوکھلا گیا۔

"مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ چنگیز مجھے تم لوگوں نے مرا ہوا سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ وہاں سے ایک ڈاکٹر کا گزر ہوا جس نے میرا علاج کیا، میری کہانی سن کر میری درخواست پر اس نے مجھے چھپا کر رکھا۔ اب تم اپنی اصلیت بیان کرو، ورنہ یہیں تمہارا "دی اینڈ" ہو جائے گا۔ بول تیرا کاروبار کیا ہے؟ میری بہن کا قاتل کون ہے؟ ہر چاند کی پہلی تاریخ کو معصوم بچوں کے خون سے کون نہاتا ہے؟"

عمران غرایا اور ساتھ ہی اس کے بازو پر گولی ماری چنگیز نے چیختے ہوئے اپنے زخمی بازو کو دوسرے ہاتھ سے تھام لیا۔ "جلدی بول، ورنہ دوسری گولی تیرے سر میں اترے گی۔" عمران کے لہجے میں درندگی تھی۔ "میں صرف تین تک گنوں گا۔ ون......ٹو۔"

"ٹو" چنگیز دہشت و بربریت کی علامت اس وقت خود موت کی دہشت میں مبتلا تھا۔ وہ بولنا شروع ہو گیا۔ پوری تقریب میں شامل افراد اس کی زبانی دہشت ناک کہانی سن رہے تھے۔

"رابعہ کا قتل میں نے کیا ہے، اسے اغوا کر کے مجھ تک وکی، شہریار، امجد اور سجاد نے پہنچایا تھا۔ ایس ایچ او دلاور میرا دست راست تھا۔ میں نے افریقہ کے آدم خور قبائل سے چار آدم خور منگوائے تھے، اپنی بات نہ ماننے والی لڑکیوں کو میں ان آدم خوروں کو کھلا دیا کرتا تھا۔ میں ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوں جو لاعلاج ہے۔ ایک ہندو پرتاب کے کہنے پر چاند کی پہلی تاریخ کو معصوم بچے کے خون سے نہاتا تھا۔ پرتاب کا کہنا تھا کہ سو بچوں کے خون سے نہانے کے بعد میری بیماری ختم ہو جائے گی۔ اب تک میں نوے بچوں کے خون سے نہا چکا ہوں۔" چنگیز کی داستان سن کر محفل میں موجود لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

فہیم اور زوبی یہاں ہونے والی تقریب کو براہ راست ٹیلی کاسٹ کر رہے تھے، یہ پروگرام اس وقت پورے ملک کی ٹیلی ویژن اسکرینوں پر چل رہا تھا۔

"عمران اب یہ جیکٹ اتار کر خود کو قانون کے حوالے کر دو، ہم سچائی جان چکے ہیں، تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔" ڈی ایس پی وقار احمد بولے۔

"سر اس جیکٹ کو اتارنا میرے بس سے باہر ہے جیسے ہی اسے کھولنے کی کوشش کی یہ بلاسٹ ہو جائے گی یہ انتہائی طاقتور بم ہیں۔ چنگیز تم میرے ساتھ اپنے ٹھکانے پر چلو گے۔ اگر مزاحمت نہیں کی تو میرا وعدہ ہے تمہیں گولی نہیں ماروں گا۔ ڈی ایس پی ہمارے ساتھ بطور ضمانت جائیں گے تاکہ کوئی غلط حرکت نہ ہو، مسٹر فہیم اور زوبی تم لوگ اپنی ٹیم کے ہمراہ وہاں فلم بنانے جاؤ گے، ڈرنا مت تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ سب لوگ ایک سائیڈ پر ہو جائیں۔ ڈی ایس پی تم آگے چلو، تم ہی چلو۔" عمران نے چنگیز کو لات رسید کی۔

عمران! چنگیز وقار احمد کو گن پوائنٹ پر رکھے ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ فہیم اور زوبی اپنے عملے کے ہمراہ ان کے پیچھے تھے۔ ڈی ایس پی جو کہ اصلیت سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس نے سب کو حکم دیا نہ ہی کوئی گولی چلائے اور نہ ہی کوئی ہمرا پیچھا کرے عمران ان دونوں کو گن پوائنٹ پر لئے باہر نکلا۔ ڈے ایس پی عمران کے کہنے پر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ عمران چنگیز کے ہمراہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا، اس کے پستول کی نال اب تک چنگیز کی کنپٹی پر تھی۔

چنگیز عمران کے جسم پر خودکش جیکٹ دیکھ چکا تھا۔

فہیم اور زوبی اپنے عملے کے ہمراہ دوسری گاڑی میں بیٹھے۔ اب ان کی گاڑیاں چنگیز کے ٹھکانے کی طرف رواں دواں تھیں۔ آدھے گھنٹے بعد وہ چنگیز کی عمارت کے گیٹ پر تھے۔ چنگیز کے اشارے پر گارڈ نے گیٹ کھولا۔

اور گاڑیاں عمارت کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔ وہ گاڑیوں سے اترے چنگیز اور ڈی ایس پی کے پیچھے عمران پستول چنگیز کی کنپٹی سے لگائے آگے بڑھ رہا تھا پیچھے زوبی اور فہیم اپنے عملے کے ہمراہ فلم بناتے آ رہے تھے۔ وہ مختلف راہداریوں سے ہوتے ہوئے ہال نما کمرے میں پہنچے۔ راستے میں کھڑے ہر گارڈ کو چنگیز سمجھاتا ہوا آ رہا تھا کہ کوئی

غلط حرکت نہ کرے۔ چنگیز کے پالتو غنڈے حیرت سے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔

ہال نما کمرے میں پہنچ کر عمران کے کہنے پر عمارت میں موجود اغوا کی گئی لڑکیوں کو ہال میں بلوایا گیا۔

فہیم لڑکیوں سے انٹرویو لینے لگا۔

ڈی ایس پی اب آپ ان لڑکیوں کو لے کر فہیم اور زوبی کے ہمراہ باہر دائیں جائیں۔ میں ان لوگوں سے معاملات طے کر کے آتا ہوں۔" عمران نے کہا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو۔" وقاز احمد کے لہجے میں شک تھا۔

"ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں، ویسے بھی اب یہ خونی درندے بے بس ہو چکے ہیں۔" عمران نے کہا۔

ڈی ایس پی وقار احمد فہیم، زوبی اور تمام لڑکیوں کو لے کر عمارت سے باہر چلے گئے عمران کے کہنے پر چنگیز نے اپنے غنڈوں کو حکم دیا کہ "ان سب کو آزادی سے باہر جانے دو۔"

کچھ دیر بعد جب عمران کو اندازہ ہوا کہ سب عمارت سے نکل چکے ہوں گے عمران نے کہا۔ "اپنے سب آدمیوں کو ہال میں بلاؤ۔"

"مگر کیوں؟" چنگیز حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"میں سب کی موجودگی میں معاملات طے کرنا چاہتا ہوں۔ معاملات طے کرنے کے بعد میں باہر چلا جاؤں گا۔" عمران بولا۔

چنگیز نے حکم دے کر آدم خوروں سمیت سب کو ہال میں منگوالیا۔ عمران کے حکم سے ہال کا دروازہ بھی بند کرلیا گیا۔

عمران نے جیب سے موبائل فون نکالا اور ڈی ایس پی کا نمبر ملایا۔ "ہیلو۔" دوسری طرف سے ڈی ایس پی کی آواز سنائی دی۔ ڈی ایس پی نے کال ریسیو کرتے ہی فون کا اسپیکر کھول دیا۔ عمارت کے سامنے کچھ فاصلے پر ڈی ایس پی ہیں بیس لڑکیاں، فہیم، زوبی موجود تھے دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار بھی پہنچ چکے تھے۔ فہیم اور زوبی بدستور فلم بندی میں مصروف تھے۔

"عمران جلدی سے باہر آجاؤ۔" ڈی ایس پی بولے۔

"جب انسان کے لئے زندگی میں کرنے کے لئے کچھ نہ ہو تو انجان دنیا کے سفر پر روانہ ہو جانا چاہئے، سمیرا ابو اور انکل سے میری طرف سے معافی مانگنا میں قانون کا بھی مجرم ہوں۔" عمران بولا۔

"نہیں عمران تم نے کوئی جرم نہیں کیا جو کام ہم قانون کے رکھوالوں کو کرنا چاہئے تھا، وہ تم نے کیا ہے، تم نے خونی درندوں سے بہت سے لوگوں کو نجات دلوائی ہے۔" ڈی ایس پی بولے۔

"سر آپ لوگ دو منٹ میں اس عمارت سے دور چلے جائیں، اس خودکش جیکٹ کو اتارنا میرے لئے ناممکن ہے۔" اس کے ساتھ ہی عمران نے موبائل فون آف کردیا۔

"عمران!" ڈی ایس صاحب چلائے اور پھر وہ سب عمارت سے تیزی سے دور جانے لگے۔

عمران کی موبائل پر گفتگو بھی ٹیلی کاسٹ ہو رہی تھی۔ سمیرا رحیم صاحب، عبدالکریم صاحب ٹی وی کے سامنے موجود تھے، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے سمیرا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"پاگل! کوئی حماقت مت کرنا، ہمارے ساتھ تم بھی مرو گے۔" چنگیز! خوف سے چلایا، خوف و دہشت سے چنگیز اور اس کے ساتھیوں کے چہرے زرد پڑ چکے تھے۔

"تم تو موت کے کھلاڑی ہو۔ تم خونی درندہ ہو، پھر موت سے ڈر کیوں رہے ہو؟" عمران نے کلمہ پڑھ کر بم بلاسٹ کردیا۔

زوردار دھماکہ ہوا، پوری عمارت لرزتی ہوئی اپنے مکینوں کے ساتھ زمین بوس ہوگئی۔

سمیرا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ انجان راہوں کا مسافر اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ مگر جاتے جاتے خونی درندوں اور ان کے ظلم و ستم کا خاتمہ کر دیا تھا۔

پراسرار کنواں

علی کاشف آفاقی - آزاد کشمیر

اچانک نوجوان نے کنوئیں میں چھلانگ لگادی اور پھر کنوئیں کی عمیق گھرائی میں اترتا چلاگیا، تھہ میں اسے ایک پوٹلی ملی جسے لے کر وہ ہوا میں اڑتا ہوا کنوئیں سے باھر نکل آیا اور پھر ......

سنسان ویران اور ہیبت ناک ماحول میں جنم لینے والی ایک حقیقت پر مبنی کہانی

دن کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ سورج کی تپش ہر شے کو گرما رہی تھی مگر میرا سر کچھ زیادہ ہی گرم ہو رہا تھا۔ میں ایک ہاتھ میں ڈول لے کر جس کے ذریعے سے پانی نکالتے ہیں۔

پہاڑی زبان میں اسے لوٹا کہتے ہیں۔ اور دوسرے ہاتھ میں گھڑا پکڑے تیزی سے کنوئیں کی سمت جا رہا تھا۔ کنواں کھیتوں کی دوسری طرف ایک سنسان جگہ پر تھا۔ کنوئیں کے قریب سے ہی گھنے جنگلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو مشرق کی طرف بہت آگے تک چلا جاتا ہے۔ وہ جون کا مہینہ تھا۔ ویسے بھی گرمیوں میں ہمارے گاؤں میں پانی ختم ہو جاتا تھا اور ہم اس سنسان جگہ پر واقع کنوئیں سے پانی لاتے تھے۔ لیکن اس دفعہ اتنی شدید گرمی پڑی کے ہمارے گاؤں کا چشمہ بالکل سوکھ گیا اور پورے گاؤں کا پانی کا دارومدار اس کنوئیں پر تھا۔ جو نہ جانے کس نے کھدوایا تھا۔

اتنا ضرور سنتے تھے کہ پرانے زمانے میں کسی ہندو نے اس کنوئیں کو کھدوایا تھا۔ اور پھر وہ ہندو مر گیا اسی کنوئیں میں گر کر۔ اس کے بعد لوگوں نے اس طرف جانا بھی چھوڑ دیا کیونکہ کنواں آسیب زدہ ہو گیا تھا۔ دن کے بارہ بجے اور رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہاں سے سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ جیسے کوئی بڑے کرب سے دوچار ہو۔ لیکن ضرورت انسان سے سب کچھ کرنا لیتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب ہندوستان سے مسلمان ہجرت کر کے ادھر آئے تو

انہیں پتہ چلا کہ یہ آسیب زدہ ہے، اس میں جن بھوت رہتے ہیں۔ وہاں سے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ سب ان پڑھ اور توہم پرست لوگ تھے انہوں نے یقین کرلیا اور گاؤں کے قریب موجود ایک چھوٹے سے چشمے سے پانی بھرنے لگے اور نظام زندگی چلنے لگا۔ لیکن اس میں ایک قباحت تھی کہ گرمیوں میں وہ چشمہ خشک ہوجاتا اور لوگوں کو اتنی دور سے پانی لانا پڑتا کہ لوگ نڈھال ہوجاتے تھے۔ ایسی صورت حال میں ایک صبح گاؤں کے سارے لوگ اکھٹے تھے اور اس مسئلے پر بحث کررہے تھے کہ پانی کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔ اچانک بابا سمارو (دیہات میں اکثر لوگ اپنے بچوں کا نام اس دن پر رکھ دیتے تھے جس دن وہ پیدا ہوا ہو۔ بابا سمارو شاید سموار والے دن پیدا ہوئے تھے اسی لئے ان کا نام سمارو پڑ گیا تھا۔ بہرحال پرانی باتیں ہیں اب دیہاتوں کے لوگ بھی ماڈرن ہورہے ہیں) کہنے لگے۔

"میں کہتا ہوں کہ اسی کنوئیں پر چلتے ہیں۔"

ماجھے نے پوچھا۔ "کس کنوئیں پر بابا؟"

بابا سمارو نے جواب دیا۔ "وہی جو ہمارے گاؤں کے قریب ہے اور جہاں سے پانی بھرنا چھوڑ دیا گیا ہے۔"

یہ سن کر دینا کمہار بدک کر بولا۔ "نہ بابا نہ وہاں جن بھوت ہوتے ہیں، وہ پانی بھرنے والوں کو اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیں گے۔"

لیکن بابا سمارو کہنے لگے۔ "میں کہتا ہوں وہاں چلو۔ جن بھوت بارہ بجے ہوتے ہیں یا رات میں صبح شام کو تو نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔ کیونکہ ہمیں ضرورت ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ چلو وہاں۔ وہاں بیٹھے اکثر لوگوں نے بابا سمارو کی تائید کی اور پھر گھڑے وغیرہ اٹھا کر کنوئیں کی طرف چلے خیر وہ بخیریت پانی بھر کر لوٹ آئے۔

لوگوں میں آہستہ آہستہ اس کنوئیں کا خوف ختم ہونے لگا۔ مگر مکمل طور پر نہیں۔ پانی بھرنے والے صرف صبح جاتے تھے دس بجے تک۔ اور پھر ظہر کے بعد جاتے تھے عصر تک۔ گوکہ آج تک کسی نے وہاں سے رونے کی آوازیں نہیں سنیں۔ مگر ان کربناک سنائی دینے والی آوازوں کا خوف لوگوں کے دماغ میں ضرور تھا۔

یہ سب باتیں مجھے میرے دادا نے بتائی تھیں۔ جو اس وقت کافی سمجھدار تھے اور بابا سمارو تو عرصے کا فوت ہوچکے تھے۔

خیر ماضی کی یہ سنی سنائی باتیں سوچتا ہوا میں کنوئیں پر جا پہنچا۔ گھڑا رکھ کر میں نے کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ "اگر واقعی یہ کنواں آسیب زدہ ہوا اور جن بھوت میرے سامنے آگئے تو کیا ہوگا؟" اس خیال کے آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں فطرتاً نڈر، ضدی اور کڑوا سا آدمی تھا۔ ذرا سی تیزی اور ترش والی بات برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

چونکہ گرمی بہت زیادہ تھی۔ میں شہر سے سودا سلف لاکر واپس پہنچا تو گیارہ بج رہے تھے۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد میرا نہانے کا ارادہ ہوا۔ بڑے ڈرم سے پانی بالٹی میں ڈالنے کے بعد بالٹی اٹھا کر چلنے لگا تو اچانک ٹھوکر لگی اور بالٹی الٹ گئی۔ پانی پورے کمرے میں پھیل گیا۔ یہ دیکھ کر میرے چھوٹے بھائی نے شور مچادیا۔ بھائی نے سارا پانی گرا دیا بالٹی سے۔ اس نے مجھے تپانے کے لئے کہا تھا اور میں واقعی تپ گیا۔ اتنے میں میرے ابو وہاں آگئے۔ پورے کمرے میں بکھرا پانی دیکھ کر وہ مجھے ڈانٹنے لگے۔ ان کے ڈانٹ ڈپٹ سن کر میرا دماغ گھوم گیا۔ میں ذرا اونچی بات برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ "جو پانی میرے ہاتھوں ضائع ہوا ہے۔ ابھی بھر لاؤں گا۔" یہ سوچتے ہی میں نے گھڑا اور ڈول اٹھایا اور کنوئیں کی جانب چل پڑا۔

اب میرے گھر والوں نے شور مچانا شروع کردیا۔ "نہ جاؤ" مگر میں سنتا کس کی تھا۔ وہ سمجھاتے رہے مگر میں غصے سے تلملاتا ہوا کنوئیں پر جا پہنچا اور پھر اس خیال نے مجھے اپنے شکنجے میں لے لیا۔ کہ اگر جن بھوت والی بات سچی ہوئی تو کیا ہوگا؟

اسی سوچ نے میرے رونگٹے کھڑے کردیئے۔

بے شک میں نڈر تھا مگر جنوں بھوتوں کا نام ہی ایسا خوفناک ہے کہ آدمی لرز جاتا ہے۔

بہرحال پانی بھرنا تو تھا، سو میں جلدی جلدی گھڑا بھرنے لگا۔ اس دوران کئی دفعہ ایسا بھی احساس ہوا کہ جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہے اس احساس نے مجھے مزید ڈرادیا، میں نے تیزی سے گھڑا بھر کر کندھے پر رکھا اور گھر کی طرف چل دیا۔ ابھی تھوڑا ہی دور گیا تھا کہ محسوس ہوا کہ کسی نے آواز دی ہے، میں ٹھٹک گیا۔ پیچھے دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ خوف میری ریڑھ کی ہڈی تک سرایت کرگیا۔ "کیا کسی بھوت نے مجھے آواز دی ہے؟" میں نے سوچا۔ اور پھر ایک قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ دوبارہ آواز سنائی دی۔ "احسان! احسان! رکو میری بات سنو!" اب آواز واضح آئی تھی۔

میرا جسم پتے کی مانند لرزنے لگا۔ بڑی مشکل سے میں نے گھڑا اتارا اور آواز کی سمت نظر دوڑائی۔ سورج کی تپتی شعاعوں میں مجھے ایک ہیولہ سا نظر آیا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس۔ میں نے غور سے دیکھا۔ تو وہ ایک بھیانک چہرہ تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "احسان! آنکھیں کھولو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اس کے بھیانک چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی۔

"کک......ک......کون......ہو......تت......تم؟" میرے منہ سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز نکلی......

وہ بولا۔ "ڈرو نہیں۔ بتادوں گا۔ سب بتادوں گا۔ کیونکہ اب وقت آگیا ہے بتانے کا۔"

"کیا بتانے کا وقت آگیا ہے؟"

اب میرا خوف تھوڑا تھوڑا کم ہورہا تھا۔

وہ کہنے لگا۔ "تم ایسا کرو کہ اٹھاؤ یہ گھڑا اور گھر چھوڑو اور شام کو یہاں آجانا۔ میں سب کچھ بتادوں گا اور ہاں مجھے تمہاری مدد کی بھی ضرورت ہے۔"

میرا خوف اب زائل ہوگیا تھا اور خود اعتمادی لوٹ آئی تھی۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر تم نیک ہوئے تو میں تمہاری مدد کروں گا۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں......نہیں......میں کوئی برا نہیں ہوں، بے شک ہندو ہوں مگر برا نہیں میں ایک آتما ہوں۔"

مجھے جھٹکا لگا، پہلے تو میں نے اس پر اتنا غور ہی نہیں کیا تھا۔ بس اس کا خوفناک چہرہ دیکھا تھا اور پھر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا تھا۔ مجھے سوچتا دیکھ کر وہ بولا۔ "زیادہ سوچو، نہ گھبراؤ۔ میں آتما ہوں۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ اب چلو گھر۔ تمہارے گھر والے ادھر آرہے ہیں۔" میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیوں؟ کیوں آرہے ہیں۔ میرے ابو ادھر؟"

وہ کہنے لگا۔ "تم لڑ کر آئے تھے نا گھر سے۔ اب تمہیں کافی دیر ہوگئی ہے۔ اس لئے وہ آرہے ہیں۔"

میں حیران رہ گیا۔ "مگر تمہیں کیسے پتا؟" میں نے پوچھا تو وہ بولا۔ "میں آتما ہوں۔ مجھے سب پتا چل جاتا ہے۔" تب میری سمجھ میں آیا کہ آخر اسے میرا نام کیسے پتہ چلا؟

"ٹھیک ہے شام کو ملاقات ہوگی۔" میں نے کہا۔

"کسی کو بتانا مت" اس نے کہا اس کے ساتھ ہی وہ غائب ہوگیا۔ چند لمحے میں حیران و پریشان کھڑا رہا۔ "روح وہ بھی ہندو کی اور میری مدد؟"

بہرحال میں نے یہ سوچ کر کہ شام کو سب پتا چل جائے گا، سر جھٹکا اور گھڑا اٹھا کر چل پڑا۔ آدھے سے زیادہ راستہ طے کیا تھا کہ اس روح کی بات سچی ثابت ہوئی یعنی میرے ابو آرہے تھے ان کے ساتھ چند آدمی اور بھی تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ سب حیران رہ گئے۔ اور پوچھنے لگے۔ "کیا تم نے کسی کو روتے دیکھا یا کوئی اور مافوق الفطرت واقعہ پیش آیا۔" میں نے ہنس کر انہیں ٹالا کہ "میں نے آرام سے گھڑا بھرا اور پھر تھوڑی دیر ادھر ادھر گشت کرتا رہا کہ دیکھوں جو کچھ ہمارے بزرگ کہتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ نہیں مگر مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آیا اور اب واپس آرہا ہوں۔" وہ سب بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگے۔

خیر ہم گھر پہنچ گئے۔

شام کے وقت میں کنوئیں کے پاس پہنچ گیا۔ گھر والوں سے میں نے کسی دوست سے ملنے کا بہانہ بنایا تھا۔ ابھی میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ مجھے وہی ہیولہ نظر آیا۔ سفید کپڑے، بھیانک چہرہ اور خوفناک ہنسی۔ وہ میرے قریب

آ گیا۔ میں قریب پڑے ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”پہلے تو تم مجھے اپنا نام اور پھر اس دنیا میں بھٹکنے کا سبب بتاؤ۔“

وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ گویا ہوا۔ ”احسان! اس دنیا کے زیادہ تر لوگ بہت بے وفا ہیں۔ یہاں رشتوں میں مضبوطی نہیں ہے۔ سب ہوس کے پجاری ہیں۔ میرا نام موہن ہے۔ یہ تقسیم ہند سے بہت پہلے کی بات ہے۔ میں سونا چاندی کا کاروبار کرتا تھا۔ یہاں اس گاؤں میں کنوئیں کے پاس ہی میرا گھر تھا۔ میں اکثر تجارت کی غرض سے ہندوستان کے کئی شہروں میں جایا کرتا تھا۔ میری کوئی اولاد نہیں تھی۔ بیوی بھی فوت ہوچکی تھی۔ میں نے دوسری شادی نہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

انہی دنوں میری طبیعت خراب رہنے لگی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی منوہر کو جو دہلی میں رہتا تھا۔ اپنے پاس بلالیا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ وہ انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر آ گیا۔ میرے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ ”تم سب میرے کاروبار کی دیکھ بھال کرو اور میرے ساتھ ہی رہو۔“

منوہر کی بیوی بھی مرچکی تھی۔ وہ میرے ساتھ رہنے پر راضی ہوگیا۔

میں نے اپنا تمام کاروبار ان کے حوالے کردیا مگر مالک میں ہی تھا۔ اسی دوران میں نے سوچا کہ میرے آخری دن ہیں کیا پتہ کب آتما مسافر ہوجائے کوئی نیک کام کرلینا چاہیے۔

گاؤں میں پانی کا انتظام اچھا نہ تھا۔ میں نے اس طرف توجہ دی۔ یہ کنواں کھدوانے لگا۔ اور چھ ماہ کے لگ بھگ کنواں تیار ہوگیا۔ پانی بہت زیادہ تھا اس میں۔ گاؤں کے سارے لوگ پانی بھرتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔

انہی دنوں میرے بھائی منوہر اور اس کے بیٹوں کی نیت خراب ہونے لگی۔ وہ میرے دولت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر چونکہ میں ابھی زندہ تھا۔ اور سارے کاروبار کا مالک میں ہی تھا۔ میری موت کی صورت میں ساری دولت نہیں ملتی۔ مگر دولت کی چکاچوند نے انہیں اندھا کردیا تھا۔ وہ جلد از جلد مجھے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے میرے قتل کا منصوبہ بنادیا۔ اور ایک رات میرا گلا دبا کر مجھے ماردیا گیا میرے جسم کے ساتھ ایک بہت وزنی پتھر باندھ کر میرے جسم کو اس کنوئیں میں پھینک دیا۔“

موہن بول رہا تھا۔ اور مجھے وہ باتیں یاد آرہی تھیں جو ہمارے بزرگ سناتے تھے کہ کنواں بنانے والا ہندو کنوئیں میں گر گیا اور کنواں آسیب زدہ ہوگیا۔ لیکن یہ بات ہضم نہیں ہوتی تھی کہ کنواں بنانے والا جو کہ یقینی طور پر موہن ہی تھا کنوئیں میں گر کر مرا تو ٹھیک ہے مگر کنوئیں کے آسیب زدہ ہونے کی کیا تک بنتی تھی۔ اب یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ یہ موہن کی ہی روح تھی۔

جس کو لوگ جن یا بھوت سمجھ رہے تھے۔ موہن کہہ رہا تھا کہ ”وہ مجھے یہاں پھینک کر تو چلے گئے مگر جونہی میری آتما نے میرے جسم کو چھوڑا۔ وہ ایک مضبوط شکنجے میں جکڑ گئی۔

دراصل وہ شکنجہ ایک جادوگر کا تھا۔ جسے ایک آتما چاہیے تھی۔ اسے اس کے علم کے ذریعے میری موت یعنی قتل کا پتا چل گیا تھا۔ سو اس نے یہ جادوئی شکنجہ بھیج دیا اور پھر میری آتما اس کی گرفت میں جکڑ گئی۔ میں اس کے قبضہ میں چلا گیا اس جادوگر نے ایسا کیا کہ اس کنوئیں کے تہہ میں اپنے جادو سے ایک سرنگ بنائی اور یہاں رہنے لگا۔ میرے ذمہ اس نے یہ ڈیوٹی لگائی کہ میں اس کی حفاظت کروں۔ لہٰذا میں آتما کی صورت میں اس کنوئیں کے اردگرد گھومتا رہتا۔

وہ بہت بڑا جادوگر تھا۔ لیکن سیر پر سوا سیر بھی ہوتا ہے۔ بنگال کے ایک جادوگر کے ساتھ اس کی ٹھن گئی۔ وہ اسے مارنا چاہتا تھا۔ اور اس کے پاس اتنی شکتی نہیں تھی کہ اس کا مقابلہ کرے۔ لہٰذا یہاں کنوئیں کے اندر آ گیا۔ اور کنوئیں کے باہر حصار بنادیا۔ وہ کنوئیں کے اندر سرنگ میں جاپ کرتا تھا اور میں یہاں اس کی حفاظت کرتا تھا۔“

موہن بولتے بولتے چپ ہوگیا۔ میں حیرت سے اس کی انوکھی کہانی سن رہا تھا۔ جب چپ ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”اور رات کو یا دن کے بارہ بجے کنوئیں سے رونے کی آوازیں کیوں آتی تھیں۔ یہ کہاں تک سچ ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”دراصل یہ بھی میری ڈیوٹی کا حصہ تھا۔ کہ رات کو اور دن کو اس جگہ چیخ و پکار کروں، کیونکہ اس طرح گاؤں کے لوگ ڈرتے اور یہاں نہ آتے۔ اور مجھے بڑا دکھ تھا کہ میں نے جو کنواں لوگوں کی آسانی کے لئے تیار کیا تھا۔ اب وہ کنواں لوگوں کے لئے بے کار ہوگیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”تو پھر وہ جادوگر کہاں ہے؟ تم کیسے اس کے شکنجے سے نکلے؟“

موہن بولا۔ ”عرصہ دراز تک میں اس کی قید میں رہا۔ آخر ایک دن بنگالی جادوگر مر گیا۔ اس جادوگر کو پتا چلا تو اس پر یہ دھن سوار ہوگئی کہ اس کی شکتیوں کو اپنے قبضہ میں کرے، میری آتما اس کے قبضے میں بیزار تھی۔ میرے جسم کی ساری ہڈیاں اس نے سرنگ میں اپنے پاس رکھ لیتھیں۔ بنگالی جادوگر کی شکتیوں پر قبضہ کرنے کے لئے اسے ایک طویل جاپ کرنا تھا۔ وہ بڑا خطرناک جاپ تھا۔ اگر اس جاپ میں ذرا سی بھی غلطی ہوتی تو اس جاپ کے بیر اسے مار دیتے۔ اس جاپ کے ایک نہیں بلکہ کئی بیر حفاظت کرتے ہیں۔

مگر اس نے جاپ شروع کردیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اب یہ رونا بند کروں اور صرف اس کی حفاظت کروں کیونکہ تقسیم ہند ہوچکی تھی۔

ہندوستان سے ہجرت کرکے یہاں آنے والے مسلمانوں کو بھی یہاں رہنے والوں نے کنوئیں کے آسیب کے بارے میں بتادیا تھا۔“

سورج مغرب میں غروب ہوچکا تھا۔ میں موہن کی پراسرار باتوں کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اب کوئی بھی اس کنوئیں کے پاس نہیں آتا۔ جادوگر کو جاپ کرتے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ اب تھوڑا عرصہ ہی رہتا تھا کہ اس کی بنگالی جادوگر کی شکتیاں مل جاتیں مگر اس سے غلطی ہوگئی۔ وہ ایسی غلطی تھی کہ برسوں کی تپسیا ضائع ہوگئی اور جاپ کے بیروں نے جادوگر کو دردناک موت سے دوچار کردیا۔ اب کچھ ہفتے ہوئے ہیں کہ میں آزاد ہوگیا۔ کیونکہ جادوگر تو مر گیا اور کنوئیں پر کیا ہوا اس کا جادو بھی ختم ہوگیا اور میری آزادی ہوگئی۔“

میں نے پوچھا۔ ”اور آپ کے بھائی اور بھتیجے؟“

وہ مسکرایا۔ ”احسان! بھگوان نے ان لالچ کے اندھوں کو ایک برس بعد ہی سزا دے دی تھی، چونکہ ان کے پاس دولت آ گئی تھی اس لئے وہ عیش و آرام میں مصروف ہوگئے۔ زیادہ تر الٹے کاموں میں انہوں نے دولت اڑا دی اور کنگال ہوکر مرے۔“

اب ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ موہن غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے پوچھا۔ ”جادوگر بھی مر گیا اور جادو بھی ٹوٹ گیا مگر تم کیوں یہاں ہو؟ تم کیوں نہیں دوسرے عالم میں گئے؟“

وہ کہنے لگا۔ ”اس لئے تو میں نے تمہیں مدد کے لئے کہا ہے۔ کیونکہ تم مجھے نڈر اور بہادر لگتے ہو، کیا میری مدد کروگے؟“ اس نے پوچھا۔

”کیسی مدد؟ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟“ میں نے دریافت کیا۔

وہ کہنے لگا۔ ”میری ہڈیاں کنوئیں کے سرنگ میں اس جادوگر کے پاس تھیں۔ اور جب وہ مرا تو وہ سرنگ بھی ختم ہوگئی اور میری ہڈیاں اس میں ہیں اب تم یہ کروگے کہ وہ ہڈیاں نکال کر انہیں آگ لگاؤ گے تب جاکر مجھے آرام ملے گا اور میری آتما اوپر چلی جائے گی۔“

”میں، میں کیسے نکالوں گا؟ اتنا گہرا یہ کنواں؟“ میں نے چونک کر کہا۔

وہ بولا۔ ”میں تمہاری مدد کروں گا، چونکہ میرے پاس جسم نہیں ہے۔ اس لئے میں تمہارے جسم میں سما جاؤں گا، تم محسوس تو کروگے۔ لیکن تمہیں اپنے اوپر اختیار نہیں ہوگا۔ اور میں ہڈیاں باہر نکال لوں گا، تم انہیں آگ لگادینا، بولو کیا تم مجھے جسم دوگے؟ کہ میں یہ کام کرکے آرام سے اوپر روانہ ہوسکوں۔“

میں حیران رہ گیا۔ ساتھ ہی ڈرنے لگا، اچانک میں نے سوچا۔ ”اگر اسے جسم کی ضرورت تھی تو وہ کسی مردے کا حاصل کرسکتا تھا، کسی اور آدمی کا جسم بھی حاصل کرسکتا تھا مگر اس نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے ہنسنے کی آواز آئی میں نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ ”احسان! میں ایک آتما ہوں۔ اور مجھے سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔ اس وقت بھی میں تمہارا ذہن

پڑھ رہا ہوں۔ تمہارے سوالوں کا جواب یہ ہے کہ مجھے ابھی چار ہفتے ہوئے ہیں آزاد ہوئے۔ اور میں ایک رحمدل آدمی ہوں کسی مردے کو متاثر نہیں کرسکتا اور آخری جواب یہ ہے کہ مجھے ایسا آدمی چاہیے تھا جو اپنی مرضی سے مجھے اپنا جسم دے۔ میں کسی پر زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔"

اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا۔ میرے دل میں موہن کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ بالآخر میں رضا مند ہوگیا۔ اور موہن میرا مشکور ہوگیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں کل رات کے وقت ضرور تمہاری مدد کے لئے آؤں گا۔

رات کے دس بجے تھے جب میں گھر سے نکلا۔ ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ موہن آگیا۔ اور پھر وہ میرے جسم میں سما گیا۔ اب میں، "میں" تھا اور میں، "میں" نہیں بھی تھا۔ کیونکہ میرے احساسات تو تھے مگر اختیارات موہن کے تھے۔ بہرحال ہم کنوئیں پر جا پہنچے۔ موہن نے طے شدہ منصوبہ کے تحت کنوئیں میں چھلانگ لگادی۔ میری آنکھیں بند تھیں اور کنوئیں کی گہرائی میں اترتا چلا جارہا تھا۔ آخر میرے پاؤں کنوئیں کی تہہ سے ٹکرائے۔ نجانے اس اندھیری رات، عمیق گہرے کنوئیں کے پانی کی تہہ میں کہاں سے روشنی آرہی تھی۔ خیر موہن نے ساری ہڈیاں سمیٹ لیں اور اپنی شکتی کے ذریعہ کنوئیں سے وہ باہر آگیا۔ کنوئیں سے تھوڑے فاصلے پر موہن نے وہ ہڈیاں رکھ دیں اور میرا جسم چھوڑ دیا۔ مجھے لگا۔ جیسے میں ہلکا ہوگیا ہوں۔ اس کے بعد موہن نے کہا۔ "اب تم ان تمام ہڈیوں کو آگ لگادو۔"

میں نے برسوں کی بوسیدہ ہڈیاں اٹھائیں اور حیرت انگیز طور پر وہ گیلی نہیں تھیں۔ ایک جگہ رکھ کر میں آگ لگانے لگا۔ آگ لگ گئی۔ ادھر ہڈیوں کو آگ لگی ادھر موہن کی آواز آئی۔ "میرے محسن! میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔ مگر میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ اس کنوئیں سے تھوڑا سا آگے شمال کی جانب میرا مکان تھا۔ جس کی اب بنیادوں کا نام ونشان مٹ چکا ہے۔ تم وہاں جاؤ گے تو تمہیں ایک بہت بڑا درخت نظر آئے گا۔ اس درخت کے کھوکھلے تنے میں جو کچھ بھی ملے گا وہ تمہارا ہے۔ اب میرا وقت ختم ہوگیا۔ میرے محسن! بھگوان تمہیں خوش رکھے۔ بھگوان تمہیں پھل کرے۔" اس کے ساتھ ہی وہ ہیولہ آسمان کی وسعتوں کی سمت پرواز کرگیا۔

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے اور سخت گرمی میں جانے کہاں سے ہوا چلی کہ موہن کی ہڈیوں کی راکھ کو اڑا کر لے گئی۔ ایک پراسرار کہانی ختم ہوگئی لیکن ابھی اس میں کچھ باقی تھا۔ میں کنوئیں سے شمال کی طرف جانے لگا۔ جس کی نشاندہی موہن نے کی تھی۔ تھوری دور چلنے کے بعد مجھے وہ بڑا درخت نظر آگیا۔ میں نے پہلے اس درخت کو نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس طرف کوئی آتا ہی نہیں تھا، اتنا گھنا جنگل تھا اور لوگ اسے جنات کی جاگیر تصور کرتے تھے۔

بہرحال میں اس درخت کے کھوکھلے تنے تک پہنچا۔ اور اس میں جھانکنے لگا۔ میرے پاس ماچس تھی۔ میں نے ایک تیلی جلائی، ذرا سی روشنی ہوئی اور مجھے تنے میں ایک تھیلی نظر آئی۔ تیلی بجھ گئی۔ میں نے تھیلی کو ٹٹولا اور پھر تھیلی کو کھول کر تیلی جلائی تو حیران رہ گیا کیونکہ اس تھیلی میں 10 سونے کی اینٹیں تھیں۔ میں اسے لے کر گھر آگیا۔ رات کا 1 بج رہا تھا۔ گویا اس کام میں دو گھنٹے لگے تھے۔ میں نے ان اینٹوں کو اپنے کمرے کی ایک خفیہ جگہ دبایا۔ غسل خانے میں جاکر غسل کیا اور یہ سوچتا ہوا چارپائی پر لیٹ گیا کہ ان سونے کی اینٹوں کا صحیح مصرف مل گیا۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ کہ چونکہ کنواں کافی دور ہے لہٰذا اس گاؤں میں ایک بہت بڑا کنواں تیار کرایا جائے تاکہ گاؤں کے سارے لوگ اپنی ضروریات کے مطابق پانی حاصل کریں، اور ساتھ ہی ایک اسکول کا انتظام بھی کیا جائے تاکہ گاؤں کے بچے پڑھ سکیں، سارے حالات اور سونے کی اینٹوں کے متعلق میں نے اپنے ابو کو بتادیا تھا، انہی کی راہنمائی میں کنوئیں اور اسکول کا کام مکمل ہوا۔

☠